جنوری سنہ ۱۹۴۹ء

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس، ہسپتال روڈ، لاہور میں چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

مدیر

محمد ناظر

ناشر
کتاب منزل
لاہور

جنوری ۱۹۴۹ء
جلد:- ۱
شمارہ:- ۸-۹

قیمت فی پرچہ - دس آنے

سالانہ چندہ
پاکستان کیلئے:- ۶ روپے
غیر ممالک کیلئے:- ۸ روپے

رموز

قوم اسوقت پریشانیوں اور دشواریوں کی کٹھن منزلیں عبور کر رہی ہے اور اسکی موجودہ حالت اس بات کی
متقاضی ہے کہ اس کے مستقبل کو خوشگوار بنانے کی خاطر ابھی سے مناسب اہتمامات کئے جائیں۔ یہ کام ایسا نہیں
کہ صرف لفاظی سے کوئی اس سے عہدہ برآ ہو سکے اسکے لئے عمل کی ضرورت ہے اور انتہائی محنت و سعی کی مسلسل
جدوجہد اور پیہم مصروفیت کی۔

قوم کے مستقبل کی بہبودی کی تمام تر ذمہ داری مدرس پر عائد ہوتی ہے۔ مدرس قوم کا معمار ہے۔ یہی قوم کو بگاڑتا
اور یہی اسے سنوارتا ہے۔ اسکی لغزشیں قومی عمارت کی بنیادیں ہلا دیتی ہیں اسکی ہمتیں متزلزل قومی تعمیر کو استوار
کر دیتی ہیں۔ مدرس قوم کا محور ہے۔ قوم کی قسمت اسی کے گرد گھومتی ہے۔ ہمارا مدرس وقت کی ضرورتوں کے مطابق
اپنے صحیح فرائض خوش اسلوبی سے سرانجام دے، تو قوم اپنے مستقبل سے بھی بہت حد تک مطمئن ہو جائے اور اس کے
حال کو بھی چار چاند لگ جائیں۔

وقت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی زندگی کی خاطر اسلامی شعار کے پابند ہوں اپنی سنہری روایات کو سمجھیں اور قائم رکھیں۔
ہمارے بچے جو ہمارے قومی مستقبل کی بنیادیں ہیں، اسلامی سانچے میں ڈھل جائیں۔ انمیں اسلامی اخوت، اسلامی اخلاق
اور اسلامی حمیت کے جذبات پیدا ہوں اور وہ ان جذبات کی بنا پر قوم کے بہترین ستون بنیں۔ ہمارا یہ اسلامی تقاضا مدارس میں صرف
اسلامیات رائج کرنے سے پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ بچوں کو تعلیم دینے والا ہر مدرس صحیح معنوں میں مسلمان ہو۔ مدرس
کے اقوال و اعمال بچے کی طبیعت پر گہرا اثر کرتے ہیں۔ مدرس اپنے اقوال و اعمال میں اسلامی لحاظ سے بہترین
نمونہ ہو، تو کوئی وجہ نہیں کہ بچہ صحیح طور پر اسلامی صورت اور نشو و نما حاصل نہ کرے۔

اس ضمن میں اس درسگاہ پر اہم فرائض عائد ہوتے ہیں جہاں اساتذہ تربیت حاصل کرتے ہیں۔ ٹریننگ کالج
کا فرض ہے کہ اس قسم کے اساتذہ پیدا کرے جو "نگہ بلند سخن دلنواز جاں پُرسوز" کے آئینہ دار ہوں، جو زمانے کے
پیرو نہ ہوں بلکہ زمانے کی امامت کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ جن کے دلوں میں ملت کا درد اور کام کے لئے خلوص ہو۔
جو اسلام کے شیدائی ہوں اور فکر و عمل سے اپنے آپ کو اسلام کے مخلص فرزند ثابت کریں، تاکہ بچوں میں
ان کی وساطت سے مفید اسلامی جذبات کی تخلیق ہو اور قوم کی صحیح تعمیر ہو۔

ایسے اساتذہ کی ملت کو بہت ضرورت ہے اور ٹریننگ کالج کو یہ ضرورت پوری کرنا ہے سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور کی طرف جو اپنی قسم کا مغربی پاکستان میں واحد ادارہ ہے ملت کی نگاہیں اُمید سے اُٹھیں تو کوئی تعجب نہیں کیونکہ یہی وہ ادارہ ہے جہاں قوم کے مستقبل کے سانچے بنیں گے۔ اس ادارہ کو وقت کی یہ اہم ضرورت پوری کرنا ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ اس کالج میں تربیت حاصل کرنے کی غرض سے طلبہ جس تعداد میں آتے ہیں وہ قومی ضرورتوں کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے توقع ہے کہ قومی نقطۂ خیال سے آئندہ انکی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہو جائے گا۔

ٹریننگ کالج پر صرف مناسب مدرس پیدا کرنیکا ہی فرض عائد نہیں ہوتا بلکہ اسے توسیع تعلیم تنظیم تعلیم اور وقارِ تعلیم کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔ مدرس کو تربیت دیکر قوم کے پیش کر دینے کے بعد اس مدرس کے عمل اور دائرہ عمل سے اور تعلیم عامہ کے حالات سے بے نیاز ہو بیٹھنے سے ٹریننگ کالج کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اصل مقصد قوم کی صحیح تعمیر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مدرس اپنی تربیت کے مطابق صحیح فرائض انجام دینے میں کوئی رکاوٹ تو محسوس نہیں کر رہے۔ بچے مناسب دلچسپی لے رہے ہیں یا نہیں تعلیم کی توسیع کہاں تک ہو رہی ہے اور اس کا وقار کہاں تک قائم ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن سے ٹریننگ کالج بے نیاز ہو کر نہیں بیٹھ سکتا۔ اسے اساتذہ سے ربط قائم رکھنا ہوگا۔ ان مدارس سے جہاں اس کے تربیت یافتہ اساتذہ کام کر رہے ہیں اپنے مراسم پیدا کرنے ہونگے۔ بچوں میں تعلیمی دلچسپی پیدا کرنے کیلئے مناسب اہتمامات کرنے ہونگے۔ اور تعلیمی وقار و توسیع کی خاطر تعلیمی تجربات اور تعلیمی مساعی کو نوازنا ہوگا۔ اور اساتذہ میں اجتماعی زندگی اور معاشرہ کی بہبودی میں دلچسپی لینے کے سامان پیدا کرنے ہوں گے۔

ہمیں یہ سُنکر از حد مسرت ہوئی ہے کہ سنٹرل ٹریننگ کالج نے اس سلسلے میں اپنے فرائض کا صحیح احساس کرتے ہوئے مناسب لائحہ عمل تیار کر لیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے کیلئے مناسب اقدامات شروع کر دئے ہیں چنانچہ اس نے چند اہم فیصلے کئے ہیں :-

(۱) تعلیم میں نئے نئے تجربات کیلئے مواقع مہیا کئے جائیں تاکہ معلموں میں تعلیمی تحقیق و تدقیق کا شوق پیدا ہو اس چیز کی ابتدا نارمل سکولوں سے ہو۔ نارمل سکولوں کو تجربہ گاہ بنایا جائے اور بہترین تجربے کیلئے ٹریننگ کالج ٹرافی اور انعام

(۲) مختلف مدارس سے روابط قائم رکھنے کی خاطر دو قسم کے طریق اختیار کئے جائیں :-
(۱) مجلس طلبائے قدیم کی تشکیل۔
(ب) سکاؤٹنگ اور کھیلوں کا سالانہ مقابلہ جسکے لئے سنٹرل ٹریننگ کالج کی طرف سے ٹرافیاں اور انعام مقرر ہوں۔
(۳) صوبہ کے تمام مدارس کے آٹھویں، نویں اور دسویں جماعتوں کے طلبہ کیلئے ایک سالانہ انعامی مناظرہ یا مذاکرہ یا مضامین کا انعامی مقابلہ ہو جس کے لئے انعامات اور ٹرافی ٹریننگ کالج دے۔

اس قسم کا لائحۂ عمل قابل تعریف ہے یہ صوبے کے تعلیمی اداروں کو مرکزی درسگاہ کے ساتھ منظم کر دے گا۔

سنٹرل ٹریننگ کالج نے فقط یہی اہم فیصلے نہیں کئے بلکہ ان کے علاوہ اس درسگاہ میں تربیّت لینے والے اساتذہ کے معلومات و خیالات کو وسعت دینے کی خاطر، توسیعی تقاریر کا ایک نہایت مفید کام شروع کر رکھا ہے۔ گذشتہ ماہ سے اس سلسلے میں گہما گہمی نظر آرہی ہے۔ تقریباً ہر ہفتے ایک دو توسیعی لیکچر ہو جاتے ہیں۔ اور زیر تربیت اساتذہ کو بہترین مفکر و صاحب علم حضرات کے خیالات و مشاہدات سے مستفید ہونے کے زرّیں مواقع میسّر آرہے ہیں۔

ان لیکچروں سے اس ادارہ میں کچھ نئی زندگی کی چہل پہل نظر آرہی ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارہ میں نئی روح پھونکدی گئی ہے جناب سلطان محمود صاحب غزنوی صدر معلم اسلامیہ ہائی سکول کٹرہ خزانہ نے "ضبط" پر ایک نہایت مفید مقالہ پڑھا جناب بی ایل رلیا رام صاحب جنرل سیکرٹری وائی۔ ایم۔ سی۔ اے نے "تعلیم بالغاں" پر پُر از معلومات تقریر فرمائی۔ جناب اے ڈی اظہر صاحب ایم اے۔ آئی اے اے ایس معتمد مالیات حکومت مغربی پنجاب نے سر عبدالقادر صاحب مدظلہٗ کی زیر صدارت آسٹریلیا کے تعلیمی اداروں کے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات دلچسپ اور فاضلانہ انداز میں بیان فرمائے ڈاکٹر محمد موسےٰ خانصاحب ڈی۔ پی۔ ایچ نائب ناظم محکمہ صحت عامہ مہتمم "تغذیہ" نے "تغذیہ" پر عالمانہ تقریر کرتے ہوئے نہایت مفید اور کار آمد باتیں بتائیں۔ جناب ڈاکٹر رائیس صاحب پرنسپل ایف سی کالج لاہور نے "یو۔ ایس۔ اے میں تعلیم کے مختلف پہلو" وضاحت سے بیان کئے۔ جناب ڈاکٹر غلام محی الدین صاحب ڈی لٹ نے ڈاکٹر تاثیر صاحب کی زیر صدارت "استاد بحیثیت معمار قوم" کے موضوع پر محققانہ خیالات کا اظہار فرمایا۔ ان تقریروں سے مستفید ہونے کیلئے سنٹرل ٹریننگ کالج کے طلبہ کے علاوہ دوسرے مدارس کے معلّمین و معلّمات اور

با وطالبات نے بھی اجلاسات میں شرکت کی۔
مجلس طلبائے قدیم سنٹرل ٹریننگ کالج بھی خوابِ غفلت سے بیدار ہوچکی ہے۔ اسے بدلے ہوئے حالات کے مطابق تشکیل
جارہی ہے اور اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ اسکا لائحۂ عمل ایسا تیار کیا جائے جس سے یہ کوئی مفید تعلیمی خدمات
انجام دے سکے۔ اسکا ایک شاندار اجلاس ہوچکا ہے۔ اور اب اسکی آئینی مجلس قواعد و ضوابط اور لائحۂ عمل مرتب کرنے میں
مصروف ہے۔ انشاءاللہ العزیز یہ مجلس سنٹرل ٹریننگ کالج اور صوبے کے سکولوں کے باہمی روابط کی بہترین کڑی ثابت ہوگی۔
نیو ایجوکیشن فیلوشپ بھی جنوری کے اواخر میں تعلیمی کانفرنس اور نمائش منعقد کرنیکی تیاریوں میں مصروف ہے۔ تعلیم
میں دلچسپی لینے والے صاحبِ علم حضرات سے اور نارمل سکولوں کے اساتذہ سے معاونت کی استدعا کی جارہی ہے۔
تجاویز، مقالات اور نمائشی اشیاء کے حاصل کرنے کے لئے طلبی رُقعے بھیجے جاچکے ہیں۔ تعلیمی ناشروں اور
فرموں سے بھی نمائشی چیزوں اور کتابوں کی فہرستیں طلب کی گئی ہیں۔
دارالاقامہ (ہوسٹل) سنٹرل ٹریننگ کالج بھی جامد و ساکت نہیں۔ بلکہ زندگی و بیداری کے سمے پیش کررہا ہے۔
اسمیں بھی علمی و تعلیمی مذاکرے، مناظرے اور مشاعرے منعقد ہورہے ہیں۔ جمعیت دارالاقامہ کی بنیاد بھی ڈالی جا
چکی ہے۔ اور اس کا ایک باقاعدہ پروگرام مرتب کیا جاچکا ہے۔ دارالاقامہ کی زندگی اب فقط تعلیمی قید و بند
میں جکڑی ہوئی نہیں۔ بلکہ اب اس میں سوشل دلچسپیاں بھی نظر آتی ہیں۔
سنٹرل موڈل سکول میں بچوں کے لئے بوساطت سنٹرل ٹریننگ کالج دوپہر کے کھانے کا انتظام بھی
کیا گیا ہے۔ یہ تجربہ بھی بہت کامیاب نظر آرہا ہے۔ طلبہ اپنے اپنے گھروں سے کھانا لاتے ہیں اور دوپہر کو
اکٹھے بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ تمیز اور اشتراکِ عمل کے جذبات کی تخلیق کے لئے یہ ایک مفید طریق ہے۔
صوبے کے درونی تعلیمی مشاغل اور اداروں کے باہمی ربط و تنظیم کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی اشد ضرورت
ہے۔ کہ سارے پاکستان میں ایک مرکزی ربط گاہ ہو۔ جہاں سارے پاکستان کے اربابِ تعلیم مل سکیں۔ اور باہمی مشاورت
سے تعلیم کے ان اہم مسائل کو سلجھا سکیں۔ جن پر قوم کا بحیثیت مجموعی انحصار ہے۔ اس سلسلے میں ایک آل
پاکستان تعلیمی کانفرنس کا انعقاد ہو، تو یہ وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے علاوہ قومی تعمیر کی
غرض سے ایک احسن اقدام ہوگا۔ ہمیں مرکز سے توقع ہے۔ کہ وہ اسکے متعلق ضرور کوئی مناسب فیصلہ کریگا۔ اس سے
سارے پاکستان کی تعلیم بھی منظم ہوگی۔ اور اربابِ تعلیم میں ہم آہنگی بھی پیدا ہوگی۔ اور اشتراکِ عمل بھی۔

سکول اور شہریّت ــ ۲

ایم ۔ اے ۔ باری

پہلے یہ ذکر آچکا ہے کہ ایک طالب علم کی زندگی اُسی وقت کامیاب قرار دی جا سکتی ہے جبکہ وہ سکول کے دوران قیام میں وقت کا پابند ہو چکا ہو۔ اپنا کام وقت پر پورا کرنے کا عادی بن چکا ہو۔ صفائی کا اتنا دلدادہ ہو گیا ہو کہ کاغذ کے ٹکڑے اِدھر اُدھر پھینکنے کے بجائے اس کو اگر سکول کے احاطے میں پھلوں کے چھلکے یا کاغذ کے ٹکڑے اِدھر اُدھر پڑے ملیں تو وہ ان کو اٹھا کر کوڑے کی ٹوکری میں ڈال دیتا ہو۔ سچ بولنے کا اتنا عادی ہو گیا ہو کہ اگر اس سے کوئی قصور سرزد ہو جائے تو اُس کو وہ جھٹ مان لے اور اِدھر اُدھر کے بہانے نہ بنائے۔ خود غرضی ۔ جھگڑے فساد کو بُرا جانتا ہو۔ یک جہتی کا قائل ہو۔ کھیل کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ بزرگوں کا ادب کرنا اپنا فرض اوّلین جانتا ہو۔ غرضکہ اس کو اُس کام کے کرنے میں خوشی ہو جس میں کسی کا نقصان مضمر نہ ہو۔ اور اس کے پورا کرنے میں اس کے کسی فرض کی ادائیگی بھی ہو۔

متذکرہ بالا صفتیں بچوّں میں اسی وقت پیدا ہو سکتی ہیں جبکہ سکول کا ماحول اچھا ہو۔ اور اساتذہ اپنے فرائض کو کما حقہٗ ادا کرتے ہوں اور ان میں وہ تمام اوصاف پائے جاتے ہوں جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے دلوں میں یہ احساس بھی ہو کہ بچے ملک کی سب سے بڑی دولت ہیں۔ اور ان کی صحیح تربیّت پر ملک کے

مستقبل کا انحصار ہے۔

بچّہ مشاہدے سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ وہ اعلے درجے کا نقال ہے۔ جس کام کو وہ کسی کو بار بار کرتے دیکھتا ہے اسے خود بھی کرنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے یہ امر اساتذہ کی خاص توجہ کا محتاج ہے کہ وہ کبھی کوئی بے جا حرکت لڑکوں کے سامنے نہ کریں۔ ان کی زبان سے کبھی ناشائستہ الفاظ نہیں نکلنے چاہئیں۔ کمزور بچّوں کو بار بار بُرا بھلا نہیں کہنا چاہیئے۔ اس سے ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی انہیں مستقل نقصان پہنچ جاتا ہے۔ بچّوں کو شاباش دینے کا جب کبھی موقع ملے اس سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔ اس سے نہ صرف بچّوں کا حوصلہ بلند ہوتا ہے بلکہ انہیں ایک اعلےٰ درجے کی مسرّت حاصل ہوتی ہے اور کام سے محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے جو ان کے زندگی بھر کام آنے والی چیز ہے۔

اساتذہ کا سلوک بچّوں کے ساتھ مشفقانہ ہونا چاہیئے۔ استاد کا رعب بچّوں پر ہرگز اتنا نہیں ہونا چاہیئے جس کی وجہ سے وہ اپنے دل کی بات اس سے کہتے ہوئے ڈریں۔ اس کے برعکس استاد کے حسنِ سلوک سے ان کے دلوں میں اس بات کا یقین ہونا چاہیئے کہ استاد ان کی ہر مشکل کا رفع کرنے والا ہے۔ لہٰذا اس کے سامنے اپنی تمام مشکلات بے دھڑک پیش کر دینی چاہئیں۔

استاد کا فرض ہے کہ وہ ہر کام کو باقاعدگی سے کرے۔ اگر وہ جماعت میں فیس لے رہا ہو تو اس کو چاہیئے کہ وہ ایک طرف سے فیس لینا شروع کرے اور سلسلہ وار لڑکوں سے فیس جمع کرتا چلا جائے تاکہ بچّے کام میں بھی مصروف رہیں اور اپنی اپنی باری پر فیس بھی ادا کر دیں۔ اسی طرح اگر استاد جماعت میں کاپیوں کی درستی کر رہا ہو تو اس کو چاہیئے کہ یہ کام بھی باقاعدہ ایک کونے سے شروع کرے۔ اور ہر لڑکے کی کاپی اس کی باری پر درست کرے۔ یہی حال اس کی تدریس کا بھی

ہونا چاہیئے۔ باقاعدہ پروگرام بنا ہو اور اس پر باقاعدگی سے عمل ہو رہا ہو۔ غرض کہ اس کا ہر کام ایسا ہونا چاہیئے کہ اس میں تنظیم ہو۔ احتیاط ہو۔ اور باقاعدگی ہو۔ اس امر کا بچوں پر اچھا اثر پڑے گا اور وہ بھی ہر کام کو تنظیم و احتیاط سے کرنے کی کوشش کریں گے۔

استاد اگر وقت کا پابند نہیں تو وہ استاد کہلانے کا مستحق ہی نہیں۔ اگر کوئی استاد وقت کا پابند نہیں ہے تو اس کا اثر بچوں پر بُرا پڑتا ہے۔ ایسے استاد کے شاگردوں کے لئے وقت کا پابند ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ اور یہ عیب انہیں زندگی بھر تنگ کرتا رہتا ہے۔ استاد کی پابندئ وقت کا یہ عالم ہونا چاہیئے کہ آندھی آئے۔ مینہ برسے۔ مگر استاد کا وقت پر آنا نہ ٹلے۔ بچے ایسے ہی استاد کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں۔

اُستاد کا تیار ہو کر جماعت میں آنا بھی بچوں پر بہت اچھا اثر ڈالتا ہے۔ اس سے استاد کی عزت بڑھتی ہے۔ لڑکوں کو بھی بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ خود استاد کو پڑھانے میں مزا آتا ہے۔ ایسے اُستاد کا بچوں سے یہ کہنا کہ ہر کام کو احتیاط سے اور پوری تیاری کے ساتھ کرو بہت اثر رکھتا ہے۔

سکول میں لڑکوں کو ایک حد تک آزادی بھی ہونی چاہیئے۔ سکول کے بعض کاموں میں ان کا ہاتھ بھی ہونا چاہیئے۔ جمہوری اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اگر بچوں کو مختلف صورتوں میں ذمہ داریاں سپرد کر دی جائیں۔ تو اس کا ان کی زندگی پر اچھا اثر پڑیگا سکول میں چند ایک انجمنوں کا ہونا ضروری ہے۔ ان انجمنوں کے انتظام کا بیشتر حصّہ لڑکوں کے سپرد کر دینا چاہیئے تاکہ ان میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔ ان انجمنوں کے سیکرٹری اور وائس پریزیڈنٹ کا انتخاب بالکل اسی طرح ہونا چاہیئے جس طرح ملک میں عام انتخابات ہوتے ہیں۔ ووٹ بیلٹ پیپر (پرچیوں) کے ذریعہ لینا چاہئے

تاکہ لڑکے شروع ہی سے ووٹ کی اہمیّت کو سمجھ سکیں۔

بچّوں میں عام مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اساتذہ گاہے گاہے بچّوں کو یہ بتاتے رہیں کہ فلاں فلاں کتابوں میں فلاں فلاں اہم باتوں کے متعلق تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اِن کا پڑھنا اُن کے لئے ضروری ہے۔ یہ کتابیں سکول کے کتب خانے کے علاوہ فلاں فلاں دکان سے بھی مل سکتی ہیں۔ فلاں رسالے میں فلاں مضمون کے متعلق مفید معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ ان کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔

بچّوں میں مضمون نویسی کا مادہ پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سکول میں ہر جماعت کا ایک رسالہ ہو جس میں تمام مضامین اسی جماعت کے ہوں۔ اداریہ بھی اسی جماعت کے کسی لڑکے کا ہو۔ اس رسالے کی مکمل تیاری بچّوں کے سپرد ہونی چاہئے۔ تاکہ انہیں شروع ہی سے تمام مشکلات سے واقفیت ہو جائے۔

اُوپر جن آخری تین باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ بڑی اہم ہیں۔ اُور یہ تینوں چیزیں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک اساتذہ کی رہنمائی لڑکوں کے شاملِ حال نہ ہو۔ یہاں اساتذہ کو اپنی پوری پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ ان کی عدم توجہ سے کافی نقصان پہنچ جانے کا احتمال ہے۔

بچّوں کو اساتذہ کی رہنمائی کی ضرورت ہر جگہ پڑتی ہے۔ کھیل کا میدان ہو۔ یا جماعت کا کمرہ۔ استاد کے بغیر لڑکوں کا کام نہیں بنتا۔ اس لئے اساتذہ کو چاہیئے کہ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصّہ بچّوں کی بہبودی کے لئے وقف کردیں۔ وہ یہ سمجھیں کہ وہ لڑکوں کے لئے ہیں اُور لڑکے ان کے لئے۔ بچّے ملک کی ایک امانت ہیں جو استادوں کے سپرد اس غرض سے کئے جاتے ہیں کہ وہ صحیح تربیت پاکر ملک کی خدمت کر سکیں اس کے نام کو روشن کریں اور بین الاقوامی عزّت حاصل کریں۔ صحیح تربیّت یافتہ بچّے واقعی اعلےٰ شہری بنتے ہیں اُور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

معلّمِ حساب کی مشکلات — ۱

سیّد محمد صدیق ایم - اے -

اس مقالہ میں یہ بتایا جائے گا۔ کہ گنتی اور حساب کے چاروں ابتدائی قاعدے یعنی جمع - تفریق - ضرب اور تقسیم سکھانے میں مدرس کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حساب کی تعلیم قرأت و کتابت اعداد سے شروع ہوتی ہے؟ اس مرحلے پر مدرس کو جس مشکل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ بچّوں کو دہائی اور سینکڑہ وغیرہ کا تصوّر دلانا ہے۔ کیونکہ بچوں کے لئے یہ سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ ایک ہی ہندسہ مختلف جگہوں پر مختلف قیمت کیوں رکھتا ہے؟ یہ بات سمجھانے کے لئے مدرس کو بڑا اہتمام کرنا پڑے گا۔ کہیں وہ کوڑیاں اور تیلیاں فراہم کریگا۔ کہیں گنتی کا صندوق - بالفریم گولیاں اور تھیلیاں وغیرہ مہیّا کریگا۔ تاکہ وہ اپنے ننّھے شاگردوں کی اِس اُلجھن کو دُور کر سکے۔ دہائی کا تصوّر دلانے کی خاطر وہ اپنے شاگردوں میں دس دس گولیاں یا کوڑیاں بانٹ دے گا۔ اور انہیں ایک ایک تھیلی بھی دے گا۔ اور ہدایت کرے گا۔ کہ جو عمل میں کروں۔ تم بھی کرتے جاؤ۔ اب وہ اپنے دائیں ہاتھ میں ۹ گولیاں اور بائیں ہاتھ میں ایک گولی لے گا۔ پھر نو گولیوں میں ایک گولی ملا دے گا۔ اور کہے گا۔ کہ نو گولیاں اور ایک گولی مل کر دس گولیاں ہو گئیں۔ اب اِن گولیوں کو تھیلی میں بند کر دے گا۔ اور تھیلی بائیں ہاتھ میں پکڑ لیگا اور کہے گا۔ میرے بائیں ہاتھ میں دس گولیاں یعنی ایک دہائی ہے۔ اب سوال کریگا۔

کہ میرے بائیں ہاتھ میں کیا ہے؟ جواب ملے گا "ایک دہائی"۔ پھر پوچھے گا۔ کہ میرے دائیں ہاتھ میں کیا ہے۔ لڑکے جواب دیں گے "کچھ نہیں"

بعد ازاں گنتی کا صندوق سامنے رکھ کر اُس کے دائیں طرف کے پہلے خانے میں نو کوڑیاں رکھے گا۔ اور اُن میں ایک کوڑی اور ملا کر کہے گا۔ یہ اب ایک دہائی ہو گئی۔ پھر اِن کوڑیوں کو ایک تھیلی میں بند کر کے بائیں طرف کے خانے میں رکھ دے گا۔ اور لڑکوں سے پوچھے گا۔ کہ دوسرے خانے میں کیا رکھا ہے۔ لڑکے کہیں گے "ایک دہائی"۔ پھر دریافت کرے گا۔ کہ پہلے خانے میں کیا ہے۔ لڑکے جواب دیں گے "کچھ نہیں"۔ اب مدرس بتائے گا۔ کہ جب کوئی خانہ خالی ہو۔ تو اُس کو خالی ظاہر کرنے کے لئے ایک نقطہ ڈال دیا جاتا ہے جسے صفر کہتے ہیں۔ چونکہ اکائی کا خانہ خالی ہے۔ اس لئے ہم اس جگہ صفر کا نشان بنا دیں گے۔ اور دہائی کے خانے میں ایک لکھ دیں گے۔ مدرس اِس کی شکل تختہ سیاہ پر بھی بنائے گا۔ اور دس کی کتابت اپنے شاگردوں کو سکھائے گا۔

اکائی	دہائی
۰	۱

۱۰

جس طرح دہائی کا تصوّر دلایا گیا ہے۔ اِسی طرح آئندہ اسباق میں سینکڑے وغیرہ کا تصوّر دلائے گا۔ اور یہ بات ذہن نشین کرائے گا۔ کہ ایک عدد جوں جوں بائیں طرف ہٹتا جاتا ہے۔ اُس کی قیمت میں دس گُنا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چونکہ دہائی اور سینکڑے وغیرہ کا تصوّر حساب میں ایک بنیادی چیز ہے۔ اس لئے مدرس اس تصوّر کو پختہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ کبھی بالفریم استعمال کرے گا۔ کبھی تیلیوں کے مُٹھے بنوا کر اس عمل کو دُہرائے گا۔ کبھی مختلف قسم کے بیجوں اور دانوں وغیرہ سے کام لے گا۔ اور حساب کے بنیادی

قواعد یعنی جمع - تفریق - ضرب اور تقسیم کے لئے راستہ صاف کرے گا۔

جمع کے قاعدے میں "حاصل" کا سمجھنا بچّوں کے لئے مشکل ہوتا ہے - مدرس حاصل کا تصوّر دلانے کے لئے مندرجہ ذیل طریق اختیار کریگا - بالفریم کی چار سلاخوں پر علی الترتیب ۲، ۴، ۵، ۶ گولیاں نکالے گا - اور لڑکوں سے ان کا حاصل جمع دریافت کریگا - وہ کہیں گے "۱۷" - اب وہ یہ اعداد تختہ سیاہ پر لکھے گا۔ اور حاصل جمع نیچے لکھ دے گا۔

۲
۴
۵
۶

۱۷

پھر سترہ کے سات اور ایک کے متعلق سوالات کر کے بچّوں سے نکلوائے گا - کہ سات اکائیاں ہیں - اور ایک دہائی ہے - بعدازاں ہر ایک بچّے کی تختی پر ترتیب وار ۲، ۴، ۵، ۶ کوڑیاں رکھوا کر اور جمع کرا کے عملی طور پر اُنکو ذہن نشین کرائے گا۔ کہ ان اکائیوں سے مل کر ایک دہائی کیونکر پیدا ہوئی - اور سات اکائیاں کس طرح باقی رہ گئیں - چونکہ وہ پہلے ہی جانتے ہیں - کہ دس اکائیاں مل کر ایک دہائی ہوتی ہے - اس لئے وہ مدرس کے سوالات کے صحیح جواب دینے میں زیادہ دِقت محسوس نہیں کریں گے - اب مدرس بتائے گا - کہ اس طرح اکائیوں کے جوڑنے سے جو دہائیاں یا دہائیوں کے ملانے سے جو سینکڑے پیدا ہوتے ہیں - اُنہیں "حاصل" کہتے ہیں اگر حاصل دہائی ہو - تو اُسے دہائیوں میں جمع کیا جائیگا - اور اگر حاصل سینکڑہ ہو - تو وہ سینکڑوں میں جمع ہو گا۔

تفریق کے ایسے سوالات سکھاتے وقت بھی جن میں مفروق کے بعض ہندسے مفروق منہ کے بعض ہندسوں سے بڑے ہوں - مدرس کو خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے مثلاً مدرس لڑکوں سے پوچھتا ہے - کہ ۵۴ لڑکوں میں سے ۲۸ حاضر ہوئے - بتاؤ کتنے لڑکے

غیر حاضر ہیں۔ لڑکے چونکہ ایسے سوالات نکالنے کے طریق سے واقف نہیں۔ اسلئے
مدرس اُن کو مندرجہ ذیل طریق سے سمجھائے گا:۔

اگر تمہارے پاس ایک آنہ اور ایک پیسہ ہو۔ اور تم تین پیسے کی سیاہی لینا چاہو
تو کس طرح پیسے ادا کرو گے۔ وہ کہیں گے کہ آنہ بھنا لیں گے اور اس طرح ہمارے پاس
پانچ پیسے ہو جائیں گے۔ اب اُن میں تین پیسے ادا کر دیں گے۔ اس کے بعد مدرس
بتائے گا۔ کہ ۵۴ میں سے ۲۸ تفریق کرتے وقت پانچ اکائیوں میں سے آٹھ اکائیاں
تفریق نہیں ہو سکتیں۔ اس لئے ہم چار دہائیوں میں سے ایک دہائی لے کر اُس کی
اُس کی دس اکائیاں پانچ اکائیوں میں جمع کر دیں گے۔ وہ پندرہ ہو جائیں گی۔ اب
پندرہ میں سے آٹھ اکائیاں تفریق کر دیں گے۔ تو سات اکائیاں باقی بچ رہیں گی۔
اب چار دہائیوں میں سے چونکہ ایک دہائی لے چکے ہیں۔ اس لئے تین دہائیوں میں
سے دو دہائیاں تفریق کریں گے۔ ایک دہائی باقی رہ جائے گی۔ اس بات کے ذہن
نشین کرانے کے لئے گولیوں اور تھیلیوں وغیرہ کا استعمال بھی حسبِ سابق کیا جا
سکتا ہے۔

تفریق کے بعد مدرس ضرب سکھاتا ہے اور اس قاعدے کی تکمیل کئی ایک
منزلوں میں کراتا ہے۔ مگر یہاں صرف دو منزلوں کا ذکر کیا جائیگا۔ کیونکہ اِن کے طے
کرانے میں مدرس کو نسبتاً زیادہ اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ وہ دو منزلیں یہ ہیں:۔

(۱) جمع متواتر کے مقابلہ سے ضرب کا تصوّر۔

(۲) بڑے اعداد کی ضرب۔

ضرب کا تصوّر دلانے کے لئے وہ ذیل کا طریق کار اختیار کریگا۔ پانچ لڑکوں
میں سے ہر ایک کو سات سات کوڑیاں دے دیگا۔ اور لڑکوں سے پوچھے گا۔ میں
نے کتنی کوڑیاں بانٹی ہیں؟ پھر تختہ سیاہ پر یہ سوال جمع کی صورت میں لکھ کر حل کرائیگا

اور لڑکوں سے دریافت کرے گا۔ کہ کس قاعدے سے سوال حل کیا ہے۔ وہ کہیں گے "جمع کے قاعدے سے"۔

اب پوچھے گا۔ میں نے کتنی کتنی کوڑیاں ایک ایک لڑکے کو دی ہیں۔ جواب ملے گا "سات سات"۔ تختہ سیاہ پر سات کا ہندسہ لکھ دے گا۔ اب پوچھے گا۔ کتنے لڑکوں کو کوڑیاں دی گئی ہیں؟ لڑکے جواب دیں گے۔ "پانچ لڑکوں کو"۔ اب ۷ کے نیچے ۵ کا ہندسہ لکھ دیگا۔ اور اُن کے نیچے ایک لکیر کھینچ دیگا۔ پہاڑے کی مدد سے جواب حاصل کریگا۔ اور ۳۵ لکھ دیگا۔ جواب کا مقابلہ کرائے گا۔ اور پوچھے گا کہ کس قاعدے سے سوال نکالنے میں کم جگہ صرف ہوئی ہے۔ اور کم وقت لگا ہے۔ لڑکے جواب دیں گے۔ "دوسرے قاعدے سے"۔ وہ کہے گا۔ کہ ایسے سوالوں کے حل کرنے کے لئے دوسرا قاعدہ بہتر ہے۔ اور بتائے گا۔ کہ جمع کے اس مختصر قاعدے کا نام ضرب ہے۔

بڑے اعداد کی ضرب سکھانے وقت فرض کرو۔ کہ مدرس ۳۸۷ کو ۲۳۶ سے ضرب دینا چاہتا ہے۔ تو ۶ کی ضرب کے بعد وہ لڑکوں کو بتائے گا۔ کہ ۳ دہائیوں کی ضرب گویا ۳۰ کی ضرب ہے۔ اس لئے ۳ کی ضرب کے شروع میں ہم ایک صفر لگائیں گے۔ اور ۲ کی ضرب۔ درحقیقت ۲۰۰ کی ضرب ہے۔ اس لئے ۲ کی ضرب کے شروع میں ہم دو صفر لگائیں گے۔ اور عمل یوں لکھا جائے گا:-

$$\begin{array}{r} ۳۸۷ \\ ۲۳۶ \\ \hline ۲۳۲۲ \\ ۱۱۶۱۰ \\ ۷۷۴۰۰ \\ \hline ۹۱۳۳۲ \end{array}$$

اب طلبہ کو سمجھائے گا۔ کہ اگر دوسری اور تیسری ضرب کے شروع کے صفروں

کو کاٹ دیں۔ تو بھی مجموعہ میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پس ہم ضرب میں اِن صفروں کو مٹا دیا کریں گے۔ یا سرے سے لکھا ہی نہیں کریں گے۔ اور ان کی جگہ خالی چھوڑ دیا کرینگے یعنی مضروب فیہ کے جس ہندسے سے ضرب دیں گے۔ اُس کی ضرب اُس درجے سے شروع کریں گے۔ جس درجے کا وہ ہندسہ ہے۔ مثلاً

```
      ۴۷۵
      ۱۳۵
    -----
     ۲۳۷۵
    ۱۴۲۵
   ۴۷۵
  -------
   ۶۴۱۲۵
```

اب مدرس متعدد مثالوں سے اِس قاعدے کی مشق کرائے گا۔

تقسیم کے قاعدے کی تکمیل بھی مدرس ضرب کی طرح منزل بہ منزل کرائیگا مثلاً (۱) تفریق متواتر کے مقابلہ سے تقسیم کا تصوّر (۲) جب مقسوم علیہ میں صرف اکائی کا درجہ ہو اور مقسوم کا ہر ایک ہندسہ اُس پر علیحدہ علیحدہ تقسیم ہو سکے (۳) مقسوم علیہ اکائی ہو۔ مگر مقسوم کا ہر ایک ہندسہ اُس پر تقسیم نہ ہو سکے۔ البتہ تمام عدد پورا تقسیم ہو جائے۔ (۴) مقسوم علیہ اکائی ہو۔ مگر مقسوم کا نہ تو ہر ایک ہندسہ اُس پر تقسیم ہو سکے اور نہ سارا عدد پورا تقسیم ہو سکے۔ (۵) جب مقسوم علیہ دہائی کے درجے تک اتنا بڑا عدد ہو۔ جس کا پہاڑہ طلبہ کو یاد ہو۔ (۶) بڑے اعداد کی تقسیم (۷) تقسیم بذریعہ اجزائے ضربی۔ اِن میں سے یہاں صرف پہلی۔ چوتھی اور چھٹی منزل کا ذکر کیا جائیگا

تقسیم کا تصوّر دلانے کے لئے مدرس پہلے بچّوں سے تفریق کے چند آسان سوال دریافت کرے گا۔ مثلاً (۱) آٹھ میں سے دو کتنی دفعہ تفریق ہو سکتے ہیں (۲) بارہ میں سے چار کتنی دفعہ نکل سکتے ہیں وغیرہ۔ اب کسی طالب علم کو مدرس ۲۰ گولیاں دے کر جماعت کے روبرو کھڑا کر دیگا۔ اور اُس سے پانچ پانچ گولیاں

یک ایک لڑکے کو دلائے گا۔ اور یہ عمل ساتھ ساتھ تختہ سیاہ پر بھی کرتا جائیگا۔
یب سب گولیاں تقسیم ہو چکیں گی۔ تو مدرس دریافت کریگا۔ کہ کتنے لڑکوں کو گولیاں
دی گئیں ؟ جواب ملے گا۔ "آٹھ لڑکوں کو"۔ اب مدرس نے جس قاعدے سے تختہ سیاہ
پر سوال حل کیا ہے۔ اُس کا نام پوچھے گا۔ لڑکے جواب دیں گے۔ "تفریق"۔ مدرس
تفریق کا لفظ تختہ سیاہ پر لکھ دیگا۔ اس کے بعد مدرس بتائیگا۔ کہ یہ سوال ایک
دوسرے طریق سے بھی نکل سکتا ہے۔ مدرس لڑکوں سے پوچھے گا۔ کے گولیاں بانٹی ہیں؟
لڑکے کہیں گے۔ "چالیس"۔ مدرس پہلے عمل کے مقابل میں ۴۰ لکھ دیگا۔ پھر سوال
کرے گا۔ ایک لڑکے کو کتنی کتنی گولیاں دی گئی ہیں ؟ جواب ملے گا۔ "پانچ پانچ"۔
اب چالیس کے بائیں جانب ٹیڑھی لکیر کھینچ کر ۵ لکھ دیگا۔ اور پوچھے گا۔ "کے پانچ
چالیس ؟ جواب ملے گا۔ "آٹھ پانچ"۔ چالیس کی دائیں جانب ٹیڑھی لکیر کھینچ کر
آٹھ لکھ دیگا۔ اور چالیس کے نیچے چالیس لکھ کر طلباء سے تفریق کرائے گا۔ پھر
بذریعہ سوالات اخذ کرائیگا۔ کہ تفریق متواتر کا عمل طویل ہے۔ اس میں جگہ بھی
زیادہ صرف ہوتی ہے۔ اور وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ مگر دوسرا عمل مختصر ہے۔ اور
جلدی ہو سکتا ہے۔ اب مدرس بتائے گا۔ کہ ایک بڑے عدد میں سے کسی چھوٹے
عدد کے بار بار گھٹانے کے مختصر عمل کو تقسیم کہتے ہیں۔

مدرس تقسیم کے ایسے سوال سکھاتے وقت جن میں مقسوم علیہ اکائی ہو۔ لیکن
مقسوم کا نہ تو ہر ایک ہندسہ اُس پر تقسیم ہو سکے اور نہ سارا عدد پورا تقسیم ہو سکے۔
ذیل کا طریق اختیار کریگا مثلاً مدرس ۹۷ کو ۵ پر تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ مدرس
لڑکوں سے بذریعۂ سوالات لکھوائے گا کہ ۹۷ میں سات اکائیاں ہیں اور نَو
دہائیاں ہیں۔ اب وہ کہے گا کہ ہم اِسے پانچ پر تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے اکائیوں
یا دہائیوں کو تقسیم کے پہلے سیکھے ہوئے اصولوں کی مدد سے سوالات کے

ذریعے وہ لڑکوں سے اخذ کرائیگا۔ کہ دوسرے قاعدوں کے خلاف ہمیں اِس میں دہائیوں سے عمل شروع کرنا چاہیئے۔ تاکہ اگر کوئی دہائی بچ رہے۔ تو اُس کی اکائیاں اکائیوں میں جمع کر کے تقسیم کی جا سکیں۔

اب وہ ۹۷ کو ۵ پر تقسیم کرے گا۔

۵) ۹۷ (۱۹
۵
۴۷
۴۵
۲

اور عمل کرتے وقت لڑکوں سے پوچھتا جائے گا۔ نو دہائیوں کو پانچ پر تقسیم کیا۔ تو باقی کتنی دہائیاں بچیں؟ ان دہائیوں کی اکائیاں بنا کر ان میں ۷ اکائیاں جمع کیں۔ تو کُل کتنی اکائیاں ہو گئیں؟ ہر ایک کے حصے میں کتنی اکائیاں آئیں؟ کتنی اکائیاں بچیں؟

اب مدرس بتلائے گا۔ کہ دو اکائیاں جو بچ رہی ہیں۔ ان کو "باقی" کہتے ہیں۔ بڑے اعداد کی تقسیم سکھاتے وقت مدرس تقسیم کے آموختہ اصولوں کا بذریعہ سوالات اعادہ کرائے گا۔ اس کے بعد کوئی مناسب مثال بڑے اعداد کی تقسیم سکھانے کے لئے منتخب کرلے گا۔ مثلاً وہ تختہ سیاہ پر ۵۷۹۸ لکھ کر لڑکوں کو کہے گا کہ اِسے ۲۳ پر تقسیم کرو۔ چونکہ لڑکے ۲۳ کا پہاڑہ نہیں جانتے۔ اِس لئے وہ یہ سوال حل نہیں کر سکیں گے۔ اب مدرس طلبہ کو بتائے گا۔ کہ جب مقسوم علیہ اِتنا بڑا عدد ہو۔ کہ تم اُس کے پہاڑے سے ناواقف ہو۔ تو مقسوم کے بائیں طرف کے ہندسے کو مقسوم علیہ کے بائیں طرف کے ہندسے پر تقسیم کرو۔ اور خارج قسمت سے تمام مقسوم علیہ کو ضرب دے کر مقسوم کے بائیں طرف ہندسوں کے نیچے لکھ دو۔ سیکڑوں سے جو باقی بچے۔ اُن کی دہائیوں میں دہائیاں ملالو اور تقسیم کرو۔ پھر دہائیوں سے جو باقی بچے۔ اُن کی اکائیوں میں اکائیاں ملا کر اسی طریق سے تقسیم کرتے جاؤ۔ مندرجہ بالا مثال وہ اس طرح حل کرائے گا۔ پانچ تو ۲۳ پر تقسیم نہیں ہو سکتا۔ اِس کے سیکڑے بنا کر اِن میں ۷ جمع کر دو۔ اب ہمیں یہ ۵۷ سیکڑے

۲۳ پر تقسیم کرنا ہے۔ چونکہ ۲۳ کا پہاڑہ تم نہیں جانتے۔ اس لئے ۵ کو ۲ پر تقسیم کرو ۲ خارج قسمت آئے گا۔ ۲۳ کو ۲ سے ضرب دو اور ۵۷ کے نیچے لکھو گیارہ سینکڑے باقی بچ رہے۔ ان کی دہائیوں میں ۹ دہائیاں جمع کیں - ۱۱۹ دہائیاں ہوگئیں۔ اب پہلے طریقے کے مطابق ۱۱ کو ۲ پر تقسیم کرو۔ خارج قسمت ۵ آئے گا۔ ۲۳ کو ۵ سے ضرب دے کر ۱۱۹ کے نیچے لکھو۔ تفریق کرنے سے ۴ دہائیاں بچ رہیں۔ اِن کی اکائیوں میں ۸ اکائیاں جمع کرو ۴۸ اکائیاں ہوگئیں سابقہ طریقے سے ۴ کو ۲ پر تقسیم کرو۔ خارج قسمت ۲ آئے گا۔ ۲۳ کو ۲ سے ضرب دے کر ۴۸ کے نیچے لکھو۔ تفریق کرنے سے فقط ۲ اکائیاں باقی بچ رہیں گی۔ اور ۲۵۲ خارج قسمت حاصل ہوگا۔

```
۲۳ ) ۵۷۹۸ ( ۲۵۲
     ۴۶
     ---
     ۱۱۹
     ۱۱۵
     ---
       ۴۸
       ۴۶
       --
        ۲
```

اِس قسم کے کئی ایک سوال حل کرا کے مدرس اِس قاعدے کی مشق کرائے گا۔

حساب کے باقی قواعد سے تعلق رکھنے والی مشکلات کا حل اِس مقالہ کی آئندہ اقساط میں پیش کیا جائے گا۔

ہمارا نصب العین اور لائحۂ عمل

سلیم فارانی

(یہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی کی اردو کانفرنس کے اجلاس مقالات منعقدہ
۲۸ مارچ ۴۸ء میں پڑھا گیا تھا)

گذشتہ چند دنوں کی بات ہے کہ زبان اردو کی جان اپنے دشمنوں کے نرغے میں کچھ ایسی بری طرح پھنس گئی تھی، کہ اس کے حامی و حواری بھی ناسازگاریٔ فضا کی تیزی و شدت سے بلبلا اٹھے تھے؛ حالات جو کروٹ لے رہے تھے، اس سے نظر آرہا تھا کہ اب اس زبان کی خیر نہیں، خائف حواری اپنی پُرجوش تدابیر کے باوجود مایوس ہوتے جارہے تھے۔ اور ہلاکت کے گرداب سے بچ نکلنے کی کوئی سبیل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مخلصین کی ہمت مخالفین و منافقین کے استبداد و غلبہ کے مقابلے میں ٹوٹنے کو تھی، کہ اپنی قدرت کے اٹل قانون کی لاج رکھنے کی خاطر خلّاق السنہ کا جذبۂ مخلوق نوازی جوش میں آیا، اس برعظیم کو جس کے چپّے چپّے پر اس زبان کی ملکیّت کا حق ثبت تھا لیکن جس کے اندر حسد و بغض، اور ظلم و غضب کے عناصر نمودار ہو چکے تھے، اور بُری طرح اس زبان کی ہستی کے درپے تھے، اس زبان کی بقائے دوام کے لئے دو ٹکڑے کر دیا تاکہ متعدی و مہلک جراثیم یک طرف ہو جائیں اور اس زبان کا میدانِ عمل ہر طرح پاک ہو جائے۔ منافقین و مخلصین کے درمیان ایک سدِ امتیاز قائم کر دی" وامتازوا الیوم"

کا صور پھونک دیا اور اس برِّ عظیم کے پاک حصّے کو اس زبان کے لیے خلد بریں بنا دیا۔ منافقین کو "موتوا بغیظکم" کے جہنم ابدی میں ڈال دیا، مخلصین کو خلد بریں میں بے خوف و خطر مسکن عطا فرمایا۔ اسی خلد بریں میں ہم اور ہماری محبوب زبان آج محفل آرا ہیں۔ ہماری زبان کو اور ہم سب کو مبارک۔

ہماری فضا اب اُن قباحتوں، آلائشوں، جادوگریوں اور جھگڑوں سے قطعی طور پر پاک وصاف ہے۔ جو اس زبان کو خراب کرنے، ذلیل کرنے، مقہور بنانے اور مٹانے کی خاطر سرگرم عمل تھے۔ اب ہماری راہ میں یہ روڑے نہیں رہے کہ اُردو زبان مسلمانوں کی ہے یا ہندو اور مسلمان دونوں کی، اُردو زبان ملک کی زبان بننے کی حقدار ہے یا نہ، دفتری زبان اُردو ہو یا ہندی اور پنجابی؛ اُردو رسم الخط فارسی ہو یا دیوناگری، ذریعہ تعلیم اُردو ہو یا ہندی۔

اُردو زبان جس قوم کی تھی اُسے مل گئی۔ ملکی زبان تھی، اسے ملک مل گیا، سرکاری زبان کی خصوصیت رکھتی تھی، سرکار مل گئی، دفتری زبان بننے کی حقدار تھی۔ دفاتر میں اس کے متعلق جوش و خروش ہے۔ ذریعہ تعلیم کی مسند اسے لینی تھی، مسند اس کے پاؤں چومنے کو جھکی ہوئی ہے۔ اب اسے اس جنّت میں پنپ کر دنیا کی متمدّن ترین قوموں کی اعلےٰ زبانوں کے معیار تک پہنچنا اور ان کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس کے حواریوں کو اب پرانی الجھنوں میں الجھنا نہیں ہے۔ انہیں اب حاصل شدہ حقیقتوں کے حصول کے ذرائع کو دہرانا نہیں، بلکہ حاصل شدہ معیار کی بنیاد پر مستقبل کی عمارت کے قیام کا لائحۂ عمل تیار کرنا ہے۔ وہ تدابیر استعمال کرنا ہیں، جو اسے دنیا کی بہترین زبانوں کی صف اوّل میں لا کھڑا کریں۔ اعلےٰ زبانوں کے جو معیاری خصائص ہیں۔ انہیں پیدا کرنا ہے۔ اس زبان کے وہ تمام پہلو چمکانے ہیں۔ جن سے اس کی عظمت اور اس کا جلال دنیا پر ظاہر ہو۔ قومی زبان یہ بن چکی، اب اسے بین الاقوامی عروج حاصل کرنا ہے۔ یہی ہمارا مقصد اتم ہونا چاہیئے۔ حکومت نے اسے قومی بنایا، ہماری جمعیت ایسا لائحۂ عمل تیار کرے کہ یہ قومی حیثیت کی استواری کے ساتھ ساتھ

ترقی کرکے بین الاقوامی مرتبہ حاصل کرلے۔

دنیا کی ارفع و اعلیٰ اور وقت کی مستعمل بین الاقوامی زبان انگریزی ہے، اُردو کو اس کا حریف بننا ہے۔ نقالی سے نہیں بلکہ درونی خصوصیات سے، اقوال سے نہیں بلکہ اعمال سے، صورت سے نہیں بلکہ اثر و معنی سے، زور سے نہیں بلکہ جاذبیت سے، اسے اُس کی طرح سب کے دل و دماغ پر چھا جانا ہے، دنیا جہان کو اپنی طرف راغب کرنا ہے، اپنے اندر وہ جاذبیت اور وہ کشش پیدا کرنا ہے کہ جس طرح ہر قسم کے علم کے لئے انگریزی زبان سے استفادہ کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح ہر علم کے لئے ہر محقق اس زبان کا بھی طلبگار ہو، مغربیت اگر انگریزی کے بغیر متعارف نہ ہوسکے، تو مشرقیت عظمیٰ سے شناسائی اُردو کے بغیر ناممکن ہو جائے، نہیں بلکہ مشرقیت و مغربیت دونوں کی مکمل شناسائی کے لئے ہر محقق و مدقق اُردو زبان سیکھنے کا محتاج ہو جائے، ہماری نشست ہماری یہ محفل آرائی اگر اس اہم مقصد کے حصول کے لئے کوئی اہتمام نہیں کرسکتی تو ہم بھی ایک عام مرض "نشستند، و گفتند و برخاستند" کے مبتلا مریضوں کی طرح معالجہ کے مستحق ٹھہریں گے، اس زبان کی اہم خدمت انجام دینے اور اس کے مخلص خدام ہونے کے مدعی نہیں بن سکتے۔

انگریزی زبان کی فوقیت سے لفظی انکار کرکے اس کے مقابلے میں اُردو زبان کا لفظی پرچار کرنا اور ڈھونگ رچانا لغو اور بے سود ہے۔ انکار و دعویٰ سے کسی چیز اہمیت کا امکان ناممکن ہے جب تک کہ حقائق و اعمال اس اہمیت کا ثبوت بہم نہ پہنچا ہمیں حسد نہیں کرنا، رشک کرنا ہے، لیکن رشک زبانی نہیں بلکہ عملی، عملی اجتہادِ مسلسل اور پیہم کہ اس زبان کی خوبیاں بلکہ ان سے بھی ارفع و اعلیٰ خوبیاں اُردو زبان میں حقیقتاً پیدا ہو جائیں

انگریزی زبان کے میدان ترقی کی وسعتوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا کہ اس زبان کی اہمیت و عظمت کی ذمہ دار چار چیزیں ہیں۔ تنظیم و تدوین، توسیع، ترویج، تد

ان چار راہوں میں زبان کے اقدامات اسقدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ باقی زبانیں بہت پیچھے نظر آتی ہیں۔ ان چہار گانہ اقدامات ہی کی برکت ہے کہ انگریزی کو موجودہ وقار دُنیا میں حاصل ہے۔ اگر اُردو زبان کو ایسا وقار حاصل کرنا ہے۔ تو اس کے خدام کا فرض ہے کہ اس کے سلسلے میں ان چاروں پہلوؤں سے ترقی کی مساعی بروئے کار لائیں۔

اُردو کو اب انگریزی کا حریف بننا ہے؛ اس کا مقابلہ اب یا جب کبھی ہُوا تو انگریزی سے ہی ہوگا؛ اس بین الاقوامی زبان ہی کی زد میں اسے آنا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اُردو اپنے اندر اس مقابلے کے لئے صحیح قوت پیدا کرلے اور ان تمام راہوں میں انگریزی کی مدمقابل بن جائے جن میں انگریزی اپنی تیز رفتاری اور ترقی پر نازاں ہے تاکہ دنیا جب بین الاقوامی زبان کے رتبہ پر نظرِ ثانی کرے تو اُردو انتخاب میں بازی لے جائے۔ ہمیں اپنے سامنے اب یہی مقصد رکھنا ہے۔ یہی ہمارا نصب العین ہونا چاہیئے۔ اس اہم نصب العین کے حصول کی خاطر ہمیں متذکرہ بالا چار پہلوؤں کو مناسب طور پر چمکانا ہے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہماری زبان کی تنظیم و تدوین میں ہماری مساعی کہاں تک اِس قابل ہیں کہ ہم اپنے اہم نصب العین کے حاصل کرلینے کی اُمیدیں اُن سے قائم کریں۔ انگریزی زبان بہت سال آگے ہے، انگریزی زبان کی لسانیات، صوتیات اور نفسیات کی تنظیم و تدوین کے علاوہ لغت، صرف و نحو، ارتقائے رسم الخط، تلفظ، وغیرہ مستقل علوم و فنون کی صورت اختیار کرچکے ہیں اور محققین و مفکرین شب و روز استحکام و آرائش کی خاطر مصروف عمل ہیں۔ زبان کے متعلق یہ مدوّن علوم و فنون دنیائے فکر و عمل کے ارباب کی نظروں کو خیرہ کر کے اِس زبان کے کمال و عظمت کی حیرت اہل کمال پر طاری کر رہے ہیں۔ فقط حیرت ہی نہیں بلکہ ہیبت بھی۔ اور یہی ہیبت ہر دل و دماغ کو مجبور کئے ہوئے ہے۔ کہ زبان کے متعلق ایسے علوم و فنون کی ایجاد کو اس زبان کے رعب و وقار کا سببِ اعظم سمجھے۔ اُردو زبان کو یہ رعب و وقار حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ تاکہ انگریزی سے

حریفانہ چشمک ہو سکے لیکن ابھی تک اُردو لسانیات کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی۔ اس کی صوتیات پر چند معمولی سی کوششوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوا، اس کی نفسیات تو سرے سے ایجاد ہی نہیں ہوئی۔ البتہ علم صرف و نحو موجود ہے۔ لیکن وہ بھی صرف زبان کی ساکنیت کا آئینہ دار۔ ارتقائے رسم الخط پر کوئی تسلی بخش غور نہیں کیا گیا، اگر کچھ ہوا بھی تو وہ ہندی اُردو کے جھگڑوں کی نذر ہوا۔ تلفظ، الحان، اور تراکیب الفاظ کا پہلو بھی تشنۂ تکمیل پڑا ہے یہ کمی اُردو کو حریفانہ مقابلے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ ضرورت ہے کہ اس کی لسانیات کی باقاعدہ تدوین ہو۔ صوتیات تیار کی جائے۔ نفسیات کی صورت قائم ہو۔ صرف و نحو کے ایسے اصول بنائے جائیں جو زبان کو استوار کریں لیکن وسعت کی صلاحیت نہ چھینیں کوئی مفکر و محقق اس کے رسم الخط کے ارتقائے مدارج پر تحقیقی توجہ کرکے ایک نظام پیش کرے اسی طرح تلفظ و الحان کو بھی علمی صورت بخشی جائے تاکہ معلوم ہو کہ اس سلسلے میں زبان کے اندر سب کچھ موجود ہے۔ بلکہ اس قسم کا غور و فکر اس زبان کے استحکام اور وقار کے لئے ہر طرح معاون ہو اور ایسا معیار قائم کردے کہ بین الاقوامی زبان انگریزی کو فوقیت کا دعوے کرنے کی مجال نہ ہو۔ یہ کام حکومت کی امداد اور یونیورسٹی کی تربیت سے بہت جلد ہو سکتا ہے، صرف ارادے کی ضرورت ہے اور اس کے ساتھ عملی اقدام کی جرأت کی۔

دوسرا پہلو توسیع کا ہے۔ انگریزی زبان نے فراخ دلی، شوق، جذب اور خود افزائی سے کام لے کر اپنا دامن ہر علم و فن اور ہر زبان کے لطیف الفاظ کے سامنے پھیلائے رکھا اس کے دامن میں جو کچھ آیا اس نے اپنا رنگ چڑھا کر اپنا لیا۔ اور اس طرح اپنایا کہ اجنبیت کی بو تک اس چیز سے جاتی رہی۔ جہاں کہیں اس کا دامن باہر سے کچھ حاصل نہ کر سکا اس کے اندر سے ہی مایحتاج کی تخلیق ہوئی۔ غرض اخذ و اختراع نے اس کی وسعت کو عالمگیر بنا دیا، یہی عالمگیری وہ وصف ہے کہ جس میں اُردو کو انگریزی

زبان کا مقابلہ کرنا ہے۔ اُردو نے تمام زبانوں کی طرح اخذ و اختراع سے ہی ابتدائی
نشو و نما پائی متقدمین کے احسان عظیم کی مہر اس کے جبۂ حیات پر ثبت ہے۔ اخذ و
اختراع کی رفتار زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ ہونی چاہیئے۔ متقدمین نے اس
سلسلے میں قابل قدر اور لا مثال خدمات انجام دیں، وقت کی ضرورتوں کے مطابق
اخذ و اختراع کے ذریعے اس زبان کو ایسا رواں کر دیا کہ اس میں اس وقت کی دوسری
زبانوں کے مقابلے میں زیادہ جاذب قسم کی وسعت اور سلاست، لطافت اور عذوبت
نظر آنے لگی۔ اُردو کے اس پیدا کردہ معیار کے جمالیاتی منظر کے سامنے متقدمین کے ورثا
جھک گئے اور ایسے جھکے کہ بجائے اس کے کہ اختراع و اخذ کے رویّے کو جاری رکھتے
متقدمین کی زبان کو آخری مرحلہ قرار دے دیا۔ اُنہیں جب اس زبان میں ہر قسم کے خیال
ادا کرنے کی صلاحیت نظر آئی تو سمجھے کہ اسمیں اضافے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اضافہ گناہ ہے
چنانچہ بعد میں جب کبھی کسی نے اس قسم کے اضافے کی کوشش کی اُس پر تنقید و تعجب کی
انگلیاں اُٹھیں۔ اُردو زبان پر جمود کا جو یہ زمانہ گذرا ہے اگر اسمیں بھی اختراع و اخذ کا سلسلہ
جاری رہتا تو آج ہم فقط یہی نہ سمجھتے کہ اُردو قومی زبان ہونے کی ہر طرح اہل ہے بلکہ ہم
دیکھتے کہ یہ اپنے اندر ساری دنیا کو سمٹائے ہوئے ہے۔ اور قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی
رتبہ و معیار کے قابل ہے۔ بھلا اندازہ کیجیئے متقدمین نے جنہیں دنیا اور اس کی دوسری
زبانوں سے اختلاط و ارتباط کے ذرائع میسّر نہیں تھے، اپنی محدود ابتدائی کوششوں سے
تو اسے یہ معیار عطا کیا کہ انگریز کے ہندوستانی دفاتر کو اسی نے رواں کیا، تعزیرات ہند
کی دفعات کی باریکیوں اور اس کے ہر پیچ و خم کا ایسا حیرت انگیز آلۂ اظہار بنی کہ دنیا بھر کی
آنکھیں ششدر رہ گئیں اور مغرب کو بھی اس زبان کی اہمیت و صلاحیت کا قائل ہونا پڑا۔
اگر یہ درمیانی جمود کا زمانہ اس پر نہ آیا ہوتا اور قدامت پرستی اس کے اختراع و اخذ کی
راہوں میں دیواریں قائم نہ کرتی۔ تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ اُس تیز رفتار دور میں جبکہ

دنیا کے ہر گوشے اور ہر زبان سے اختلاط و ارتباط کی تمام سہولتیں میسر آچکی تھیں کسقد
ترقی کرتی اور آج کہاں پہنچی ہوتی ؟

زبان کی ترقی و عروج کے لئے اخذ و اختراع کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جو زبان
اخذ و اختراع نہیں کرتی وہ بے جان اور مُردہ ہے۔ اس میں نہ توسیع کی صلاحیت ہوتی
ہے نہ زندگی کی نئی نئی ضرورتوں اور صورتوں کے ساتھ مطابقت رکھنے کی اہلیت۔ زندگی
کے ماحول کا تغیر ناگزیر ہے۔ ماحولی تغیر کے ساتھ ساتھ ایجادات و خیالات کا تغیر بھی ناگز
ہے۔ متغیر فضا کے اثرات، ایجادات اور متغیر حالات کے اظہار کے لئے نئے نئے الفا
اور نئے نئے اسالیب کی ضرورت پڑتی ہے اور اس سلسلے میں اقدام و حرکت زبان کے
از بس ضروری ہے جمود زبان کی زندگی، ترقی، توسیع اور ہر دلعزیزی کا دشمن ہے۔ زبا
کو جمود سے محفوظ رکھنا اور تحرک و تعمّل کا عادی بنانا زبان کے حواریوں کا اہم فرض ہے۔

اختراع و اخذ کے سلسلے میں حُسن و قبح کا امتیاز نہایت ضروری ہے حُسن قبو
کیا جائے۔ قبح رد کیا جائے۔ یہاں یہ کہہ دینا بے جا نہ ہوگا کہ قبیح قسم کے اخذ و اختراع
بجائے اس کے کہ زبان کی توسیع میں امداد دیں زبان کو بگاڑتے ہیں۔ اور اس کی محدُ
کا اعلان کرتے ہیں۔ اخذ و اختراع کا یہ مطلب نہیں۔ کہ دوسری زبانوں کی نقّالی میں اُ
کے طرزِ خیال کو ادا کرنے کی خاطر الفاظ جوں کے توں لے لئے جائیں یا ایسی ترجمانی کی
جو ہماری زبان میں رچ نہ سکے اور پھر اسے اپنے زعم میں جچتا ہُوا خیال کر کے اس
استعمال و اشاعت کے لئے جماعت بندی یا پراپیگنڈا سے جبری کام لیا جائے!
قسم کے بھونڈے اخذ اور اس نوع کی قبیح اختراعات علم لسان کے ماہرین کے سا
اس زبان کی کم مائگی کا ڈھنڈورا پیٹتی ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں۔ کہ زبان اب اوچھے ہتھ
پر اُتر آئی ہے۔" اس طرح زبان سے جاذبیت کا عنصر فنا ہونے لگتا ہے۔

اختراع کے لئے سلامت ذوق اور زیبائش صوری و معنوی کی ضرورت۔

ر اخذ کے لئے تصرف حسنہ کی۔ متقدمین نے انہی ہتھیاروں سے کام لیا۔ چنانچہ ان کے
رنامول کو زندگی جاوید حاصل ہوئی، انہوں نے جو کچھ اختراع کی۔ زبان میں کھپ گئی۔
ہوں نے جو لفظ دوسری زبان سے اخذ کیا اسے جوں کا توں نہ رکھا، بلکہ مناسب تصرّف
سے اُسے اپنا لیا۔ اُردو دشمنوں کے ہنگاموں کا ممنون ہونا چاہیئے۔ کہ انہوں نے غافل
لدادگان و حامیان اُردو کو چونکا دیا۔ خطرے سے بچنے کی خاطر انہوں نے گذشتہ چند
سالوں میں اخذ و اختراع کی طرف تیز رفتاری سے اقدامات کئے۔ لیکن جس طرح کاشت
کی ہوئی فصل کے ساتھ ساتھ خود رو روئیدگی بھی نمودار ہوتی ہے اور فصل کی بہار میں
شامل رہتی ہے۔ اسی طرح چند جوشیلے حلقے بے سلامت و بدزیب اختراعات اور بے تصرف
اخذ یا بدتصرف اخذ کے ساتھ اُردو زبان کی خدمت کے مدعی بن کر شامل رہے۔ فصل
کی حفاظت کے لئے جس طرح خود رو پیداوار کو کاٹ چھانٹ کر علیحدہ کر لیا جاتا ہے اسی
طرح ان بھونڈے اختراعات و اخذ کے کارناموں کو کاٹنے چھانٹنے کی ضرورت ہے۔

ہم اس سلسلے میں انجمن ترقی اُردو کی حیرت انگیز محنتوں اور کاوشوں کی داد دیئے
بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن جو کچھ ہو چکا ہے اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے۔ حامیان اُردو کو
اپنی اَن تھک مساعی اور بھی تیز کرنے ہیں۔ اور اختراع و اخذ کے سلسلے میں تیز رفتاری
کے ساتھ قدم بڑھا کر اس زبان کے دامن کو اسقدر وسیع کر دینا ہے۔ کہ دنیا بھر کی اعلیٰ
زبانوں کی خوبیاں اور جاذبیتیں اس میں سمٹی چلی آئیں۔ صلہ و جزا کے متعلق کہنے کی ضرورت
نہیں۔ حیاتِ اُردو ان کوششوں کا صلہ ہے اور جاذبیتِ اُردو کی بیکراں وسعت ان
کاوشوں کی جزا۔

تیسری اہم چیز ترویج ہے: انگریزی کی ترویج پر نگاہ ڈالیئے۔ اس کی ادبیات،
اس کے اخبار و رسائل، اس کے دفاتر، اس کی طباعت و کتابت، اس کے ادارے،
اس کے تراجم، اسکی تصانیف، اس کی تنقیدیں، اس کا ریڈیو، غرض ہر چیز روز افزوں

معیار دکھاتی ہے۔ اور ترقی کی راہ میں پیہم مصروف عمل ہے۔ یہ امر بہت ہمت افزا ہے کہ اُردو زبان کی ترویج کے لئے بھی کافی شعبے سرگرم عمل ہیں۔ لیکن یہ سرگرمی ہمارے نصب العین کے لحاظ سے ناکافی ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ان تمام شعبوں پر اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق نگاہ تنقید ڈالیں اور دیکھیں کہ یہ تمام وسایل و ذرائع ترویج اس زبان کی قومی حیثیت کو بلند کر رہے ہیں یا اس کی حیثیت کو گرا رہے ہیں۔ ایسے عناصر تو پیدا نہیں ہو رہے جس سے اس قومی زبان کی پختگی، عمدگی، لطافت، عذوبت اور جاذبیت کے فنا ہونے کا اندیشہ ہو، ہمیں دیکھنا ہے کہ ہماری ادبیات اعلیٰ مسلمہ زبان کی ادبیات سے کہاں تک ٹکراتے ہیں۔ ہمارے مشاعرے، ہماری شاعری کو کہاں تک وہ معیار بخشنے میں ممد ثابت ہو رہے ہیں۔ جو ایک اعلیٰ اور جاذب اقوام زبان کی شاعری کے لئے ضروری معیار ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے ہمارے ریڈیو سارے جہان کے لئے ہماری زبان میں نشریات کو کس قدر جاذب بنا رہے ہیں۔ ہماری تحقیق و تفتیش اُردو کی خوبیوں میں کونسا ایسا اضافہ کر رہی ہے جو اسے بین الاقوامی زبان کی سی صلاحیت بخش سکے۔ ہمارے اخبار و رسائل کہاں تک اپنے ملک کے اور ممالک غیر کے عوام کو اُردو کا شائق و عقیدت کیش بنا رہے ہیں۔ ہمارے دفاتر کے معاملات کہاں تک بمقابلہ انگریزی کے اُردو کی جامعیت وضاحت اور اختصار کے گرویدہ ہو رہے ہیں۔ ہماری روزمرہ بول چال کس حد تک انگریزی کی شیرینی۔ لطافت اور اس کا رعب اُردو میں پیدا کر رہی ہے، ہماری مجالس کس درجہ تک اُردو کو انگریزی کے مقابلے میں اپنے لئے باوقار اور باعث ناز و افتخار سمجھتی ہیں۔ ہمارے ادارے تراجم، تصانیف اور تنقیدی مقالوں سے اُردو کی وسعت کے اندر کس حد تک دنیا میں اور تمام قسم کے علوم و فنون سمٹا رہے ہیں۔ ان تمام وسائل ترویج کا جائزہ لینے کے بعد ہمارے لئے ضروری ہے کہ اُردو کے مستقبل کی بہبود و بہتری کی خاطر ہر وسیلہ و ذریعہ کے لئے ناقدین و رہبرین کے شعبے قائم کریں۔ جو

کے ساتھ ساتھ ان وسائل کے صحیح استعمال کے طریق سوچیں اور ہر ایک سلسلے میں باقاعدہ علوم و فنون کی بنیاد رکھدیں۔ تاکہ ہر سلسلہ اصول و تنظیم کا آئینہ دار نظر آئے۔ ارباب مشاعرہ کہنگی سے نفرت اور بے اصول جدت کے گرویدہ نہ ہوں بلکہ قدامت کی اندھی اور بے روح تقلید کو فرض قرار دینا چھوڑیں اور ایسی جدت کی طرف مائل ہوں جو اس زبان کی شاعری میں نچے۔ اعلٰے زبانوں کے شاعرانہ کارناموں سے استفادہ کے لئے فقط "خذ ما صفا" کے اصول کے ماتحت بظاہر جاذب نظر ہر مناسب و غیر مناسب چیز کے اخذ پر آمادہ نہ ہوں بلکہ "دع ما کدر" کو بھی ملحوظ رکھیں۔ انتقاد حیات کو شاعری کا محور قرار دیں۔ حیات کے تغیر کے ساتھ ساتھ ان کے انتقاد کی صورت بھی بدلتی جائے گی جس سے جدت خود بخود پیدا ہوگی۔ قدما نے کس قدر اصناف شعر ایجاد کئے۔ ورثا نے کیا مناسب اضافہ کیا؟ قدما نے زبان کے زمانۂ طفولیت ہی سے جو اصناف مقرر کر دئے۔ اب تک نچے تُلے چلے آتے ہیں۔ وارثین سوائے اس کے کہ انکے مقرر کردہ اصناف کو سراہیں اور استعمال میں لائیں اس میں کچھ بڑھا نہ سکے۔ باوجودیکہ انکے نزدیک قدما کا زمانہ کم ترقی یافتہ تھا اور ان کا اپنا زمانہ زیادہ ترقی یافتہ۔ کم ترقی یافتہ زمانہ میں تو ایجادات و اختراعات ایسی ہوں کہ مدتوں اُن پر کوئی انگلی نہ اُٹھا سکے۔ بلکہ وہی اسوۂ حسنہ قرار دئے جائیں۔ لیکن زیادہ ترقی یافتہ زمانہ میں کسی ایسی جدت و اختراع کی صورت نہ ہو کہ جس پر متقدمین کی روح خوش ہو اور متاخرین داد دے سکیں۔ جدت میں اہلِ زبان کے مذاق کو بہت دخل ہے۔ یہ مذاق در اصل جدت کی روح ہے ہر قسم کی جدت میں اہلِ زبان کے مذاق کا خاص خیال رکھا جائے۔ ورنہ اس خیال کے بغیر وہ جدت جدت نہ ہوگی بلکہ بدعت ہوگی اور بدعت بھی بدعت حسنہ نہیں بلکہ بدعت سیئہ جس کی ناپائداری پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

چوتھی چیز تدریس ہے، یہ سب سے بڑی اور سب سے زیادہ اہم چیز ہے' یہی وہ

محور ہے جن کے گرد زبانوں کی قسمت گھومتی ہے اور یہی وہ چشمہ ہے جس سے زبان کو آب بقا ملتا ہے۔ اس چیز کی طرف بے التفاتی کے باعث زبانیں بے قدری کا شکار ہوتی ہیں۔ یا تباہ ہو جاتی ہیں۔ اور صحیح التفات سے ترقی کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ انگریزی زبان کے سلسلے میں اگر اس رُو سے کوتاہی کی گئی ہوتی تو انگریزی اپنے محدود وطن کے حدود میں پھنس کر رہ جاتی۔ یہ تدریس ہی کی برکت ہے کہ نہ صرف اپنے وطن میں یہ مرغوب عام ہے بلکہ مشرق و مغرب میں اس کا بول بالا ہے۔

تدریس دو قسم کی ہوتی ہے، سطحی اور حقیقی، زبان کی سطحی تدریس صرف اس زبان سے متعارف کرتی ہے۔ اس کا معیار بلند نہیں کرتی، بلکہ اکثر حالات میں اسے پست کرتی اور اس کی اہمیت کو کم کر دیتی ہے۔ اس قسم کی تدریس زبان کی خاطر نہیں ہوتی بلکہ صرف سیاسی یا معاشری مصلحت کے لئے ہوتی ہے۔ زبان کی حقیقی تدریس ایک اعلٰے نصب العین کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس میں ہر عمل پُر جوش و پُر خلوص ہوتا ہے، یہ زبان کا معیار بلند کرتی ہے، اس کی اہمیت کو بڑھاتی ہے اور اسمیں جاذبیت پیدا کر کے ہر ممکن وسیلے سے اُسے دنیا کے لئے مرغوب بنا دیتی ہے۔ یہ تدریس زبان کی خاطر ہوتی ہے اسمیں کسی کمزور مصلحت کی بجائے زبان کی رفعت و ضرورت اور اس کی عزت اور وقار کا اثبات و اعلان ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کی تدریس بھی دوسری قسم کی ہے۔ مشرق و مغرب کے ہر ملک میں اس کی تدریس کا انتظام ہے۔ اور اس کی تدریس میں اس کی عظمت و وقار کی خاطر ہر ممکن تدابیر عمل میں لائی جاتی ہیں۔ اور ان تمام تدابیر کی مہربانی سے تمام ملکی زبانیں اس کی خود افزائی کی قربان گاہ پہ بھینٹ چڑھتی رہتی ہیں۔

ہم اپنی سرزمین میں ہی انگریزی کی عظمت و رفعت کے لئے تدابیر و اقدامات دیکھتے رہے ہیں، بیشک حکومت پسِ پردہ رہی ہو لیکن تدابیر عمل یہ تھیں کہ معاشرتی، تمدنی، دفتری، اخلاقی، اقتصادی اور ادبی غرض ہر قسم کے حلقے میں اس کی ضرورت و اہمیت کو ایسا

قائم کر دیا گیا، کہ رفتہ رفتہ ہماری اپنی زبان کے ناکارہ ہونے کا احساس ہمارے دل و دماغ میں پیدا ہو گیا۔ اُردو زبان کو تدریس میں جگہ ضرور دے دی گئی لیکن ایسی کہ کسی کام نہ آسکے۔ اور بے سود ہو کر اپنے لئے سب کے قلوب میں تنفر پیدا کرے، چنانچہ یہی ہوا یا تو دفاتر کے سب کام اسی زبان میں چل رہے تھے، یا یہ عقیدہ پیدا ہو گیا کہ اُردو میں یہ صلاحیت ہی نہیں، اسے دفتری زبان بننے کے لئے ابھی کئی منزلیں طے کرنا ہونگی۔ اور تو اور یہ اس قابل بھی نہ ٹھہری کہ اس کے ذریعے تعلیم دی جاسکے یا پرائی زبان کا مافیہ سمجھایا جاسکے۔ گویا اپنی زبان کا پڑھنا بے سود ٹھہرا، اور اپنی زبان میں اظہار گناہِ عظیم، جس کے مرتکب کے لئے اعلیٰ متمدن سوسائٹی کے ہاں کوئی جگہ نہ تھی، وہ پست تھا اور بہت بہت پسماندہ، انگریزی زبان کے طالب کے لئے دنیا کی ہر شاہراہ کھُلی تھی لیکن اُردو کا طالب بیکس و بے وقار، زندگی کے کسی شاہراہ پر اس کا خیر مقدم تو کیا اسے برداشت بھی نہیں کیا جاتا رہا۔ انگریزی میں کامیابی باعث افتخار و عزّت اور ناکامی باعثِ تذلیل، لیکن ہماری زبان میں کامیابی بے سود اور ناکامی بے اثر، انگریزی میں معلّم بارعب ذی اقتدار اور اُردو کا ذمہ دار بے رعب و بے اقتدار۔ انگریزی کا نصاب پُرجلال اور دلچسپ لیکن اُردو کا نصاب مضحکہ خیز اور خشک و بے تعلق۔

غرض جو کچھ اُردو زبان سے ہوا، بیان کا محتاج نہیں، لیکن یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ صرف اس لئے کہ ہم غلام تھے۔ بُرے بھلے کی تمیز کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔ یہ تمیز ہم نے اپنے آقاؤں کو سونپ رکھی تھی۔ اب جب کہ غلامی کی زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں مجبور دل آزاد ہوا ہے، طلسم سامری توڑ دیا گیا ہے، ضرورت ہے کہ ہماری آزادی کے ساتھ ساتھ ہمارے اپنے وقار کی خاطر ہماری زبان بھی پستی سے اُبھر کر غاصب سے انتقام لے اور جلد وہ مقام حاصل کرے جس کی یہ ایک اعلیٰ قومی زبان ہونے کی حیثیت سے اہل ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ذہنیتیں ابھی نہیں بدلیں۔ کیونکہ ہم اس آزادانہ فضا

میں بھی انگریزی زبان کے متعلق بعض حلقوں میں اُسی طرح غلامانہ اُنس دیکھتے ہیں اَور قومی
زبان کے اجرا کے متعلق انتہائی تقاضا کے باوجود زبانِ غاصب کی اہمیت کو باقاعدہ قائم
رکھنے کے بہانے تراشے جا رہے ہیں اور اپنی زبان کی نااہلیت کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے
کہیں اصطلاحات کا بہانہ ہے تو کہیں علمیات کا، کہیں بین الملکی تجارت کا بہانہ ہے تو کہیں
بین الاقوامی تعلقات کا۔ ان بہانوں میں شخصیاتی عناصر زیادہ کارفرما ہیں۔ کیونکہ یہ بہانے اکثر
اُنہی کی طرف سے ہیں۔ جن کی انگریزی کے دم قدم سے اہمیت تھی۔ اَور جو انگریزی طلسم
کے ماتحت بزعم خود "مہذب انگریز" بن کر "دیسی کالی زبان کو" بغیر اس کے کہ اسکی حقیقت
ومعیار سے شناسا ہوں، ہیچ، نادار، کم مرتبہ، ذلیل اَور غیر مہذب کالے لوگوں کی زبان
سمجھتے رہے ہیں ایسے مہربانوں کی طرف سے اِس دَور میں دو طرح کی کوششیں ہو رہی
ہیں۔ ایک یہ کہ کسی طرح انگریزی کی اہمیّت قائم رہے دوسرے یہ کہ اگر بالفرض زمانے کے
تقاضا کے مطابق انگریزی کی اہمیّت کو ٹھیس لگے تو جو زبان اس کی جگہ لے اُس کی زمام کار
اُنہی کے ہاتھوں میں رہے۔ تاکہ اُنکی شخصی اہمیّت کم نہ ہو، ایسے مہربانوں کے ہاتھوں میں
قومی زبان کی زمام کار آگئی تو پھر قومی زبان کا مستقبل معلوم۔ ہمیں ان بہانہ تراشوں کی پیدا
کی ہوئی رکاوٹوں کو جسارت کے ساتھ عبور کرنا ہے۔ کام کی ابتدا کر دینا ہے، ضرورت
کے مطابق سب سامان خود بخود ہوتے چلے جائیں گے۔

اُردو زبان کو اپنی معیاری بلندی کے لئے جہاں اَور کام کرنے ہیں وہاں تدریس
حقیقی کا خاص طور پر اہتمام کرنا ہے یعنی ایسی تدریس کا اہتمام جو ایک اعلیٰ نصب العین
کے ماتحت ہو۔ جو زبان کا معیار بلند کرے اس کی اہمیّت کو بڑھائے۔ اس کی عزّت و وقار
کو قائم رکھے اَور جن اسباب کی بنا پر یہ اب تک دبی رہی ہے۔ ان اسباب کو دُور کرے
عملِ تدریس میں زبان دو طرح سے وقعت حاصل کرتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ علوم
فنون کا ذریعہ تعلیم ہو۔ دوسری یہ کہ وہ خود بحیثیّت مضمونِ تدریس وسیع ہو۔ ہمارے تعلیم

نظام میں یہ دونوں قسم کی وقعتیں اب تک انگریزی زبان کو ہی حاصل رہی ہیں۔ اردو زبان محروم رہی ہے۔ اُردو کو اِن دونوں وقعتوں کے لحاظ سے اب اپنے حریف کا مقابلہ کرنا ہے۔ اسے پہلے تو تمام علوم و فنون کا ذریعہ تعلیم بننا ہے۔ ساتھ ہی مضمونِ تدریس کی حیثیت سے اسی طرح وقیع بننا ہے جس طرح اب تک انگریزی بنی رہی ہے۔

مضمونِ تدریس کی حیثیت و اہمیت چار چیزوں سے جانچی جاتی ہے۔ نظامِ درس میں مقام، نصاب، طریقِ تعلیم اور مدرس۔ اور چونکہ تدریس کی تین رسمی منزلیں ہوتی ہیں۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ، اِس لئے ہر منزل پر مندرجہ بالا چار چیزوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اور پھر چونکہ اساس کے لحاظ سے تینوں منزلوں میں سے ثانوی منزل کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے اس کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔ بحیثیت مضمونِ تدریس اُردو کی حالت بھی ہم اِسی طرح جانچیں گے۔

ابتدائی تعلیم میں اُردو کی تعلیم لازمی ہے۔ تمام تعلیم اُردو میں دی جاتی ہے۔ اگرچہ نصاب اور طریقِ تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ تاہم موجودہ حیثیت کوئی بہت ہمت رُبا بھی نہیں۔ اگر کوئی چیز یہاں خاص طور پر قابلِ توجہ ہے۔ تو وہ مدرس کی قابلیت و وقار ہے۔ نصاب اور مدرس کی طرف ذرا زیادہ التفات سے یہ منزل اچھی اور قابلِ فخر ہو سکتی ہے۔

اعلےٰ تعلیم میں اُردو کی تعلیم لازمی نہیں۔ ایف اے میں اختیاری، بی اے میں اختیاری اور ایم اے میں سرے سے غائب۔ تمام دیگر مضامین کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ نصاب میں حالی ایف اے میں اور غالب بی اے میں ہے۔ مضمون اختیاری ہونے کے باعث نصاب کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اس منزل پر دو ہی شاندار اقدام کافی ہونگے۔ ایک یہ کہ ایف اے۔ بی اے اور ایم اے میں اُردو کو مستقل مضمون کی حیثیت دی جائے۔ مستقل مضمون بن جانے پر ارباب اہتمام کے غور و فکر

سے وسیع نصاب ضرورت کے مطابق منتخب ہو سکے گا۔ دوسرے یہ کہ اعلیٰ علمی و فنی تعلیم کا ذریعہ بھی زبان قرار دی جائے۔ یہ دو چیزیں ہو جائیں تو وقعت قائم ہو جائیگی

ثانوی تعلیم میں دو منزلیں ہیں۔ مڈل اور میٹرک۔ مڈل تک تعلیم کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جس میں انگریزی ضروری مضمون نہیں۔ اس تعلیم کے ذمہ دار مدرسے ورنیکلر سکولز کہلاتے ہیں۔ دوسرے وہ جہاں انگریزی لازمی ہے اور جنہیں اینگلو ورنیکلر سکولز کہا جاتا ہے۔ دونوں میں اُردو لازمی ہے۔ میٹرک میں اُردو کی حیثیت ایک قسم کے اختیاری مضمون کی سی ہے یعنی اسے ایک مکمل مضمون کی حیثیت تو دے دی گئی ہے۔ لیکن یہ اس لحاظ سے لازمی نہیں۔ کہ اگر کوئی طالب علم اس میں فیل ہو جائے مگر باقی چار مضامین میں کامیاب ہو۔ تو پاس سمجھا جاتا ہے۔

گویا ثانوی مدارس میں اُردو کو مڈل تک تو لازمی مضمون کی سی اہمیت حاصل ہے اس کے بعد میٹریکولیشن تک اس کی غیر لازمی مضمون کی سی حیثیت ہے۔ اس کے علاوہ میٹریکولیشن میں مضامین کا ذریعہ تعلیم بھی انگریزی رہی ہے اُردو نہیں۔ میٹریکولیشن میں اُردو کی یہ حیثیت مڈل میں بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ کیونکہ ہائی کلاسوں تک تعلیم جاری رکھنے والے طلبہ انگریزی کی اہمیت اور اُردو کی آئندہ بے اہمیتی مڈل سے ہی محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اُردو میں کم دلچسپی لیتے ہیں۔ دلچسپی کا اندازہ امتحانوں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ یہ امر محتاج توضیح نہیں کہ موجودہ طرز کے امتحانات میں کامیابی مضمون میں دلچسپی کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

اس نقص کو تو میٹرک میں اُردو لازمی قرار دے کر دُور کیا جا سکتا ہے۔ میٹرک میں لازمی کر دینے سے اس کی وقعت ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے مکمل نظام میں قائم ہو جائے گی۔ لیکن ہمیں فقط اس کو لازمی کرا دینے پر ہی اکتفا نہیں کرنا بلکہ اپنی قومی حیثیت سے اس کا مرتبہ اور بھی بڑھانا ہے یعنی طلبہ میں اس کا رعب و جلال قائم

ہے کہ یہ زبان نہ صرف مضمون کی حیثیت سے اہم ہے۔ بلکہ ہمارے سارے کام ادبی ہوں یا تعلیمی، سیاسی ہوں یا معاشرتی، دنیاوی ہوں یا دینی اسی کے ذریعے انجام پائیں گے۔ اس لحاظ سے اس زبان پر قابو حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔

کسی مضمون کو وقیع بنانے میں نصاب کو بڑا دخل ہے۔ بلکہ یوں سمجھئے۔ کہ نصاب ہی وہ چیز ہے جس پر قومی زبان نہیں، قومی تمدن، نہیں قومی زندگی و عروج کا مدار ہے، انگریزی کی وقعت کو ہم سب نے محسوس کیا ہے۔ لیکن اس احساس کا نفسیاتی جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ ہیج یا سبب اس احساس کا کیا ہے ؟ تو معلوم ہوگا کہ اس کی وقعت زیادہ تر ہمیں اس نصاب کی وجہ سے محسوس ہوئی ہے۔ جو انگریزی زبان کی تعلیم کے لئے مقرر ہے۔ نصاب کے لحاظ سے کسی قوم کی زبان اور کلچر کی اہمیت کو قائم کرنے کے دو طریق ہیں۔ ایک یہ کہ اس نصاب سے اس زبان کے لئے مکمل اور مفید ماحول پیدا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ عناصر دور دور رہیں جو کسی دوسرے ماحول سے متعلق ہیں۔ چنانچہ اب ذرا مڈل سے ایم اے تک ہر کلاس کے انگریزی نصاب پر اس تحقیق سے نظر ڈالئے۔ ہمارا کلچر، ہمارا مذاق، ہمارا طرز معاشرت، ہمارا تمدن اس نصاب میں بالکل مفقود ہے۔ اس میں اگر کچھ ہے تو صرف انگریزی کلچر، انگریزی مذاق، انگریزی معاشرت اور انگریزی تمدن۔ ہماری چیزوں کا کہیں ذکر آتا بھی ہے تو حد درجہ مضحکہ خیز اور محقرانہ۔

نصاب کے سلسلے میں یہ طرز صرف انگریزی زبان کی تعلیم میں ہی پیش نظر نہیں بلکہ ہر مضمون کے نصاب کو انگریزی رنگ میں رنگا گیا۔ سائنس میں انگریزی اور انگریزوں کی اہمیت، تاریخ میں انہی کے کارناموں کی وقعت۔ ادب میں انہی کے

ناموروں کی تعریف۔ ریاضیات، اقتصادیات، فلسفہ، جغرافیہ وغیرہ میں انہی کے ناموروں، نظریوں اور انہی کے طرز کی مدح سرائی۔ حتیٰ کہ قواعد ریاضت میں بھی انہی کی تقلید۔ اور ان تمام چیزوں میں ہمارے ناموروں کا ذکر اور ان کے کارنامے یکسر غائب۔

ان نفسیاتی ریشہ دوانیوں کا ہی نتیجہ ہے کہ ہم اپنے کلچر سے ایک تو مطلق ناآشنا رہے اس کی خوبیاں ہماری آنکھوں سے اوجھل رہیں۔ دوسرے اپنے کلچر کے سلسلے میں محقرانہ بیان پڑھتے پڑھتے ہمیں اپنی چیزیں انگریزی چیزوں کے مقابلے میں حقیر اور قابلِ نفرت نظر آئیں۔ پرائے سانچے میں ایسے ڈھلے کہ اپنوں میں پرائے بن گئے۔ اسلامی تمدّن اور کلچر پہ تمسخر کرنے والے تعلیم یافتہ حضرات اسی قسم کے نصاب کی پیداوار اور اس کے طلسم ہوشربا کے صید زبون ہیں۔

طالب علم کی عمر میں وہ عرصہ بہت نازک ہوتا ہے جو ثانوی تعلیم کے حصول میں صرف ہوتا ہے۔ اس وقت کے تاثرات آخری تاثرات ہیں۔ اور اس وقت کا یقین و اعتماد آخری اور غیر متزلزل۔ اندازہ کیجئے اس عرصے میں اس قسم کا نصاب کیا قیامت ڈھا سکتا ہے؟

نصاب میں جہاں انگریزی زبان کی خاطر انگریزی تمدن و تہذیب کا ماحول قائم کیا جاتا ہے۔ وہاں خود زبان کا نصاب بھی دو پہلو سے مکمل رکھا جاتا ہے ایک زبان کی ساخت کے علم اور اس پر قابو پانے کے لئے، دوسرا اس زبان کے ادب اور کلچر کے لئے۔

ہمیں جہاں ہر ایک مضمون کے نصاب کو قومی سانچے میں ڈھالنا ہے۔ وہاں اردو زبان پر قابو پانے اور اردو ادب کی تدریس کے متعلق انگریزی کا

لائحۂ عمل مقابلے کی خاطر مدِ نظر رکھنا پڑے گا۔

زبان سیکھنے اور اس پر قابو پانے کا زمانہ عمر کا وہ قیمتی عرصہ ہے - جو ثانوی مدارس میں تعلیم حاصل کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ اس لئے ثانوی تعلیم کا نصاب اُردو خاص توجہ کے قابل ہے۔

ثانوی مدارس میں اُردو کا موجودہ نصاب نہ تو زبان پر قابو پانے میں تسلّی بخش امداد دیتا ہے۔ نہ ادب اُردو سے کوئی قابل اطمینان تعارف کراتا ہے - نہ اس میں قومی رنگ، قومی کلچر اور قومی ماحول کا کوئی لطیف سامان ہے۔

ہمیں اس نصاب پر نگاہ تنقید ڈالنا ہے اور اس کی اصلاح و ترمیم کی خاطر یا اسے از سرِ نو مرتب کرنے کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

۱۔ یہ نصاب قومی روایات پر مبنی ہو اور قومی سانچے میں ڈھلا ہو۔

۲۔ اس میں زبان پر قابو پانے کا پورا سامان ہو۔

۳۔ اس میں اُردو ادب میں دلچسپی پیدا کرنے کا مناسب اہتمام ہو۔

نصاب کے بعد طریق تعلیم کا مسئلہ ہے۔ طریق تعلیم کی اچھائی اور برائی بھی زبان کی تعلیم اور معیاری اہمیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمارا موجودہ طریق تعلیم جو اس زبان کے سلسلے میں رائج ہے۔ نہایت فرسودہ اور غیر موزوں ہے طلبہ کے لئے کسی قسم کا دلچسپی کا سامان مہیا نہیں کیا جاتا۔ تشریحات و توضیحات کی طرف کم رجحان ہے۔ عام طور پر مشکل الفاظ کے معانی دریافت کر لینے یا بتا دینے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ کبھی استاد زیادہ تر مصروف عمل رہتا ہے۔ اور طالب علم بے حس و حرکت رہتے ہیں۔ کبھی طالب علم حرکت میں ہوتے ہیں اور اُستاد بےحس۔ مناسب بحث و مباحثہ کا کوئی موقعہ پیدا نہیں کیا جاتا۔ طالب علموں کی قوتِ اظہار

کے نشو و نما کی بھی کوئی تدبیر نہیں ہوتی۔ اور چونکہ امتحانات کا طرز بھی اچھا نہیں
اس لئے طریق تعلیم کا یہ نکاپن امتحانی نتائج سے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ ہاں البتہ جب
طلبہ کی گفتگو اور تقریریں سُنی جاتی ہیں۔ تو یہ قباحت نمایاں ہو جاتی ہے۔
کہ اس طریق تعلیم سے زبان پہ صحیح قسم کا ضبط بہت کم نے حاصل کیا ہے۔ اُردو کی
قومی اہمیت کی خاطر ہمیں اس روش کو بھی بدلنا ہوگا۔ اور ایسا طریق اختیار کرنا
ہوگا۔ کہ جس سے بجائے امتحان پاس کر لینے کے صحیح گفتگو اور درست تقریر و تحریر
ہی اس زبان میں مہارت کا معیار ہو۔ وہ تمام سامان مہیّا کرنے ہوں گے ۔ جو
اس مہارت اور ضبط میں مفید ثابت ہوں۔ اور طلبہ کو اس زبان میں دلچسپی لینے
پر مجبور کر دیں۔

نظامِ درس میں مقام، نصاب اور طریق تعلیم کی درستی زبان کی وقعت
قائم رکھنے کے لئے بے شک اہم سہی لیکن یہ سب اہتمام بے سُود ہوں گے اگر
اس نصاب اور طریق تعلیم کو چلانے والا باوقار نہ ہو۔ اس زبان کی بے بسی
کی نمایاں صورت اس کی تعلیم کے ذمہ دار کی بے بسی ہے۔ ذرا انگریزی زبان
کے ذمہ دار کی مرتبت و منزلت دیکھئے اور پھر ایک نظر قومی زبان کے ذمہ دار
پر ڈالئے اور محسوس کیجئے۔ تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

قومی زبان کے صحیح معیار کی خاطر ہمیں اس کے علمبردار کو بے نیاز اور
باوقار کرنا ہوگا۔ ورنہ باقی تمام اصلاحی تدابیر بے مفاد رہ جائیں گی۔

غرض زبان اُردو کی قومی حیثیت کو استوار کرنا اور اسے بین اقوامی عروج تک
پہنچانا ہمارا نصب العین ہونا چاہیئے اور اسکی تکمیل کی خاطر ہمیں ایک گُر یاد کر لینا چاہیئے وہ
انگریزی کو اُردو کا حریف قرار دیا جائے۔ اور اس حریف کو جتنی مراعات اب تک مل
رہی ہیں۔ وہ اب اُردو کے حق میں منتقل کر دینی چاہئیں۔

چین میں تعلیم و تدریس کی روئداد

ترجمہ۔ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی

ا۔ تمہید

لہ۔ چین کی تعلیمی روایات :۔

زمانہ قدیم میں کنفوشش (Confuci us) مینشس (Mencius) اور
ـرے فلاسفہ چین نے جو طریق ہائے تعلیم اہل چین کے پیش کئے ان کا آج
ـ کے جدید جمہوری طریقہ تعلیم کے ساتھ موازنہ کیا جائے ۔ تو ہمیں
ـم اور جدید اصولوں میں بڑی حد تک مشابہت دکھائی دے گی ۔ ان
ـا کی تصنیفوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے پیش نظر بھی یہی مقصد تھا۔
ـہوری اصول کے موافق عوام کو تعلیم دلائی جائے ۔ انالیکٹ
Anal) اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے ۔کہ کنفوشش کے پیش نظر
ـم و تدریس کا مقصد یہ تھا کہ تعلیم خواص ہی کے لئے نہیں بلکہ بلا امتیاز
ـب کے لئے ہونی چاہیئے ۔ اور وہ اسی مقصد کی اشاعت بھی کرتا رہا۔
ـ(Moti) فلاسفر نے عالمگیر اخوت کا نظریہ پیش کیا تھا ۔ وہی نظریہ آج
ـ قائم ہے ۔ اور اہل چین کی امن پسندانہ روائتوں کی بنیاد بھی اسی نظریہ
ـہے ۔ ان بزرگوں نے اہل چین میں جو روح پھونکی تھی ۔ یہ اسی کا نتیجہ
ـ کہ چینی باشندے تعلیم و تدریس کا بے حد احترام کرتے ہیں ۔ اور

حق و صداقت کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ تاریخی حالات کچھ سازگار ہوتے تو ہمارے فلسفہ زندگی سے جو سراسر امن پسندانہ ہے تعلیمی نشو ونما میں بڑے بڑے کام لئے جا سکتے تھے۔ اور ہمارا ملک یوں بھی عالمگیر اخوت کے نظریئے کے مطابق نوع انسان کے فلاح و بہبود میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے سکتا تھا۔

جمہوریت کے اثرات تو موجود تھے لیکن اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے ملک کو جمہوریہ چین کا درجہ ڈاکٹر سُون یَت سین کی رہنمائی ہی سے حاصل ہؤا۔ ڈاکٹر سُون وہ بزرگ ہستی ہے جس نے اپنا سیاسی مسلک دنیائے چین کے پیش کر کے گویا یہاں کے باشندوں کے قلب و دماغ روشن کئے اسی کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں چینی مدارس کی تعلیم و تدریس کے مقاصد تیار کئے گئے۔ ان میں بڑے مقاصد یہ ہیں کہ ناخواندگی کی بیخ کنی کی جائے اور سائنس کا جدید علم طول و عرض ملک میں پھیلایا جائے۔ معیار حیات کو بلند تر کیا جائے۔ صنعت و حرفت کی مہارت عام کی جائے اور عرصہ دراز سے چینی قوم کے سامنے جو بلند ترین تعلیمی معیار رہے اسے حاصل کرنے کی سرگرم کوشش کی جائے۔

آج کل ساری دنیا بمنزلہ ایک خاندان کے ہوگئی ہے۔ اسی ربط تعلق کی وجہ سے ہم نے اپنا تعلیمی لائحہ عمل "عوامی تعلیم" کے نام سے تیار کیا ہے۔ یونیسکو کی طرف سے جو "بنیادی تعلیم" پیش ہوئی ہے۔ اس کا خاکہ بھی ہمارے تعلیمی لائحہ عمل میں صاف صاف نظر آتا ہے۔

چین کی قدیمی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس عوامی تعلیم کے وضع کردہ اصولوں پر پورا پورا عمل ہوتا رہا۔ یہ اصول حسب ذیل ہیں:

ا۔ تعلیم سب کو یکساں دی جائے اور اس میں جنس، مذہب او

پیشے کا کوئی امتیاز نہ رکھا جائے۔

(۲) طلبہ کی باقاعدہ تعلیم اور ضمنی تعلیم کو برابر کی اہمیت دی جائے۔

(۳) بنیادی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔ اور ہر خاص و عام کو بلا معاوضہ دی جائے۔

(۴) حکومت کو اس بات کا خود اہتمام کرنا چاہیئے۔ کہ مقررہ میعاد کے اندر اندر طلبا کی بنیادی تعلیم پوری کی جا سکے۔

(۵) جوں جوں ہمارے تمدّن کا معیار بڑھے اور قومی مالیات کی حالت بہتر ہو بنیادی تعلیم کے کورس کی مدت اور بڑھا دی جائے۔ (آج کل یہ لازمی تعلیم مدارس میں چار سال کے عرصے کے لئے دی جاتی ہے۔ لیکن آگے چل کر یہ مدّت چھ سے نو سال تک بڑھا دی جائے گی۔)

(۶) چین کی وہ اقلیتیں جو بیرونی ممالک سے آکر چین کی سرحدوں پر آباد ہو گئی ہیں۔ اہل چین کے ساتھ مل کر تعلیم حاصل کریں تاکہ تمام قوموں میں ایک متحدہ چینی تمدّن رائج کیا جا سکے۔

(ب) مسئلے کی نوعیّت :-

جب سے قومی حکومت قائم ہوئی ہے اسی وقت سے عوام میں تعلیم عام کرنے کی بھی جدّوجہد ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ جاپانی حملے کے انتہائی نازک دور میں بھی عوامی تعلیم کا لائحۂ عمل باقاعدہ جاری رہا اور اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ پچھلے سال حکومت کے نئے دستور اساسی میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ بنیادی تعلیم چھ سے بارہ سال کی عمر کے تمام بچّوں کو دی جائے گی۔ اور ناخواندہ بالغوں کو بھی کمی پورا کرنے کی تعلیم دی جائے گی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ چین کے ہر شہری کو تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہو گیا۔ بلکہ

اس کا اخلاقی اور قومی فرض بھی ہو گیا کہ تعلیم حاصل کرے لیکن اس بات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ پنتالیس کروڑ انسانوں کو تعلیم دینا کوئی معمولی کام نہیں اور یہ صرف بتدریج ہی ہو سکتا ہے۔ ابھی ملک کو داخلی اور خارجی امن کی ضرورت ہے۔ صورت حال کے بہتر ہوتے ہی ناخواندگی اور جہالت کی بیخ کنی جلد ہو سکے گی۔ اور پھر امنِ عالم کے لئے بھی کوئی نیا اور پائیدار عملی قدم اٹھایا جا سکے گا۔

حال ہی کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ پنتالیس کروڑ کی آبادی میں سے تقریباً چھ کروڑ ستّر لاکھ بچّے تعلیمی عمر میں ہیں یعنی جن کی عمر چھ سے بارہ سال کی ہے۔ ان میں صرف تین کروڑ دس لاکھ بچّے ایسے ہیں جو باقاعدہ مدارس میں تعلیم پاتے ہیں۔ گویا تین کروڑ ساٹھ لاکھ بچّوں کی تعلیم کا انتظام کرنا ابھی باقی ہے۔ بارہ سے پنتالیس برس کے بالغ اَن پڑھ مرد عورتوں کی تعداد پندرہ کروڑ ہے۔ یا یُوں سمجھئے کہ کل آبادی کا تیس فی صد حصّہ ناخواندہ ہے۔ جسے "بنیادی تعلیم" کے اصولوں کے موافق تعلیم دینا ازبسکہ ضروری ہے۔

بچّوں کو مدارس میں بھجوانے اور تعلیم بالغان کا انتظام کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہمارا فرض ہے کہ ہم ایسے اساتذہ تیار کریں کہ وہ خود درسی کتابیں لکھیں، بہترین طریقہ ہائے تعلیم رائج کریں۔ اور تعلیم و تدریس میں جس قدر سازوسامان کی ضرورت ہو، مہیا کریں۔ ہمارے ملک میں اَن پڑھ لوگوں کی اتنی تعداد کثیر کے پیشِ نظر ہمارا یہ اہم ترین فرض ہے کہ ہم ناخواندگی کو دُور کرنے کے لئے جدّوجہد کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بچّوں کی تعلیم میں بھی کسی قسم کا فرق نہ آنے دیں۔ اگر تعلیمی عمر والے بچّے مدارس میں داخل ہو جائیں

تو ناخواندہ لوگوں کی تعداد بھی آپ ہی آپ کم ہوتی رہے گی اور آخر اس طرح وہ وقت بھی آئے گا کہ ملک میں کوئی ناخواندہ شخص نہ رہے گا۔

۲۔ چین کی بنیادی تعلیم کی تنظیم :-

بنیادی تعلیم کو جلد از جلد ملک میں رائج کرنے کے لئے کچھ عرصہ ہوا۔ مقامی حکومت نے یہ ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ کہ دس کنبوں پر مشتمل ایک گروہ بنایا جاتا ہے جسے "چیا" (Chia) کہتے ہیں۔ اسی طرح دس چیا مل کر ایک "پاؤ" (Pao) بنتا ہے۔ پھر دس پاؤ کے ملنے سے "سیانگ" یا "چنگ" (Hsiang or chang) بنتا ہے۔ پھر ایسے پندرہ سے تیس چنگ مل کر ایک "چو" (Chu) بنتا ہے۔ ان میں سے ہر چھوٹا گروہ اپنے سے بڑے گروہ کو جوابدہ ہوتا ہے۔ اور اسی طرح سب سے بڑا گروہ حکومت چین کو جواب دہ ہوتا ہے۔ مرکزی حکومت نے فیصلہ کیا ہے۔ کہ مقامی سیاسی اداروں کا جو یہ سلسلہ قائم کیا گیا ہے اس سے بھی عام تعلیم کی نشر و اشاعت کا کام لیا جائے۔ چنانچہ ہر "چنگ" کی ذمے داری یہ ہے کہ کم از کم ایک چھ جماعت کا پرائمری اسکول قائم کرے۔ اور ہر "پاؤ" کم از کم ایک چوتھی جماعت کا پرائمری اسکول چلائے۔ جس کا نام "شہری اسکول" ہو۔ ہر طرز کے اسکول میں بچوں اور بالغوں کے لئے جماعتیں کھولی جائیں۔ بچے چھ سے بارہ سال کے اور بالغ بارہ سے پنتالیس سال کے داخل کئے جائیں۔ ان اسکولوں میں بچوں کی جماعتوں میں باقاعدہ درسی کتابیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اور بالغ مردوں اور عورتوں کے لئے زیادہ تر ان کی اپنی بول چال سے کام لیا جاتا ہے۔ انہیں صوتی حروف تہجی (Phonetic Alphabet) اور ایک ہزار بنیادی الفاظ سکھائے جاتے ہیں۔ ساتھ ساتھ

وہ اخبار بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ جن کی زبان عام بول چال کی سی ہو۔ ان کے
احساسات کی نشو و نما کے لئے بھی اسباب مہیا کئے جاتے ہیں۔

حکومت نے تعلیم کو توسیع دینے اور عوام میں حکومت خود اختیاری
کی صلاحیت پیدا کرنے کی یہ دوگونہ اسکیم تیار کر کے گویا ایک دور رس لائحہ عمل
تیار کیا ہے۔ اس سے شہری، اقتصادی، معاشرتی اور حفظانِ صحت کی تحریکوں
کے لئے اساتذہ اور اسکولوں سے کام لیا جاسکتا ہے۔ یقیناً عوام میں تعلیم
پھیلانے کے لئے حکومت نے نہایت ہی مؤثر قدم اٹھایا ہے۔

۱۹۳۷ء میں جاپانیوں کی حملہ آوری سے تعلیمی لائحہ عمل میں رکاوٹیں
تو پیدا ہوئی تھیں لیکن اس سے بعض نئے مسائل بھی پیدا ہوگئے تھے مثلاً سارے
ملک میں عام بیداری پیدا کی جائے تاکہ قوم محاذ جنگ کے لئے صف آرا
سکے۔ وطن کی خاطر جنگ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان
کنبوں کا اعتماد حاصل کیا جائے۔ مزدور پیشہ لوگوں کو ابھارا جائے تاکہ وہ پیدا
میں اضافہ کریں۔ جو ادارے مختلف قسم کے تعلیمی مشاغل میں کوشاں ہیں مثا
شبینہ مدارس، کتب خانے، علمی عجائب خانے، ڈرامہ کلب، گیت منڈلیا
متحرک تعلیمی ادارے یہ سب حکومت ہی کے قائم کردہ ہیں۔ دورانِ جنگ
حوصلہ آزما حالات میں ان متحرک تعلیمی اداروں نے تصاویر اور ریڈیو کے ذر
بصری اور سماعی پروگرام پیش کر کے قابل قدر فرائض سر انجام دئے۔ ڈرامہ کا
اور گیت منڈلیوں نے قومی جنگ کے پیغامات بڑی کامیابی سے عوام تک پہنچ
ان سب اداروں نے اپنا اپنا کام اس خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا کہ حکا
نے ان کی ضرورت اور اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ان کے مشاغل کو با
تعلیمی لائحہ عمل میں شامل کر لیا۔

اساتذہ کو تربیت دلانے میں یوں تو حکومت کی ہمیشہ سے توجہ رہی ہے لیکن بنیادی تعلیم کا پروگرام کچھ اتنا ہمہ گیر ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے کم و بیش پچاس لاکھ اساتذہ ہونا چاہئیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ہمارے ملک کا یہ مسئلہ کتنا وسیع اور اہم ہے۔ موجودہ صورت میں اساتذہ کی تعداد آٹھ لاکھ ہے جو اِدھر اُدھر سے اکٹھے کر لئے گئے ہیں لیکن ان میں صرف تیس فی صدی اساتذہ ایسے ہیں جنہوں نے باقاعدہ نارمل اسکولوں سے تعلیم حاصل کی ہوئی ہے۔ چونکہ اس بنیادی تعلیم کی خاطر شہریوں کی تعلیم کے لئے نئے قواعد و ضوابط وضع کئے گئے تھے۔ اس لئے نئی ضروریات کے پیش نظر نارمل اسکولوں کی توسیع کے لئے بھی متوازی پروگرام تیار کر لیا گیا چونکہ ملک کے معاشرتی حالات یکساں نہیں اسلئے تحتی اور فوقی دو طرز کے نارمل اسکول قائم کئے گئے۔ فوقی نارمل اسکولوں میں کورس تین سالہ ہوتا ہے۔ اس میں تحتی نارمل اسکول کے فارغ التحصیل داخل کئے جاتے ہیں۔ ان دو کے علاوہ اور بھی نارمل اسکول ہیں۔ جہاں اساتذہ کو ان کے خاص خاص رجحانات کے مطابق، مثلاً کنڈرگارٹن، جسمانی تربیت، فنی صنعتی اور موسیقی کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان نارمل اسکولوں کا انتظام بھی حکومت ہی کے ہاتھ ہوتا ہے کسی ذاتی اور نجی ادارہ کو یہ کام کرنے کا اختیار نہیں۔ ہر نارمل اسکول کو حکومت کی طرف سے مالی امداد ملتی ہے۔ اس لئے نارمل اسکولوں کے فارغ التحصیل اساتذہ کو کورس پورا کرنے کے بعد کم از کم تین سال کے لئے ضرور سکول کی ملازمت کرنا پڑتی ہے۔ اساتذہ کی تربیت کے ساتھ یہ ضروری بات بھی پیش نظر رکھی جاتی ہے کہ اساتذہ کو معاشرے میں باوقار درجہ حاصل ہو۔ اس غرض کے لئے حکومت کا لائحہ عمل حسب ذیل ہے :۔

(۱) ۲۷ مارچ سے ۴ اپریل کے درمیان کسی وقت تربیت اساتذہ کا

ایک ہفتہ بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا ہے تاکہ عوام میں معلّمی کی تربیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو سکے۔

(۲) ۲۷ اگست کنفوشش کی پیدائش کا دن ہے۔ اس دن کو "یوم معلّمین" کہا جاتا ہے۔ اور بڑی دھوم سے کنفوشش کی سالگرہ منائی جاتی ہے۔ تاکہ معلّمین کے لئے عوام کے دلوں میں عزّت اور احترام کا جذبہ پیدا ہو۔

(۳) اساتذہ سال بھر میں تعلیم و تربیت کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں کرتے ہیں ان کا ذکر بڑی آب و تاب کے ساتھ عوامی جلسوں میں سرکاری طور سے کیا جاتا ہے۔ اور وزیر تعلیم اور دوسرے بڑے بڑے افسران اساتذہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ اور اساتذہ کی ذات پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔

۳۔ تجربات:۔

بنیادی تعلیم کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں حکومت اور عوام شخصی اور اجتماعی طور سے کوئی بیس برس سے کوشاں ہیں۔ اس سلسلے میں متعدد نئے تجربات کئے جا رہے ہیں۔ جن کے ذریعے بنیادی تعلیم میں حکومت کو نئے خیالات اور نئے طریقے پیش کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ اور اس کے علاوہ عوام میں تعلیم کو جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس میں ان کا بڑا حصّہ ہے۔ اس مختصر سی روئداد میں اتنی گنجائش نہیں کہ ان تمام تجربات کا ذکر کیا جائے لیکن دو ایک کا ذکر کر دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ان تجربات کی نوعیت کا پتہ چل سکے۔ اور یہ بھی معلوم ہو سکے کہ ان سے کیا کیا نتیجے مرتب ہوئے۔

سب سے مقدم اور اہم تجربہ "عوامی تعلیم کی تحریک" ہے جو ڈاکٹر جیمز ینن اور ان کے رفقائے کار کا رہینِ منت ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں ہزاروں لاکھوں مزدور فرانس گئے تھے۔ ڈاکٹر ین بھی اس زمانے میں بین الاقوامی ادارہ وائی۔ایم

سی۔اے کے ایک چینی معتمد مقرر ہوکر فرانس گئے تھے۔وہاں انہوں نے مزدوروں کی حالت کو دیکھ کر محسوس کیا کہ ناخواندگی ان کے راستے میں بڑی بڑی رکاوٹیں حائل کر رہی ہے۔لیکن ان مزدوروں کو تعلیم دینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ بہر حال ڈاکٹر ین نے یہ مشکل کام اپنے ذمے لیا اور مزدوروں کو فارغ اوقات میں تعلیم دینا شروع کی۔اور تھوڑے ہی عرصے میں ان مزدوروں کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے اپنے گھروں کو خود خط لکھ سکیں اور اخبار بینی بھی کر سکیں۔اس کامیابی نے ڈاکٹر ین کی کافی ہمت بندھائی۔چنانچہ جب آپ وطن واپس آئے تو "تعلیم عوام کی قومی انجمن" کی بنیاد رکھی۔جس نے آگے چل کر نہایت ہی اہم اور مفید کام سرانجام دیئے اس قومی انجمن نے ابتدا تو شہروں سے کی لیکن یہ تحریک بہت جلد دیہات تک بھی پھیل گئی۔اور بالآخر اس شہری تحریک نے دیہاتی تعلیم کی تحریک کی صورت اختیار کر لی۔تحریک کا لائحۂ عمل یہ تھا کہ لوگوں کو زباندانی، شہریت، حفظانِ صحت اور حصول معاش کی تربیت دلائی جائے۔اور یہ لائحہ عمل ماہرین تعلیم نے دیہات کی پس ماندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد تیار کیا تھا۔ہوپی، شننگ تونگ اور کیانگسو کے ضلاع میں علی الترتیب ٹنگ سیان، ساؤ ہنگ اور ووشی کے شہروں میں اس قسم کے متعدد تجربات کئے گئے۔اور بالخصوص وانگ سی ضلع کے تو طول و عرض میں ایسے تجربات کئے گئے۔

حکومت چین نے شہریوں کی تعلیم کے لئے متذکرہ قوانین وضوابط تیار کرنے کے بعد ملک بھر میں جابجا تجربات کے مرکز بھی قائم کئے۔جو زیادہ تر اساتذہ اور نارمل اسکولوں کے اہتمام میں ہوتے ہیں۔مقامی تعلیمی کام کی رہنمائی اور نگرانی بھی ان ہی کے ذمے ہوتی ہے۔اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ایسے مراکز میں تعلیم دینے کے لئے جو اساتذہ مقرر کئے جائیں وہ تجربہ کار ہوں۔نارمل اسکولوں کے طلبہ کے لئے

موقعے پیدا کئے جاتے ہیں کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عملی مشغلوں میں بھی حصّہ لے سکیں۔ جو خصوص تجربے کے خیال سے نصاب میں شامل کر دئے گئے ہیں۔
مثلاً (۱) تعلیم کے ساتھ تنظیم کے طریقے سکھانا۔
(۲) عوام کے لئے ذخیرہ الفاظ تیار کرنا۔
(۳) عوام کے مطالعہ کے لئے موزوں مواد بہم پہنچانا۔
(۴) جسمانی تربیت اور حفظانِ صحت کی تعلیم۔
(۵) پیشہ ورانہ تعلیم جس سے کچھ یافت بھی ہو سکے۔
۱۹۴۵ء میں جاپان کی جارحانہ کارروائیاں ختم ہوئیں تو تعلیم کے علم برداروں نے ضرورت محسوس کی کہ پرانے مراکز کی ازسرِ نو تنظیم کی جائے اسلئ کچھ نئے مرکز بھی کھولے جائیں۔ بہر حال اس سلسلے میں جو تجربات ہوئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مرکز بہت مفید کام سر انجام دے رہے ہیں۔

۴۔ سرحدی قبائل کی تعلیمی ترقی:۔

ہمارا ملک نسلی اعتبار سے بیشتر قوموں اور بہت سے تمدنوں کی کھچڑ ی سی ہے جنہیں باہمی پیوندوں اور رشتوں نے ملا کر ایک کر دیا ہے۔ اور یہ اور رشتے دو ہزار سال سے قائم ہیں۔ تمدنوں اور زبانوں کے امتزاج کا یہ سلس ابھی ختم نہیں ہوا۔ کچھ ایسے قبائل ہیں جو باہر سے آکر چین کی سرحدوں پہ پھیلے ہو ہیں۔ یہ قبائل جغرافیائی علیحدگی سیاسی اغراض اور مذہبی عقائد کی رُو سے چا ہیں کہ اپنی مختلف العنا صر زبانوں اور اپنے مخصوص رسم ورواج کی حفا کریں۔ ان میں بڑی بڑی چینی تبتی (Sino Tibetans) آلتیق' (Altaic) ہند یورپ آستروایشیائی' (Austro Asiatic) اور آسترونیشی

(Austronesions) اقوام ہیں اِن اقلیتوں کو تعلیم دینا بھی ضروری ہے۔

(ب) سرحدّی عوام کے مدارس کی قسمیں:-

وزارت تعلیم نے ایک خاص محکمہ قائم کیا ہے جو "محکمہ سرحدی تعلیم" کے نام سے موسوم ہے جس کی غرض و غایت یہ ہے کہ منگولوں، تبتیوں اور سرحد کی دوسری اقلیتوں کی تعلیم و تدریس کا انتظام کرے۔ شہری تعلیم کو ترقی دینے کے لئے حکومت نے جو متذکرہ لائحہ عمل تیار کیا ہے اس میں سرحدی تعلیم کو بڑی اہمیّت دی ہے ذیل کے عملی اصولوں پر خصوصیّت سے زور دیا گیا ہے۔

۱- پرائمری اسکول قائم کرنے کی طرف زیادہ توجہ دی جائے۔ ایسے اسکولوں کو مالی امداد دینے کی ذمے داری مقامی حکام پر ہوگی۔ وزارت تعلیم نمونے کے چند اسکول جاری کرے گی۔

۲- سرحدی اقوام کی تعلیم و تدریس مخصوص معاشرتی حالات اور مذہبی اور تمدّنی روایات کے موافق ہونی چاہیئے اس سلسلے میں تین خاص طرز کے اسکول کھولے گئے ہیں۔ "مدرسہ کوہی"۔ "مدرسہ صحرائی" اور "مدرسہ خانقاہی"۔

۳- ہر قبیلہ اور ہر قوم کے بچّوں کو عام اجازت ہونی چاہیئے کہ ان مدرسوں میں داخل ہو سکیں۔ ایک عمر کے بچّے خواہ چینی ہوں یا سرحدّی ان سب کو ایک ہی جماعت میں رکھنا چاہیئے۔ اور کسی قسم کا نسلی یا قومی امتیاز نہ ہونا چاہیئے۔

۴- جب ضرورت ہو سرحدی مدارس عام شہری اسکولوں کے نصاب کی پیروی کریں تو اِس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے۔ کہ سرحدی لوگوں کی بولی الگ ہے اور ان کا ادب و فلسفہ بھی جداگانہ ہے ان کے تہذیب و تمدّن میں تبدیلی کی ضرورت تو ہے لیکن ایسی نہیں کہ انہیں بالکل ترک کر دیا

جائے بلکہ ان سے پورا پورا کام لیا جائے اور ان کو ملک کی جدید ضرورتوں کے مطابق ڈھالا جائے۔

ج۔ اساتذہ کی تربیت:۔

ان سرحدی اسکولوں کے اساتذہ کی تربیت کے لئے محکمہ تعلیم نے تیرہ نار اسکول کھولے ہیں جن کے داخلے کے لئے خاص امتحان لیا جاتا ہے۔ لیکن چینی قبائلی کا کوئی امتیاز نہیں۔ ان نارمل اسکولوں میں شہری نارمل اسکولوں کی طرح ع ضروریات کا خیال تو رکھا ہی جاتا ہے لیکن ان کے علاوہ ان کے خاص خاص ضروری پہلو بھی ہیں جن کا یہاں ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

ان نارمل اسکولوں کے عام نصاب کے علاوہ سرحدی قبائل کی مقامی زبانوں تعلیم و تدریس، حفظان صحت، ابتدائی علم الادویہ، زراعت اور صنعت و حرفت کی ابت تعلیم پر بھی خاص توجہ دی جاتی ہے۔

۲۔ نارمل اسکولوں میں داخل ہونے والے قبائلی طلبہ کچھ اس لئے کہ ان کی تع ناکافی ہوتی ہے۔ اور کچھ اس لئے کہ نئی زبان کے سیکھنے میں انہیں مشکلات ہوتی ہی ٹھیک طرح سے ان نارمل اسکولوں میں چل نہیں سکتے تھے۔ اس لئے پرائمری مدار کے ساتھ پانچویں اور چھٹی جماعتوں میں ان کی کمیوں کو دور کرنے کا بھی انتظام کیا ہے۔ تاکہ نارمل اسکول میں داخل ہونے والے سرحدی طلبہ کی مشکلات دور ہو جا ان اسکولوں کے طلبا کو حکومت کی طرف سے وظائف ملتے ہیں۔

نارمل اسکولوں کے طلبا کو عملی تربیت کے لئے سرحدی پرائمری مدارس میں جاتا ہے۔ اور خاص خاص کام ان کے سپرد کر دئے جاتے ہیں۔ انہیں سفر خرچ وغیرہ سرکار کی طرف سے ملتا ہے۔ یہ عملی کام ختم کر چکنے کے بعد انہیں معلمی کا سرٹیفکیٹ ملتا ہے۔

سرحدی عوام کی تعلیم کے سلسلے میں دو طرز کے رسم الخط رائج ہیں "خط تصویری" (Pictographi اور "خط صوتی" (Phonetic) لولو اور می آؤ قبائل کا رسم الخط تصویری" ہے۔ اور منچو، منگول اور اُدی گر تبتی قبائل کا رسم الخط "خط صوتی" کہلاتا ہے۔ السنہ کی تعلیم کیلئے ذیل کے لازمی طریقے اختیار کئے جاتے ہیں۔

جن طلبہ کی زبان اور ادب تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ انہیں ان کی مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں چینی زبان سیکھنے میں بھی آسانیاں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ جو طلبہ پس ماندہ قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جن کے زبان وادب کو کوئی تاریخی حیثیت حاصل نہیں۔ انہیں ان کی مادری زبان میں نہیں بلکہ چینی زبان کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔

متذکرہ لائحہ عمل کے موافق طلبا کے لئے جدید درسی کتابیں تالیف کرائی گئی ہیں۔ یہ کتابیں عموماً دو زبانوں میں ہوتی ہیں۔ ہر کتاب میں ایک جدول ہوتی ہے۔ جس میں سرحدی زبان کے حروف تہجی کے ساتھ ساتھ ان کے ہم معنی چینی زبان کی علامتیں (Phonetic Symb بھی درج ہوتی ہیں۔ اس سے جیسا کہ ظاہر ہے دو فائدے ہوتے ہیں۔ سرحد کے طالب علم چینی زبان سیکھ جاتے ہیں۔ اور چین کے عام شہری طلبا سرحدی زبانوں میں دسترس حاصل کر لیتے ہیں۔ تعلیم و تدریس کی امداد کے لئے فلمی تصاویر، متحرک تصویریں، بولنے والی مشینیں وسیع پیمانے پر استعمال کی جاتی ہیں۔ سرحدی علاقوں کے طلبہ کو ان سے جو فائدہ ہوتا ہے وہ درسی کتابوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔

۸۔ زبان دانی کی تعلیم میں اصلاحات :۔

زبان دانی کی تعلیم کے باب میں ذیل کی تین باتوں کا ذکر کیا جائے گا۔

۱۔صوتی علامتوں کی تحریک۔
۲۔نصاب میں مقامی بولیوں کی شمولیت۔
۳۔بنیادی الفاظ کی تدوین۔

(۱)صوتی علامات کی تحریک :۔

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مفہوم نویسی (Ideographic Script) کا جو طریقہ چینی رسم الخط میں رائج ہے۔ اس کی وجہ سے تعلیم کو عام کرنے میں بڑی بڑی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ انہی رکاوٹوں کو محسوس کرتے ہوئے ۱۸۹۲ء میں ایک چینی ماہر لسانیات لُوکن چانگ نے ارادہ کیا کہ مفہوم نویسی کے رسم الخط کے بجائے صوتی علامتیں تیار کرے یعنی لفظوں کی آواز کے مطابق علامتیں بنائے۔اس نے مروجہ تصویری حروف کی اصلاح کے لئے نیا چینی رسم الخط تیار کرنا چاہا۔جس سے پڑھنے کی رفتار تیز ہو سکے۔ اگرچہ اس ایجاد میں کئی خامیاں بھی تھیں۔ لیکن بہرحال اس نے اس تحریک کا آغاز کیا۔مسٹر لو کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ایک اور عالم مسٹر وانگ چاؤ نے مندرین قبیلہ کی بولی کا حروف تہجی ایجاد کیا۔جس میں بعد کو مسٹر لاؤ نے سوان نے تھوڑی سی ترمیم کی اور اس کا نام "سادہ رسم الخط" رکھا۔

۱۹۱۲ء میں یعنی چینی جمہوریہ کے قیام کے ایک سال بعد تحت اللفظ پڑھنے میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔اس کمیشن نے چھ ہزار پانچ سو الفاظ کا معیاری تلفظ قائم کر دیا۔ اس رسم الخط میں دس علامتیں، ۲۴ حروف اور ۱۲ حروف علت ہیں۔ ۱۹۱۹ء میں الفاظ کا قومی تلفظ مقرر کرنے کے لئے ایک لغت تیار کیا گیا۔ اس لغت میں اہل پیکن کے لب ولہجہ کو ساری قوم کے لئے معیاری درجہ دیا گیا ہے۔ بعد کے چند سالوں کے اندر اس سلسلے میں کچھ تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر وی ہوئی نے جو چین کے ایک محترم استاد ہیں۔اس کا

میں بہت نمایاں حصّہ لیا ہے۔ انہوں نے اس صوتی حروف تہجی میں بھی ترمیم کی۔ اور اس کو صوتی علاماتی رسم الخط" قرار دیا۔ ساتھ ساتھ موجودہ انگریزی علامتوں (Roman Symbols) کو بھی رواج دیا۔ حکومت چین نے دونو رسوم الخط کی منظوری دے دی ہے۔ ان دونوں کی وجہ سے اور بالخصوص مقدم الذکر رسم الخط کے ذریعے عام تعلیم میں کافی ترقی ہو گئی ہے۔

(ب) چینی جمہوریہ کے قیام کے ساتھ تعلیم عوام کی تحریک شروع ہوئی اور بڑی سرگرمی کے ساتھ جاری رہی۔ ۱۹۱۰ء میں قومی زبان کی تحقیقاتی انجمن" کا قیام عمل میں آیا۔ اس انجمن کی غرض و غایت یہ تھی کہ سارے ملک کے لئے ایک مشترکہ بولی کا انتخاب کیا جائے۔ تاکہ اس کے ذریعے تعلیم و تدریس میں کوئی معیار قائم کیا جا سکے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ پہلے جو کچھ لکھا جاتا تھا۔ وہ ادبی رنگ میں لکھا جاتا تھا اور ادبی انداز عام بول چال سے مختلف ہوتا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں ڈاکٹر ہوشی نے قومی زبان کی اس تحریک کی رہنمائی کی۔ گویا کہ چین کے ادبی انقلاب کی بنیاد رکھی۔ یہ تحریک آناً فاناً ملک کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ اور اسے قبول عام حاصل ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں ایک کمیٹی کی صورت میں قومی زبان میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے ایک نیا ادارہ قائم کیا۔ اس کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ ایسی کتابیں تصنیف کرائی جائیں جو ادبی زبان کی حامل نہ ہوں۔ بلکہ عام بولی میں ہوں۔ ہر پرائمری مدرسے میں یہ کتابیں لگائی جائیں۔ پرائمری کی اوپر کی جماعتوں میں ادبی تحریروں کا انتخاب ضرور دیا جائے لیکن ان کا بیشتر حصّہ عام بولی ہی میں ہو۔ یہ تجویز بالآخر حکومت نے مان لی۔ پرائمری اسکول کے نصاب میں اس فوری تبدیلی نے بڑے دُور رس نتائج پیدا کئے۔ اوّل یہ کہ شہریت تاریخ اور جغرافیہ کی کتابیں سب عام بولی ہی میں لکھی گئیں۔ دوسرے یہ کہ نارمل اسکولوں کے نصاب میں بھی

نئی ضروریات کے موافق تبدیلیاں کی گئیں۔ تیسرے یہ کہ تحریر کے اس سہل طریقے کے ذریعے اظہارِ خیالات میں بڑی آسانی پیدا ہو گئی۔

ج۔ مروّجہ بنیادی الفاظ کی تدوین۔

صوتی علامات کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے مبتدیوں کو لفظ کے صحیح تلفظ کا پتہ چلتا ہے۔ اور چینی الفاظ کا مطلب فوراً سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یہ مقصد ہرگز نہیں کہ چینی الفاظ کو بالکل ترک ہی کر دیا جائے۔ بلکہ خیال تو یہ ہے کہ تعلیم و تدریس چینی الفاظ ہی کے ذریعے ہونی چاہیئے۔ چینی زبان کے الفاظ پچاس ہزار ہیں لیکن ان میں سے وہ الفاظ جو عام استعمال میں آتے ہیں بہت کم ہیں۔ علما اکثر یہ کوشش کرتے ہیں۔ کہ بنیادی تعلیم کے لئے لفظوں کی اس بہتات میں سے کم از کم الفاظ منتخب کر لئے جائیں۔

مسٹر ایچ۔ سی چین سب سے پہلا عالم ہے جس نے انتخاب الفاظ کا کام وسیع اور منظم طریقے سے شروع کیا۔ مسٹر ایچ۔ سی چین نے ۱۹۲۰ء میں ایک لغت ترتیب دینا شروع کیا جس کا نام "عام بولی کے مروجہ الفاظ" تھا۔ اس کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مختلف ذرائع سے اکٹھے کئے ہوئے الفاظ کی کُل تعداد ۸۷۴۴۵۵ ہے۔ لیکن عام مروج الفاظ کی تعداد ۴۲۹۰ ہے۔ مسٹر چین کی لسانی تحقیق کے مطابق بعض اور علمانے بھی ایسی ہی کوششیں کیں۔ ان میں سے خاص طور سے قابلِ ذکر مسٹر اے۔ او۔ ڈن تیہ، ٹوسوچو، لی چنیہ، لی چن سی، سے لی ننینگ، ہنگ شین، چانگ سی سوان، اے وی وغیرہم ہیں۔ انہوں نے حکومت کی شائع کردہ مقبول عام کتابوں کو پیشِ نظر رکھ کر حساب لگایا ہے کہ کُل الفاظ کی تعداد ۵۰۴۶۰۹ ہے۔ ان میں سے عام الفاظ ۸۶۹۱ ہیں۔ اور پھر ان میں سے ۲۴۲۰ الفاظ ایسے ہیں جو اکثر اور بار بار لکھنے میں آتے ہیں۔

چینی زبان یک لہجائی (Mono Syllabic) زبان ہے یعنی اس میں مرکب الفاظ نہیں۔ لیکن اس یک لہجائیت کو بعض اوقات غلط سمجھا جاتا ہے یا اس کے متعلق اظہار خیال کرنے میں کچھ مبالغے سے کام لیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر لکھے ہوئے لفظ کی آواز صرف ایک ہوتی ہے۔ لیکن یہ درست نہیں کہ ہر لفظ یا چینی زبان کا ہر خیال ایک ہی آواز میں ادا کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چینی زبان کی اکثر اصطلاحات ایسی ہیں جو دو لفظوں سے مل کر بنتی ہیں۔ اور لکھتے ہوئے بھی دو لفظوں کے مرکب کی صورت میں لکھی جاتی ہیں۔ ایک زندہ زبان کے اجزائے ترکیبی کا انحصار محض ان علامتوں پر نہیں جو لکھنے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ بلکہ ان الفاظ پر ہوتا ہے جو بولنے میں اور اظہار خیالات میں کام آتے ہیں۔

۴۔ تعلیم و تدریس کے طریقے اور فن تعلیم کے اصول۔

(ا) عوامی مدارس کی تنظیم۔

شہری مدارس جن کے قواعد و ضوابط کا ۳۹ سنہ میں اعلان کیا گیا تھا۔ دو شعبوں میں منقسم ہیں۔ ایک شعبہ بچّوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ اور دوسرا بالغوں کے لئے جن میں خواتین بھی شامل ہیں۔ بچّوں کے مدارس میں چار اور مرکزی شہری مدارس میں چھ جماعتیں ہوتی ہیں۔ ہر جماعت میں کم از کم ایک سال لگانا پڑتا ہے لیکن خاص مقامی حالات کے پیش نظر ایک کمرے میں کئی ایک جماعتوں کو اکٹھا بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ تعلیم بچّوں کی عمر اور ذہانت کے مطابق ہی دی جاتی ہے۔ دوسری صورتوں میں اساتذہ اور اسکول کے کمروں کی کمی کی وجہ سے ان میں دو بار اسکول لگتا ہے۔ بعض بچّے صبح کے وقت میں تعلیم پاتے ہیں اور کچھ دوپہر کے بعد۔

بالغوں کے شعبے کے عام طور سے دو درجے ہوتے ہیں۔ ایک تحتی درجہ ہے جس میں بارہ سے پنتالیس سال کے ان پڑھ اشخاص کو داخل کیا جاتا ہے۔ اس کا

کورس چار سے چھ ماہ تک ہوتا ہے۔ اور فوقی درجے میں وہ اشخاص داخل ہوتے ہیں جو تحتی درجے سے فارغ التحصیل ہوکر چھ ماہ سے ایک سال کا کورس پڑھنا چاہیں۔
بالغوں کی تعلیم کے اوقات ایسے نہیں جیسے کہ بچوں کے اسکولوں میں ہوتے ہیں۔ بلکہ موسم کے لحاظ سے یہ اوقات بدلتے رہتے ہیں اور وقت مقرر کرتے ہوئے بالغ اشخاص کی سہولتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ صبح، دوپہر یا شام جو وقت ان کے لئے مناسب ہو مقرر کیا جاسکتا ہے اور یہ وقتِ ضرورت کے مطابق بدل بھی سکتا ہے۔ ان کے علاوہ ضمنی مدارس بھی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ لڑکوں کی علمی اور فنی قابلیت کو بڑھایا جائے۔ تاکہ ان کی پیداوار کی صلاحیت بڑھ سکے۔ اور طلبا کو ہر طرح کی آسانیاں بھی مہیّا کی جاتی ہیں تاکہ وہ خاطر خواہ طور سے تعلیم جاری رکھ سکیں۔

(ب) تعلیم و تدریس کے طریقے۔

۱۹۱۹ء میں جب کہ ڈاکٹر جان ڈیوی اپنے دورہ کے سلسلے میں چین آیا اور یہاں کے ماہرینِ تعلیم کے ساتھ تبادلہ خیال کیا جو اس کے خیالات سے بہت متاثر ہوئے اس وقت سے نئے طریقہ ہائے تعلیم میں لوگ گہری دلچسپی لینے لگے ہیں۔ منصوبی طریقہ تعلیم، ڈالٹن پلین، بٹاویہ سسٹم، گاری پلین، ون بنٹکا سسٹم وغیرہ متعدد طریقہ ہائے تعلیم کا تجربہ کیا جا رہا ہے۔ ہر تجربہ سے تھوڑا بہت فائدہ تو ضرور ہوا ہے۔ لیکن منصوبی طریقہ تعلیم پر لوگوں کی نسبتاً زیادہ توجہ ہے۔

ڈاکٹر تاؤ ہینگ چی آنجہانی تعلیم کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کرنا چاہتے تھے انھوں نے ایک نیا طریق پیش کیا جس میں تعلیم اور عمل پر یکساں زور دیا گیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ طلبا جو کچھ سیکھ لیں، سے روزمرّہ کی زندگی میں استعمال بھی کر سکیں۔ حال ہی میں سٹرایچ سی چین نے تعلیم و تدریس "بواسطہ عمل" کا جو طریق پیش کیا ہے۔ یہ ڈاکٹر تاؤ ہی کے طریقے کی ایک صورت ہے۔ عمل کا یہ طریقہ

"زندۂ عمل" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا ہم اپنے پُرانے دقیانوسی اور بے جان وسیلۂ تعلیم کے ساتھ مقابلہ کریں تو ہمیں بہت فرق نظر آئے گا۔

آج کل اساتذہ جو فارغ التحصیل ہو کر اسکولوں میں کام کر رہے ہیں۔ وہ جدید اصول تعلیم سے پُورے طور سے واقف ہیں۔ ذہنی اور تعلیمی امتحانات کو خوب اچھی طرح ترتیب دے سکتے ہیں۔ نجی مطالعہ میں طلبہ کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اور انہیں اس قابل بنا سکتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات اور احساسات کی ترجمانی کر سکیں۔

۱۔ فن تعلیم کے بیشتر اصول ایسے ہیں جو بچوں اور بالغوں کی تعلیم کے لئے یکساں طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً تعلیم ایسی نوعیت کی ہو۔ جو طلبہ کے لئے ان کے روزمرّہ کی زندگی میں مفید ثابت ہو سکے۔

۲۔ اسکولوں میں جو تربیت دی جائے طلبہ کے خاص خاص ماحول اور معاشری ضروریات کے موافق ہو۔

۳۔ تعلیم کے لئے جگہ اور وقت کا تعیّن طلبہ کی سہولیتوں کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے۔

۴۔ بصری اور سماعی وسائل تعلیم زیادہ وسیع پیمانے پر استعمال کئے جائیں۔

۵۔ پُرانے طرز کے قہوہ خانے، تیاتر اور قصّہ گو حضرات کی خدمات کو اپنی جدید ضروریات کے مطابق ڈھالا جائے۔

۶۔ جہاں تک حالات اجازت دیں عوام کے لئے کتب خانے، عجائب خانے، جمنزیم، عوامی تعلیم کے ہال کمرے، سینما گھر، ریڈیو سٹیشن تعمیر کرائے جائیں۔ تاکہ معاشرتی تعلیم کی نشر و اشاعت ہو سکے۔

بصری اور سماعی وسائل کے ذریعے تعلیم و تدریس کی مدد

بنیادی تعلیم کی ترویج واشاعت کے لئے محکمہ تعلیم کو بصری اور سماعی وسائل پر خاص طور سے توجہ دینی چاہیئے ۱۹۴۵ء میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کی روئداد کے مطابق تمام صوبوں اور کمیٹیوں نے فنی استمداد کے لئے دفتر کھول دئے ہیں۔ جو لوگ اس طریق کار میں دلچسپی رکھتے ہوں انہیں خاص خاص اسکولوں میں خاص سازوسامان کے ساتھ تربیت دی جائے گی۔ ان اسکولوں کی ترتیب وتنظیم محکمہ تعلیم کے زیر اہتمام ہو گی۔ حال ہی میں ایک وفد امریکہ بھیجا گیا ہے۔ تاکہ اس سلسلے میں وہاں کے جدید ترین طریق کار کا مطالعہ کرے۔ امید ہے کہ اس وفد کی واپسی پر بصری اور سماعی استمداد کا طریق اور بھی زیادہ مؤثر اور مفید ہو جائے گا۔ جاپان کے جنگ کے دوران ہی میں اس فن میں کافی ترقی ہو چکی تھی۔ ریڈیو کا استعمال تو آج کل لازمۂ حیات بن چکا ہے۔ اس کی ضرورت شہروں میں بھی سمجھی جاتی ہے اور دیہات میں بھی۔ متحرک تصاویر دکھانے کا کام بھی بڑی اچھی طرح سے شروع ہو چکا ہے۔ تعلیمی فلم سٹوڈیو بڑے پیمانے پر ۱۹۴۷ء میں قائم ہو چکا ہے۔ تعلیمی متحرک تصاویر بہت بڑی تعداد میں تیار ہو چکی ہیں۔ تاکہ جدید تعلیم میں خاطر خواہ مدد مل سکے۔ وزارت تعلیم نے متحرک تصاویر اور براڈکاسٹنگ کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ایک پانچ سالہ اسکیم تیار کر لی ہے اور جلد ہی اس پر کام بھی شروع ہونے والا ہے۔

۷ نتیجہ

متذکرہ بالا روئداد میں ان ضروری نکات کو پیش کیا گیا ہے جو ہماری بنیادی تعلیم کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔ بنیادی تعلیم کا کام حقیقت میں اہلِ چین کے لئے بہت ہی بڑا کام ہے اور اس میں بھی کلام نہیں کہ تعلیم کو ہمیشہ سے ہی چین میں عزّت واحترام کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ لیکن چونکہ سیاسی

اقتصادی اور معاشرتی حالات ناموافق تھے۔ بیرونی اُلجھنیں بھی حائل تھیں متعدد صبر آزما حالات سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ اِس لئے عوام کی ناخواندگی کا کام رُک رُک جاتا رہا۔ بہرحال یہ معلوم کرکے حوصلہ بڑھتا ہے۔ کہ آخری پچاس سال کے عرصے میں رفتہ رفتہ خاصی ترقی ہوچکی ہے۔ خصوصاً جنگ جاپان کے عرصے میں تعلیمی کام برق رفتاری کے ساتھ بڑھتا رہا۔ اگر امن اور سکون رہے تو چین اس میدان میں اب جلد ہی حیرت انگیز ترقی کرسکتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یونیسکو کی تاسیس کے ذریعے ہمیں بہت زیادہ مدد ملے گی۔ چین بنیادی تعلیم کے اصول و معیار پر عمل پیرا ہونے کے لئے پوری طرح سے آمادہ ہے۔

---

61. Qualification

اس کے لئے مندرجہ ذیل ترجمے موصول ہوئے ہیں :-

قابلیت، اہلیت، استعداد، مطلوبہ استعداد، مقررہ اہلیت، مطلوبہ لیاقت، وصف، اوصاف، سند، شرط، تصدیق، خصوصیات، علمی اہلیت، حدود۔

Qualification. کی دراصل دو مختلف صورتیں ہیں۔ اگر یہ لفظ کسی مقولے یا بیان کے سلسلے میں استعمال کیا جارہا ہے۔ تو اس کا مفہوم شرائط و حدود ہوگا۔ اس لحاظ سے اس کی تعبیر، تعدیل، تحدید، مشروطیت، استثنیات وغیرہ الفاظ سے ہوگی اس صورت سے اِن سب الفاظ میں سے "تحدید" قابل ترجیح ہوگا۔ اور اگر یہ لفظ کسی فرد کے علمی معیارِ قابلیت کی خاطر استعمال ہو رہا ہے۔ تو اس کے لئے وہی مفہوم ہوگا۔ جو مندرجہ بالا مجوزہ الفاظ میں ادا کیا گیا ہے۔ لیکن ان تمام الفاظ میں سے سادہ تر اور اصل مفہوم سے قریب تر "علمی قابلیت" ہے۔ اور یہی سب کے مقابلے میں قابلِ ترجیح ہے۔

62. Terms of Service

میعادِ ملازمت، حدودِ ملازمت، شرائطِ ملازمت، اور ضوابطِ خدمت میں سے

"شرائطِ ملازمت" زیادہ مناسب اور صحیح ہے۔

63. Eligibility

اس کے لئے مندرجہ ذیل ترجمے موصول ہوئے ہیں :۔

مناسبت، قابلیت، اہلیت، جواز، سزاواری، استحقاق اور پسندیدگی۔

لیکن یہ تمام .Eligibility کے اصل مفہوم سے کچھ دُور ہیں۔ "مناسبت" تو اس سے بہت دُور ہے۔ جواز .Permissibility کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ سزاوار اور مستحق deserving کے لئے مستعمل ہوتے ہیں۔ .Eligibility کے لئے قابلیت و اہلیت ہی رہ جاتے ہیں۔ ان دو میں سے اہلیت بہتر ہے۔

64. Gratuity

عطیہ، وظیفہ، بخشش، انعام، حصہ، شاباش، آفرین، مبارکباد میں سے شاباش، آفرین اور مبارکباد اگرچہ .Gratuity کے مفہوم میں شامل ضرور ہیں لیکن اتنے جامع نہیں ہیں۔ عطیہ اور بخشش بھی سارے مفہوم پر حاوی نہیں۔ وظیفہ اور انعام قریب تر ہیں۔ لیکن ان کے مقابل اگر "زرِ انعام" استعمال کیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

65. Fellow of a University

اس کے لئے مندرجہ ذیل مختلف ترجمے وصول ہوئے ہیں :۔

یونیورسٹی کا ساتھی، یونیورسٹی کا شریک کار، یونیورسٹی کا رفیق کار، شریک کلیہ، شریک کارِ کلیہ، رفیق کلیہ، رفیق کارِ کلیہ، شریک جامعہ۔

ساتھی کا لفظ کچھ بہت ہی سادہ ہے۔ اس کے ساتھ یونیورسٹی لفظ کا استعمال بھی اچھا نہیں۔ جب کہ ہمارے پاس اس کے لئے بہتر الفاظ کلیہ اور جامعہ کے موجود ہیں، کلیہ کے مقابل جامعہ قابل ترجیح ہے۔ اور یہ اکثر استعمال بھی ہو رہا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات سے کالج کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن یونیورسٹی کے لئے یہ زیادہ موزوں ہے۔

شریک کا لفظ فیلو کے لئے آ تو سکتا ہے۔ لیکن یونیورسٹی کے فیلو میں جو مفہوم ہے۔ اس کے لئے شریک موزوں نہیں۔ شریک یا شریک کار میں شرکت سے عام طور پر تجارتی حصہ داری کے معنی لئے جاتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی نظر آتا ہے۔ کہ رفیق کار جامعہ یا شریک کار کلیہ کی جگہ "رفیقِ جامعہ" کہا جائے۔ یہ الفاظ صحیح مفہوم بھی ادا کرتے ہیں۔ اور موزوں بھی ہیں۔

66. Faculty of Arts

اس کے متعلق موصولہ ترجمے درج ذیل ہیں:-

شعبہ علوم، شعبہ فنون، درجہ علمی، درجہ فنی، صیغہ فنون، طبقہ علمی، دائرہ علوم، یہاں چند الفاظ قابلِ غور ہیں۔ علم، فن، شعبہ، صیغہ، طبقہ، دائرہ۔ دائرہ cle کے معنوں میں آتا ہے۔ یہ کسی جمعیت کے لئے موزوں ہے۔ جیسے Social circle دا معاشرۃ، Educational circle دائرۂ معا، Viscious circle دائرۂ خبیثہ، Literary circle. دائرہ ادبیہ وغیرہ۔ لیکن Faculty کا صحیح مفہوم دائرہ سے ادا ہوتا۔ طبقہ .Stage یا .Class کے معنوں میں آتا ہے۔ جہاں تک جماعتی امتحان کا ہے۔ .Faculty of Arts کے لئے شاید یہ موزوں قرار دیا جا سکے۔ لیکن اس .Faculty کی سی جامعیت نہیں۔ شعبہ اور صیغہ میں سے کوئی سا لفظ موزوں ہوگا عام استعمال کے باعث زیادہ مرغوب عام ہے۔

علوم کا لفظ Sciences کے لئے آتا ہے۔ .Faculty of Science - شعبہ علم استعمال کیا جائے تو موزوں ہوگا۔ لیکن Faculty of Arts کے لئے "شعبہ فنون" ہی زیادہ موزوں اور صحیح ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔

67. Bachelor of Arts

اس کے لئے ہمارے پیشِ نظر اس وقت تین مجوزہ ترجمے ہیں۔ "طیلسانی" "کتخدائے علوم"۔ "جوانِ علوم"۔ ایک صاحب نے نہایت مضحکہ خیز ترجمہ تجویز کیا ہے۔ "دامادِ علوم" شاید وہ داماد کے لفظ سے آشنا نہیں۔ یا .Bachelor کے معنی سے ناواقف ہیں۔ "جوانِ علوم" اور "کتخدائے علوم" بھی اسی قبیل سے ہیں۔ طیلسانی کا .Graduate کا ترجمہ Bachelon of Arts. کے لئے موزوں ہے۔ "بالغ الفنون" اچھا ہے۔ اسی طرح Bachelor of Science کے لئے "بالغ العلم" یا "بالغ العلوم" اچھا رہے گا۔

68. Master of Arts

غالب الفنون، مدرس العلوم، معلم العلوم، سردارِ فنون، ماہرِ علوم، استادِ علوم، حاکم علوم۔

استاد، مدرس اور معلم کے الفاظ کی ناموزونیت ظاہر ہے۔ کیونکہ Master کا مفہوم یہاں استادی نہیں بلکہ ایک قسم کی ملکیت ہے۔ اسی طرح غالب و حاکم بھی غیر موزوں ہیں۔ سردارِ فنون میں قدرے "سکھیت" کی بو آتی ہے۔ ماہر موزوں ہے لیکن اسے .Expert کے لئے مخصوص رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ اور Master of A میں چونکہ Master ملکیت کا آئینہ دار ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ .Master of Arts کو "مالک الفنون" قرار دیا جائے اور Master of Scie کو "مالک العلم" یا "مالک العلوم"۔

69. Degree

سند، درجہ تفضیل، رتبہ، درجہ، واسطہ، ڈگری، دستاویزِ علم، علم پیمانۂ علم۔

ان تمام کے مقابلے میں "درجہ فضیلت" اچھا اور موزوں ہے۔ عام مستعمل "سند" ہے
اسے رائج رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔

70. Chancellor

حاکم اعلٰے، افسر اعلٰے، صدر اعظم، وزیر، وکیل، سردار، سالار، امیر
ان تمام میں سے Chancellor کے لئے "سالار" کا لفظ بہت موزوں معلوم ہوتا ہے۔ لیکن Chancellor of University کے لئے "سالارِ جامعہ" کی جگہ "میر جامعہ" استعمال کیا جائے تو شاید مختصر بھی ہو اور زیادہ موزوں بھی۔

(ب)

اصطلاحات زیر غور

1. Senate. 72. Dean. 73. Prospects. 74. Lecturer.

'5. Public Service Commission. 76. Post. 77. Minimum.

8. Maximum. 79. Tentative. 80. Notes. 81. Proceedings.

2. Incumbent. 83. Relief. 84. Disciplinary action.

5. Enquiry Committee 86. Contingent. 87. Emergency.

8. Efficiency. 89. Net Income. 90. Counter-Signed.

.. Graduate 92. Terms of reference 93. Vice-Chancellor

l. Declaration 95. Time-Table 96. Period 97. Curator

3. Bureau 99. Constitution 100. Chairman

سرکاری جریدہ کے اعلانات

سررشتۂ تعلیم مغربی پنجاب

صیغہ رجال ــــــــ شعبہ کالج

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲/اکتوبر ۴۸ء ۲۰۶۲۰	ڈاکٹر محمد حسن ایم اے پی ایچ ڈی	لیکچرار اعلےٰ گورنمنٹ کالج لائل پور۔	لیکچرار اعلےٰ گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خاں	تاریخ حاضری سے	م۔ محمد صدیق ملک کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
اکتوبر ۴۸ء ۲۰۷۱۷	م۔ محمد ابراہیم شمیم ایم اے (فلسفہ) (۱۵۰-۱۰-۲۵۰)	لیکچرار فلسفہ گورنمنٹ کالج منٹگمری (جو اب تعلیمی رخصت پر ہیں)	زائد لیکچرار فلسفہ گورنمنٹ کالج لاہور۔ بشاہرہ سابقہ	״	وہ اپنی اسامی ساتھ لے جائیں گے۔
نومبر ۴۸ء ۲۱۵۴۱	م۔ محمد خورشید ایم اے (۱۵۰-۳۵۰)	قائمقام لیکچرار انگریزی سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور	قائم مقام لیکچرار انگریزی گورنمنٹ کالج لائل پور۔ بشاہرہ سابقہ	״	م۔ محمد شمس الدین کی جگہ جو ٹرانکور چلے گئے ہیں۔
״	م۔ محمد زکریا ایم اے (۱۵۰-۳۵۰)	لیکچرار ریاضیات گورنمنٹ کالج لائل پور	لیکچرار ریاضیات سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور۔ بشاہرہ سابقہ۔	״	م۔ محمد خورشید کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
دسمبر ۴۸ء ۲۱۶۱۰	س۔ علاؤ الدین ایم اے عربی ایم اے فارسی نمبر ۷ (۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول جہلم (۹۰-۵-۱۵۰)	قائم مقام لیکچرار اُردو گورنمنٹ کالج جھنگ (۱۵۰-۱۰-۳۵۰)	״	شعبہ کالج میں ایک خالی اسامی کی جگہ۔
دسمبر ۴۸ء ۲۲۹۵۹	م۔ محمد شریف بی۔ اے، ڈی پی ای (نمبر ۲-۲) (۹۰-۵-۱۵۰)	قائم مقام ناظم جسمانیات گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازیخان۔	قائم مقام ناظم جسمانیات گورنمنٹ کالج جھنگ بشاہرہ سابقہ۔ درجہ شعبہ کالج (۱۵۰-۳۵۰)	״	عبد الرحیم بٹ بی۔ اے۔ ڈی۔ پی۔ ای نائب ناظر تعلیم جسمانی مدارس ضلع گوجرانوالہ کی جگہ جو (۱۵۰-۳۵۰) میں قائم مقامی کر رہے تھے، اور جو اب بحیثیت نگران تربیت جسمانی اسلامیہ کالج گوجرانوالہ تبدیل ہو گئے ہیں۔ اور

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہُوا	کس تاریخ سے	کیفیت
					م۔ محمد اقبال قریشی بی۔اے، ڈی پی ای کے حق عود میں جن کی خدمات بوائے سکاؤٹس ایسوسی ایشن مغربی پنجاب نے مستعار لی ہیں۔
۲ر دسمبر ۴۸ء E-۲۳۰۵۴	س۔ اظہار الحسن وارثی ایم۔اے (اُردو) II۔ بی۔اے آنرز، بی۔ٹی (۹۰-۱۵۰)	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول کیمبلپور	قائم مقام لیکچرار اُردو گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازیخان بمشاہرہ (۱۵۰ روپے ماہوار درجہ مشاہرہ شعبہ کالج ۵۰۔ (۲۵	"	ایک خالی اسامی کی جگہ
یکم دسمبر ۴۸ء E-۲۲۹۶۹	م۔ محمد اسماعیل ایم۔اے (ریاضی) لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور درجہ مشاہرہ (۱۵۰-۲۵۰) شعبہ کالج اپنے تقرر اور درجہ مشاہرہ میں ۱۵ر اگست ۴۷ء سے مستقل قرار دئے گئے ہیں۔				
		صیغہ رجال ---- شعبہ سکول			
۳۰ر ستمبر ۴۸ء E-۱۹۲۲۶	م۔ فیضل الٰہی قادری بی۔اے، بی۔ٹی (۹۰-۵-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول جہلم بمشاہرہ سابقہ	"	ایک موجودہ اسامی کی جگہ جو ف۔ ج حمیدہ کے حاضر نہ ہونے کی وجہ سے خالی تھی
"	شیخ غلام محمدؒ ایم۔اے۔ بی۔ٹی (علیگ)	ایک مہاجر اُمیدوار	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی بمشاہرہ ۱۰۰ روپے ماہوار درجہ مشاہرہ (۹۰-۵-۱۵۰)	"	م۔ فیضل الٰہی قادری کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اور م۔ شہاب الدین احمد خان ایم۔اے بی۔ٹی (۹۰-۱۵۰) کے حق عود کے تحت جو اب گورنمنٹ ہائی سکول جہلم سے میانوالی کی طرف
۲۱ر اکتوبر ۴۸ء E-۲۰۳۹۰	م۔ عبدالسلام بی۔اے۔ بی۔ٹی (۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب	معلم انگریزی سنٹرل موڈل سکول لاہور۔ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ فیضل حسین ایم۔اے (جغرافیہ) بی۔ٹی (۹۰-۱۵۰) کی جگہ جو اب قائم مقام لیکچرار ڈی مونٹیسی کالج سرگودھا ہیں۔ اور جن کا حق عود اب سنٹرل موڈل سکول سے گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب منتقل کیا جاتا ہے۔
۸ر نومبر ۴۸ء E-۲۱۴۹۱	م۔ عبدالقدیر بی۔اے بی۔ٹی نمبر ۶۶ (۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اینڈ نارمل سکول شاہ پور صدر	معلم انگریزی گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ۔ بمشاہرہ سابقہ	"	م۔ گلشاد حسین بی اے بی ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
"	م۔ گلشاد حسین بی اے بی ٹی نمبر ۹ (۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ سکول گکھڑ (حال رخصتی)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اینڈ نارمل سکول شاہ پور صدر۔ بمشاہرہ سابقہ (رخصتی)	جس تاریخ سے عبدالقدیر شاہ پور سے فارغ ہوں۔	م۔ عبدالقدیر بی اے بی ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
"	چودھری محمدؐ بی اے بی ٹی	ایک اُمیدوار	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اینڈ نارمل سکول شاہ پور صدر بمشاہرہ ۹۰ روپے ماہوار درجہ (۹۰-۵-۱۵۰) میں	تاریخ حاضری سے	م۔ گلشاد حسین بی اے بی ٹی نمبر ۹۰ (۹۰-۵-۱۵۰) کی جگہ۔
۲۸ر اکتوبر ۴۸ء E-۸۸۲۲	م۔ محمدؐ عبد اللہ قریشی (نمبر ندارد۔ ۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول پسرور۔	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول شرقپور بحیثیت سابقہ	"	م۔ محمدؐ علی خان معلم انگریزی کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں۔

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۶ر دسمبر سنہ ۴۸ء E-۲۳۲۹۱	م۔ محمد اسماعیل بی اے بی ٹی (نمبر ۲۸: ۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول کیمبلپور بمشاہرہ سابقہ	؍؍	م۔ محمد سعید ایم اے بی ٹی (نمبر ۱۱۶: ۹۰-۱۵۰) کی جگہ جو اب ایک کالج میں درجہ مشاہرہ ۱۵۰-۷۰ میں لیکچرار مقرر ہوئے ہیں اور جن کا حق عود اب کیمبلپور سے گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔
	م۔ احمد دین بی۔ اے۔ ایس اے وی	ایک اُمیدوار	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ بمشاہرہ ۹۰ روپے ماہوار۔ درجہ سوم (۹۰-۱۵۰)	؍؍	م۔ محمد اسمٰعیل کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے اور م۔ محمد سعید ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی کے حق عود کے تحت جو اب شعبہ کالج میں قائم مقامی کر رہے ہیں۔
۱۳ر دسمبر سنہ ۴۸ء E-۲۳۸۷۵	م۔ عبد الجلیل درجہ مشاہرہ (۵۰-۱۰۰)	معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول جنڈانوالہ۔	معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول حضرو بمشاہرہ سابقہ	؍؍	مسٹر سیموئل ڈیوڈ کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
؍؍	مسٹر سیموئل ڈیوڈ درجہ مشاہرہ (۵۰-۱۰۰)	معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول حضرو۔	معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول جنڈانوالہ بمشاہرہ سابقہ	؍؍	م۔ عبد الجلیل کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۱۳ر دسمبر سنہ ۴۸ء E-۲۳۸۷۷	م۔ خورشید عالم بخاری (۵۰-۳-۸۰/۴-۱۰۰)	معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی سکول فتح جنگ	معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی سکول پسرور بمشاہرہ سابقہ	؍؍	م۔ نور حسین کی جگہ جو سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔
۱۶ر دسمبر سنہ ۴۸ء E-۲۴۲۱۸	م۔ محمد حیات بی۔ اے ایس اے وی۔ (نمبر ۶۸: ۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ نارمل سکول شاہ پور صدر	نائب ناظر مدارس ضلع گجرات بمشاہرہ سابقہ	۱۹ر دسمبر سنہ ۴۸ء سے یا اسکے بعد کسی تاریخ سے جب وہ حاضر ہوں	م۔ فضل الرحمٰن بی۔ اے بی۔ ٹی (نمبر ۴: ۲۳۰-۳۰۰) کی جگہ جو ۱۹ر دسمبر سنہ ۴۸ء قبل از دوپہر سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو رہے ہیں
۶ر دسمبر سنہ ۴۸ء E-۲۳۲۸۲	م۔ محمد عبد الرحیم خان ایچ پی اوٹی معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی سکول کہوٹہ درجہ مشاہرہ سوم (۵۰-۳-۸۰/۴-۱۰۰) شعبہ کلاسیکل ورنیکلر اپنے تقرر اور درجہ مشاہرہ میں یکم جون سنہ ۴۸ء سے مستقل قرار دیئے گئے ہیں۔				
۶ر دسمبر سنہ ۴۸ء E-۲۳۲۸۸	م۔ عمر حیات بی ایس سی، بی ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول جہلم درجہ مشاہرہ سوم (۹۰-۵-۱۵۰) شعبہ اینگلو ورنیکلر اپنے تقرر اور درجہ مشاہرہ میں ۲۸ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء سے مستقل قرار دیئے گئے ہیں۔				

صیغہ نسواں

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۷ر اکتوبر سنہ ۴۸ء ۳۷-۲۰۷۱۳	مس میری ابراہام بی ٹی ڈی لیڈی ارون کالج		لیکچرار کوئین میری کالج لاہور بمشاہرہ ۹۰ روپے ماہوار (۷۰-۱۵۰) کے درجہ میں ایک سال کی آزمائش پر	یکم اکتوبر سنہ ۴۸ء سے	ایک خالی اسامی کی جگہ۔

صیغہ دفاتر

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۳۱ اکتوبر ۱۹۴۸ء E-۲۰۴۵۱	م محمد سلطان (۸۰ — ۱۵۰)	اعلیٰ محرر دفتر ناظر مدارس قسمت راولپنڈی (قائمقام)	اعلیٰ محرر دفتر گورنمنٹ گرلز ہائی اینڈ نارمل سکول جہلم (قائم مقام)	تاریخ حاضری سے	م۔عبدالرحمٰن کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
۲۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء E-۲۰۴۹۷	م۔ اکبر حسین ہاشمی (۵۰ — ۱۰۰)	ادنیٰ محرر گورنمنٹ گرلز ہائی سکول فیروز پور روڈ لاہور۔	ادنیٰ محرر سنٹرل ماڈل سکول لاہور	″	زیڈ۔ اے شیخ کی جگہ۔ جو مستعفی ہوچکے ہیں۔

تاریخ و شمارہ	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء E-۲۰۴۹۷	م۔عبدالرشید انصاری	ایک مہاجر امیدوار	ادنیٰ محرر گورنمنٹ گرلز ہائی سکول فیروزپور روڈ۔ (قائم مقام) بمشاہرہ ۵۰ روپے ماہوار۔ (۵۰-۳-۸۰-۴-۱۰۰ کے درجے میں۔	تاریخ حاضری سے	م۔ اکبر حسین ہاشمی کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
۲۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء E/A-۶۸۹/	خورشید احمد (نمبر ندارد) (۵۰ — ۱۰۰)	ادنیٰ محرر گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ (قائم مقام) جنکے دفتر ناظم تعلیمات پنجاب لاہور کی طرف تبادلے کے احکام جاری ہوچکے ہیں۔	ادنیٰ محرر گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ (قائم مقام)	″	محمد علی کی جگہ۔
″	م۔محمد علی۔ (نمبر ندارد) (۵۰ — ۱۰۰)	ادنیٰ محرر گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ۔ (قائم مقام) جن کے گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ کی طرف تبادلے کے احکام صادر ہوچکے ہیں	ادنیٰ محرر دفتر ناظم تعلیمات لاہور۔	″	م۔محمد حنیف خان کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تعین ہوا	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
یکم دسمبر ۱۹۴۸ء E-۲۲۹۵۵	م۔مقبول الرحمٰن	اعلیٰ محرر گورنمنٹ کالج کیمبل پور	۸۰-۵-۱۱۰-۵/۱۵۰	۱۰۶-۶-۱۴۰-۸/۲۰۰	صدر محرر دفتر ناظر مدارس راولپنڈی (قائم مقام)	تاریخ حاضری سے	م محمد عبداللہ کی جگہ جو رخصت پر ہیں

- "آموزش" ہر ماہ شائع ہوتا ہے، سالانہ چندہ چھ روپیہ ہے
زرچندہ منیجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور کے نام روانہ کریں۔
- مضامین ایڈیٹر "آموزش" سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور
کو ارسال کئے جائیں۔ اشاعت کے لئے منظور شدہ
مضامین کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔
- "آموزش" تمام تعلیمی حلقوں میں مقبول اور جملہ تعلیمی اداروں
میں رائج ہے۔
- "آموزش" میں اشتہار دیکر آپ تعلیم یافتہ جماعت
میں مشہور و مقبول ہو سکتے ہیں۔
- اشتہارات اور دوسرے کاروباری معاملات کے لئے
منیجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور سے مراسلت کریں۔

آموزش

منیجر "آموزش" کشمیری بازار۔ لاہور

فروری ۱۹۴۹ء

مدیر:
محمد ناظر

ناشر
کتاب منزل
لاہور
قیمت فی پرچہ: ۱۰ آنے

فروری ۱۹۴۹ء
جلد: ۱
شمارہ: ۱۰

سالانہ چندہ:
پاکستان کیلئے: ۶ روپے
غیر ممالک کیلئے: ۸ روپے

اس کارڈ کا
خرچہ ڈاک
فرستندہ ادا کریگا

Business Reply Card

LAHORE G.P.O.
PERMIT No. 720

پاکستان میں اس
کارڈ پر ٹکٹ
لگانے کی ضرورت
نہیں

To

Kitab Manzil,
PUBLISHERS,
KASHMIRI BAZAR,
LAHORE.

رموز

پاکستان کے قیام سے ہمارے حالات میں جو تغیر و تبدل رونما ہوا ہے۔
س کا تقاضا ہے کہ ہماری معاشرتی اور تمدنی اصلاحوں کے ساتھ ساتھ ہماری تعلیمی
صلاحیں بھی ہمارے بدلے ہوئے حالات کے مطابق ہوں۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت
ہے۔ کہ ہمارے مسائل اب اس قسم کے مسائل نہیں جن کا برِ عظیم ہند و پاکستان کی تقسیم
سے پیشتر ہمیں سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے آزاد ملک کی تخلیق اس بنا پر ہوئی ہے۔ کہ ہماری
م اصولِ زندگی، مذہب، ثقافت، معاشرت اور تمدن میں اسلامی ہے۔ اور اسلامی
نقطۂ نگاہ سے مطابقت رکھنے والے ان تمام اقدار کی خواہاں ہے جنکے تمام ممالکِ اسلامیہ
ئینہ دار ہیں۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر جہاں معاشرت و تمدن کی اصلاح کی ضرورت
ہے وہاں تعلیم میں بھی جو معاشرہ کا محورِ اعظم ہے۔ مناسب ترمیم و تبدیلی کی ضرورت ہے۔
تعلیم ہر قوم کی بنیاد ہے۔ قومی تعمیر کی تشکیل اسی سے ہوتی ہے۔ ہمارے قومی
حۂ عمل میں اس کی اساسی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ تعلیمی نصاب کے
ئینے میں قومی تعمیر کی صحیح تصویر جھلکتی ہے۔ قومی اصلاح کے لئے سب سے پہلے جس پر
صلحین کی نگاہیں مرکوز ہونی چاہئیں۔ وہ تعلیمی نصاب ہے۔ یہاں تک ہمیں پورے
قین کے ساتھ معلوم ہو سکا ہے۔ ہمارے صوبے کی حکومت نے اس سمت میں اس اہم
ام میں پہل کی۔ مئی ۱۹۴۷ء میں حکومت مغربی پنجاب نے پہلی سے آٹھویں تک

کی ابتدائی جماعتوں کے نصاب میں ضروری تغیّر و تبدل کرنے کی خاطر مجلس ترمیم نصاب مقرر کی۔ اور اس نے اپنا کام بڑی شد و مد سے شروع کر دیا۔

پاکستان کے تمام صوبے بلکہ ہندوستان بھی حکومت مغربی پنجاب کی اس مقرر کردہ مجلس ترمیم نصاب کی رودادشائع ہونے کا بے تابی سے انتظار کر رہا ہے معلوم ہوا ہے کہ یہ مجلس اپنا ابتدائی کام تقریباً ختم کر چکی ہے۔ تمام ذیلی مجالس نے اپنی اپنی روداد اس کے پیش کر دی ہیں۔ ہر ذیلی مجلس نے وقت کے تقاضا کے مطابق اپنی سفارشات بھیجی ہیں۔ اور ہم اس بات پر خوش ہیں۔ کہ ان ذیلی مجالس نے قیام پاکستان کے بعد کی قومی ضرورتوں کو خاص طور پر مدِنظر رکھ کر اپنی تجاویز مجلسِ اعلےٰ کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی کانفرنس ۲۸-۲۹-۳۰ جنوری کو سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس کے اہتمامات زور و شور سے ہو رہے ہیں۔ پروگرام شائع ہو چکا ہے۔ ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو رسم افتتاح اور عام تقاریر ہوں گی۔ اسی تاریخ کی رات کو ڈرامہ ہو گا۔ ۲۹ جنوری کو تعلیم بالغان اور تعلیم صحت جسمانی کے متعلق نشستیں ہوں گی جس میں تقاریر ہوں گی اور مقالات پڑھے جائیں گے۔ شام کو تعلیمی مشاعرہ ہو گا۔ ۳۰ جنوری کو ابتدائی و ثانوی تعلیم' اُستادوں کی تربیت اور متفرق تعلیمی مسائل پر اجلاس قائم ہونگے۔ جن میں مقالات بھی پڑھے جائیں گے اور مذاکرات بھی ہوں گے۔ شام کو اجلاس عام ہو گا۔

درسگاہوں کے اساتذہ اور صدر اساتذہ کو شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔ اور ہر درسگاہ سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ اساتذہ میں سے دو نمائندے نامزد کر کے ڈیلیگیٹ کے طور پر بھیجے۔ تعلیمی مسائل پر تجاویز و مقالات بھی طلب کئے گئے ہیں۔

مشاعرے کے سلسلے میں یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ کہ طلبہ میں نظموں کا مقابلہ ہو۔ ایک

مقابلہ اسکول کے طلبہ میں ہوگا۔ اور دوسرا کالج کے طلبہ میں۔ ہر مقابلے کے لئے دو انعامات رکھے گئے ہیں۔ اس مقابلہ کیلئے عنوانِ نظم "تعلیم" مقرر کیا گیا ہے۔ طلبہ کے مقابلے کے بعد شعرائے کرام اپنے کلام سے مستفید فرمائیں گے۔ کانفرنس کی کارروائی اُردو میں ہوگی۔ مقالے یا تقاریر کے لئے اختیار دے دیا گیا ہے۔ جو اصحاب چاہیں انگریزی کو ذریعۂ اظہار قرار دے سکتے ہیں۔

اگرچہ عام طور پر کانفرنسوں کا ایک ہی مخصوص موضوع ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے نئے حالات کے مطابق ہماری ضرورتیں کچھ ایسی متنوع ہیں۔ کہ اگر نظر غائر ڈالی جائے۔ تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ کسی ایک پہلو کو بھی نظر انداز نہ کیا جائے۔ حالات بدلے ہیں تو سارا نظام بدلنا چاہیئے۔ اور یہ تغیّر بے سوچے سمجھے نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ مفکّرین و مدبّرین اس تغیّر کے لئے مناسب تدابیر اختیار کریں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کہ ہمارے مستقبل کا محورِ اعظم تعلیم ہوگی۔ تعلیم کا کوئی خاص پہلو نہیں۔ بلکہ تعلیم بحیثیّت مجموعی علی الخصوص اس کے وہ پہلو جو ہماری معاشرۃ کی بنیاد ہیں۔ مثلاً (۱) ابتدائی اور ثانوی تعلیم، جہاں ہمارے بچّوں کی علمی بنیادیں مستحکم ہوتی ہیں۔ اور ان کے دِل و دماغ ڈھلتے ہیں (۲) استادوں کی تربیّت جس کے بغیر تمام قسم کی تعلیمی توقعات بے بنیاد ہیں۔ استادوں کی تربیّت میں خامی یا کج روی ایک ایسا گھُن ہے جس سے تمدّن اور ثقافت کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا ہے۔ (۳) ہمارے اَن پڑھ بالغوں کے لئے کچھ پڑھنے لکھنے کا اہتمام۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے۔ کہ جب تک ہمارے تمام افراد پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ ہماری معاشرت کی صحیح تعمیر دشوار ہے۔ (۴) بچّوں کی صحت جسمانی۔ تن بدن اچھا نہیں ہوگا تو بچّہ قوم کا مفید پُرزہ کس طرح بن سکتا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی کانفرنس بجائے ایک مخصوص موضوع کے ان تمام اہم تعلیمی پہلوؤں پر بحث کرے گی۔ خدا کرے۔ کہ ان بحثوں کا کوئی مفید قومی نتیجہ برآمد ہو۔

صوبے کے اساتذہ کی ایک باہمی مجلس ہے۔ جو اساتذہ اُور تعلیم سے متعلق مجموعی مسائل پر بحث کیا کرتی ہے۔ اِس مجلس اساتذہ مغربی پنجاب کے زیرِ اہتمام ایک تعلیمی کانفرنس حبیبیہ ہال لاہور میں ۲۸، اُور ۲۹ دسمبر ۱۹۴۸ء کو منعقد ہوئی۔ سکولوں کے اساتذہ کے علاوہ کالجوں کے پروفیسر حضرات اُور دیگر تعلیم گاہوں کے افسر بھی شامل ہُوئے۔ محکمہ تعلیم کے اربابِ بست و کشاد اُور تعلیم سے ہمدردی رکھنے والے دیگر بزرگ بھی شریک تھے۔

کانفرنس کا افتتاح ۲۸ دسمبر کو آنریبل چودھری فضل الٰہی صاحب وزیرِ تعلیم صوبہ مغربی پنجاب نے کیا۔ اِس کانفرنس میں مقالات بھی پڑھے گئے۔ تقاریر بھی ہوئیں، ریزولیوشن بھی پاس کئے گئے۔

اِس کانفرنس کا نتیجہ ابھی عملی طور پر دیکھنا باقی ہے۔ اس کے مدِّنظر کئی امور تھے۔ جن میں سے اہم حسبِ ذیل ہیں:-

(۱) صوبہ کی تعلیم میں جدید ضرورتوں کے مطابق تغیّر و تبدّل۔

(۲) اساتذہ کے حقوق و فرائض۔

(۳) طلبہ کے لئے لازمی فوجی تعلیم۔

اِن امور کو خطبہ استقبالیہ میں صوبے کی تعلیم کا جائزہ لیتے ہوئے حسبِ ذیل الفاظ میں پیش کیا گیا تھا: "اب ہمارے لئے موقعہ ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم کو وسیع کریں۔ اُور اپنے بچّوں کو صحیح قسم کی تعلیم دیں۔ کالجوں میں ریسرچ کے کام کو فروغ دینے پر زور دیں۔ کیونکہ یہی ایک چیز ہے۔ جس سے ہمارے نوجوان اپنی قابلیتوں اُور صلاحیتوں کو اُجاگر کر سکتے ہیں تعلیمی نصاب میں انقلاب انگیز تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ نصاب ایسا ہونا چاہیئے۔ جو طلبہ میں قومی احساس پیدا کر سکے۔ اُور ان کو اپنے ملک سے محبت کرنا سکھائے۔ اُور انسانیّت سے ہمدردی ان کا شیوہ بن سکے...... اساتذہ کے معیارِ تعلیم کو

بلند کیا جائے اور مختلف مقامات پر تربیتی درسگاہیں جاری کی جائیں۔ حکومت سنٹرل ٹریننگ کالج کو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنا دے اور اس میں اساتذہ کو تحقیق کے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ استادوں کے لئے ریفریشر کورس جاری کئے جائیں۔ نیز اس پر بھی زور دیا گیا کہ اساتذہ کے لئے ایسے حالات پیدا ہونے چاہئیں۔ جن سے ان کی عزت و وقار بڑھے۔"

اس کانفرنس میں بہت سے ریزولیوشن پاس ہوئے۔ جن میں سے اہم حسب ذیل ہیں :—

(۱) محکمہ تعلیم مغربی پنجاب سے درخواست کہ تمام اساتذہ کی اولاد کے لئے تعلیمی و صنعتی اداروں میں جن میں ہر قسم کے کالج اور سکول شامل ہیں مفت تعلیم دینے کا حکم صادر فرمائے اس میں تنخواہ یا آمدنی کی قید نہ ہو۔ اور نہ ہی زنانہ اور مردانہ اساتذہ کی تمیز ہو استادوں کے تمام بچوں کی فیس بطور حق معاف ہو۔

(۲) حکومت مغربی پنجاب سے مطالبہ کہ موجودہ سلیبس کمیٹیوں کو دوامی صورت دے دی جائے تاکہ جب کبھی بھی سلیبس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ وغیرہ کی ضرورت ہو۔ تو اس پر فوراً غور ہو سکے۔

(۳) حکومت سے درخواست کہ تمام درسگاہوں کو زیادہ سے زیادہ اسلامی کتب خریدنے کی اجازت دے۔ اور اس کے لئے فراخ دلی سے گرانٹ دے۔

(۴) وقت آ گیا ہے کہ حکومت تعلیم کے نظام کو بہتر بنائے اور عوام کی تعلیم کا انتظام کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اساتذہ کو اچھی تنخواہیں دی جائیں اور ان کے مجلسی وقار کو قائم کیا جائے۔

(۵) صوبہ میں کوئی بالغ یا نابالغ غیر تعلیم یافتہ نہ رہ جائے۔ حکومت سے درخواست ہے کہ (الف) پرائمری تعلیم کے لئے صوبہ کے ہر حصے میں لازمی تعلیم کے قانون کو فی الفور نافذ

کردے۔ اور اس پر سختی سے عمل درآمد کرے۔

(ب) تعلیم بالغان کے مراکز کھولے جائیں۔

(ج) تعلیم گاہوں کی عمارات کی قلت کو دُور کرنے کے لئے مساجد میں مکاتب کھولے جائیں۔

(۶) اساتذہ کو تربیت دینے کے لئے نئے ٹریننگ سکول کھولے جائیں۔ تاکہ اساتذہ کی وہ کمی جو ہر درسگاہ میں محسوس ہو رہی ہے۔ پوری ہو سکے۔ بہتر ہوگا کہ مرکزی ٹریننگ کالج میں ایک ریسرچ کا شعبہ کھولا جائے۔

(۷) معائنہ کے فرسودہ نظام کو بالکل کالعدم قرار دیں۔ اس کی جگہ اگر مختلف مراکز میں تعلیمی کانفرنسیں ہو جائیں۔ جن میں اساتذہ اور انسپکٹر صاحبان اپنے اپنے تجارب بیان کریں اور انہیں بعد میں عملی صورت دے دی جائے۔ تو بہتر ہوگا۔

(۸) مردانہ سکولز میں ہائی جماعتوں اور کالج میں ہر ایک طالب علم کے لئے فوجی تربیت بلاتخصیص لازمی قرار دی جائے۔ اور زنانہ تعلیم گاہوں میں نرسنگ کا کام طالبات کے لئے لازمی ہو۔

(۹) حکومت سے مطالبہ کہ زنانہ مدارس کے اساتذہ کو تعلیمی ترقی کرنے کے لئے سہولتیں مہیا کرے۔ انہیں تعلیمی وظائف دے۔ یا قرض حسنہ دے کر مزید تعلیم حاصل کرنے اور ترقی کرنے کے لئے مواقع بہم پہنچائے۔

کانفرنس کے یہ مطالبات واقعی بہت اہم ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا ہے۔ کہ ان میں سے اکثر امور حکومت کے مدِّنظر پہلے ہی سے ہیں۔ اور توقع ہے کہ جلد از جلد مناسب اقدامات ہوں گے۔

اُستادِ ریاضی

از مفتاح الدین ظفر

"جناب کی تعریف؟"

"بندہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں اُستاد ہے۔"

"کیا مضمون پڑھاتے ہیں آپ؟"

"مَیں ریاضی پڑھاتا ہُوں۔"

"ماشاء اللہ! کتنے سال سے پڑھا رہے ہیں آپ یہ مضمون؟"

"جی۔ یہی کوئی پندرہ سال سے!"

"پندرہ سال سے!! خوب!!! پھر تو آپ کو خوب مہارت ہوگئی ہوگی اِس مضمون میں؟"

"جی ہاں۔ آپ کی دُعا ہے پُوری چکرورتی مجھے رٹی ہُوئی ہے۔ اقلیدس کی ساری شکلیں ازبریاد ہیں۔ جتنے سوالات علم ہندسہ کے ہوسکتے ہیں ان کو آنکھ بند کر کے حل کرسکتا ہُوں۔ اَور الجبرا میں بھی اچھی خاصی مہارت ہے!"

"پھر تو آپ کے طلبا آپ سے بہت خوش رہتے ہوں گے اَور آپ کا نتیجہ بھی سَو فی صدی رہتا ہوگا؟"

"جی۔ آج کل کے لڑکے! خُدا ان سے بچائے۔ کام کرنا چاہتے نہیں اور اُستاد کا نام بدنام کرتے ہیں۔ جب ہم مڈل میں پڑھتے تھے تو ایک ایک وقت میں سَو سَو سوال حل کر کے اُستاد کے پاس لے جاتے تھے اور جامیٹری کی ساری شکلیں رٹ کر فر فر سُنا دیتے تھے۔ مگر آج کل کے طلبا تو نہ گھر پر کام کرتے ہیں اور نہ مدرسہ میں۔ اور چاہتے ہیں کہ نمبر سَو فی صدی لائیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ جہاں تک میری محنت کا سوال ہے' میرا مقولہ تو یہ ہے کہ پوری محنت کرو اور حلال کا پیسہ کھاؤ۔ مجال نہیں کوئی سوال لڑکے پوچھیں اور مَیں اس کو فوراً تختہ سیاہ پر حل نہ کر دُوں۔"

آپ کا خیال کیا ہے؟ کیا ریاضی کا ایک اُستاد جو صرف سوالات حل کرنے کی مشین جیسی حیثیت رکھتا ہو۔ ایک کامیاب اُستاد بن سکتا ہے؟

مَیں بھی پندرہ برس سے ریاضی پڑھا رہا ہُوں۔ مَیں نے ٹریننگ کالج میں اسی مضمون کو "مضمونِ خصوصی" کے طور پر لیا تھا میرے اُستادِ ریاضی ایک ماہر فن معلّم تھے۔ جو ولایت کی ایک مشہور درسگاہ میں تربیت حاصل کر چکے تھے۔ مجھے ریاضی پڑھانے میں جو دلچسپی پیدا ہوئی وہ شفیق اُستاد کے اسباق کا نتیجہ تھی۔ ان کے لیکچروں سے مجھ میں وہ خود اعتمادی' وہ جدّت پسندی اور وہ محل شناسی پیدا ہو گئی جو ریاضی کے ایک کامیاب اُستاد کے لئے لابُدی عناصر ہیں۔ ان کی قیمتی ہدایتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مَیں پُرانی لکیر کا فقیر نہ بنا' اور مَیں نے کورانہ تقلید سے پرہیز کیا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ مجھے آج تک ریاضی پڑھانے کے دَوران میں ناکامی اور خوف و ہراس سے دوچار نہیں ہونا پڑا اور کبھی کوئی ایسا موقعہ پیش نہیں آیا جبکہ میرے طلبا نے میرے اسباق میں دلچسپی نہ لی ہو وہ اپنا کام گھر سے کر کے نہ لائے ہوں' انہوں نے کام کی زیادتی کا رونا رویا ہو اور مجھے "آج کل کے لڑکوں" کی شکایت کرنی پڑی ہو!

ایک اچھے اُستاد ریاضی کی سب سے بڑی خصوصیت میں یہ سمجھتا ہوں کہ اُس میں خود اعتمادی کُوٹ کُوٹ کر بھری ہو ـــــ خود اعتمادی نفسِ مضمون میں، خود اعتمادی طریقۂ تعلیم میں اور خود اعتمادی اپنی ذات میں ـــــ جب تک اُستاد میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہوگی۔ اُس کے اور اُس کے طلبا کے درمیان ہمیشہ ایک زبردست خلا باقی رہے گا جس کو وہ کبھی بھی نہ پُر کر سکے گا۔ خود اعتمادی کی وجہ سے وہ بے تکلفی کے ساتھ بلا کسی جھجک کے درجے کا سامنا کر سکے گا۔ اور کبھی بھی پریشانی اور دِقّت سے دوچار نہ ہوگا۔ دوسری صورت میں اگر اُس کو خود اعتمادی حاصل نہیں ہے۔ خواہ نفس مضمون میں، خواہ طریقۂ تعلیم میں، خواہ خود اپنی ذات میں ـــ تو وہ ہمیشہ اپنے طلبا کا شاکی رہے گا اور طلبا اس کی شکایت کرتے رہیں گے!

جہاں تک نفس مضمون میں خود اعتمادی کا سوال ہے۔ اُس کا تعلّق اُستاد کے حاصل کردہ علم پر منحصر ہے۔ ٹریننگ کالج میں پہنچنے سے پہلے استاد یونیورسٹی کی جو کچھ تعلیم حاصل کر چکا ہے اس پر اس کی معلّمی کی قابلیّت کی داغ بیل پڑتی ہے۔ جیسا شاندار اس کا کالج اور اسکول کا زمانہ ہوگا ویسا ہی شاندار اس کا زمانہ درس وتدریس ہوگا۔ ٹریننگ کالج اس کے حاصل کردہ علم میں کچھ اضافہ کر سکتا ہے اور نہ اس میں کوئی کمی پیدا کر سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس کی تعلیمی قابلیت پر اُس کی نفس مضمون میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک فرسٹ کلاس استاد میں ایک تھرڈ کلاس استاد کے مقابلہ میں زیادہ خود اعتمادی ہوگی!

میرا خیال ہے کہ طریقۂ تعلیم میں خود اعتمادی اُستاد کے لئے ازبس ضروری ہے۔ یہ وصف کچھ تو ٹریننگ کالج کی زندگی کے دوران میں پیدا ہو جاتا ہے اور کچھ اُستاد کی ذاتی محنت کی بنا پر اُس کے زمانۂ معلّمی میں حاصل ہو جاتا ہے۔ اُستاد زمانۂ حال کے ماہرین تعلیم ریاضی کے خیالات سے کما حقہٗ واقف ہے۔ اُس نے خود ٹریننگ کالج کی زندگی میں اپنے

مضمونِ خصوصی" کے سلسلے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے ریاضی کے مختلف مضامین کی تعلیم پر طویل مقالے لکھے ہیں۔ اور اس کو خود طلبا کے پڑھانے میں لغزشوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس طرح وہ ریاضی کی تعلیم کے اکتسابی اور عملی اصولوں سے بدرجہ اتم روشناس ہے اب اُس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے اس علم سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائے اور اپنے اسباق میں ان کو برابر استعمال کرے۔ یہی نہیں بلکہ اِس کی بھی سخت ضرورت ہے کہ وہ روزانہ کے اسباق میں کوئی نہ کوئی ایسی بات معلوم کرتا رہے جو اُس کے طریقۂ تعلیم میں ممد و معاون ہو۔ اگر اُستاد میں ایک قابل اُستاد بننے کی صلاحیت موجود ہے تو اُس کو ہر ہر قدم پر کچھ نہ کچھ سیکھنے کے موقعے مِلتے رہیں گے۔ مختلف قسم کے بچّوں سے سابقہ پڑنے سے اس کو بچّوں کی نفسیات سے پُوری واقفیت ہو جائے گی۔ وہ بچّوں کی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ خود اپنی کمزوریوں سے بھی آشنا ہو جائے گا۔ اور اُس میں یہ قدرت پیدا ہو جائے گی کہ وہ اپنے اسباق میں زندگی پیدا کر سکے۔ ایسی زندگی جو درجے میں طلبا کی نفسیات سے اور ان کی قابلیّت سے مطابقت رکھتی ہو!

ریاضی کے ایک کامیاب اُستاد کے لئے اپنی ذات میں خود اعتمادی بہت ضروری وصف ہے۔ اس کے لئے اپنی ذاتی صلاحیتوں کا پُورا پُورا علم ہونا ازبس ضروری ہے۔ جب تک اس میں یہ خوبی نہ ہوگی اُس کا وجود طلبا کے واسطے ایک بے جان لاشہ کی مانند ہوگا جو مقررہ وقت پر ان کے سامنے پہنچ کر تضیع اوقات کر دیتا ہے اور بس۔ اُستاد ریاضی کا نہ صرف شعورِ ذات کا عاطفہ قوی ہوتا ہے بلکہ اس کے کردار کے وہ سب عواطف بھی اپنی اپنی جگہ قوی ہوتے ہیں جو اُس کو ایک بے مثل اُستاد، ایک شفیق رہبر اور ایک قابلِ تقلید ہستی بناتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کو اپنی جسمانی قوتوں پر بھی پُورا پُورا قابو ہوتا ہے۔ وہ تختۂ سیاہ کے استعمال میں مشّاق ہوتا ہے۔ پڑھانے اور گفتگو کرنے کے انداز

حقہ واقف ہوتا ہے۔ اور درجے کے سامنے مناسب موقعوں پر مناسب جسمانی حرکات
ں کمال رکھتا ہے۔ اور اِن سب باتوں کا مجموعی اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ تختہ سیاہ پر اپنی
ے، طلبا کے سامنے تقریر سے اور دورانِ سبق میں ڈرامائی انداز سے ریاضی کے خشک
د دلچسپ ترین سبقوں میں تبدیل کر سکتا ہے!!

آپ پُوچھ سکتے ہیں کہ ریاضی کی تعلیم میں کون سا طریقہ تعلیم بہترین ہے۔ میری
ئے یہ ہے کہ کسی ایک طریقہ کو اچھا کہنا اور دوسرے کو بُرا، ایک فاش غلطی ہے۔
ہے کہ ایک طریقہ تعلیم ایک موقعہ پر کامیاب ثابت ہو، لیکن دوسرے موقعہ پر
یقہ ناکام ہو۔ اُستاد کو سب طریقوں سے پُورے طور پر واقف ہونا ضروری ہے۔
بلکہ ان کو عملی طور پر استعمال کرنے میں بھی اس کو پُوری پُوری مہارت ہونی چاہیئے
میں اتنی صلاحیت موجود ہو کہ وہ اپنے طلبا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کوئی فوری طریقہ
تراع کر سکتا ہو! بظاہر یہ بات آسان معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن حقیقتاً آسان ہے
صاً اُن اُستادوں کے لئے جن کے وجودِ کامل میں خود اعتمادی کا جوہر بھرا ہُوا ہو!
ق اُستاد اپنے طلبا کی استعداد دیکھ کر فوراً ہی ایک نیا طریقہ تعلیم خود تخلیق کر سکتا
ماہرین تعلیم کی آرا سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت قائم رکھ سکتا ہے
ں کو اپنے طالب علموں کی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے برجستہ زبانی سوالات گھڑنے
میں طلبا کو مشق دینے میں کمال ہو سکتا ہے۔ مناسب سوالات کی مدد سے یہ معلوم
ں مہارت ہو سکتی ہے۔ کہ طلبا سبق کے کون سے حصے میں دِقت محسوس کر رہے
رکیوں؟ یا یہ کہ اس کی تعلیم کے کس حصہ میں وہ دلچسپی محسوس نہیں کر رہے ہیں
ں کو اپنے لئے بار سمجھ رہے ہیں!!

ریاضی کے اسباق میں مندرجہ بالا عام باتوں کے علاوہ چند گُر ایسے ہیں جن کو

مَیں خود اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر ریاضی کے اُستاد کے لئے ازحد ضروری خیال کرتا ہُوں۔ دراصل ان باتوں کا تذکرہ اسی مضمون میں کیا جا چکا ہے۔ لیکن اگر ہم ان کا ذکر یہاں پھر سے کر دیں تو بے جا نہ ہوگا ——

(۱) نیا سبق پڑھانے میں اُستاد کتاب کا دست نگر نہ رہے تو اچھا ہے۔ اس کو اتنی قدرت ہونی چاہیئے کہ زبانی سوالات کے طور پر خود زیادہ سے زیادہ سوالات اختراع کر سکے ایسے سوالات جو نئے ہوں، بچوّں کے ماحول سے مطابقت رکھتے ہوں، آسان ہوں اور دلچسپ ہوں۔ ان سوالات کی مدد سے وہ بچوّں میں نئے عنوان کی طرف توجہ اور دلچسپی پیدا کرا سکے گا۔

(۲) تختہ سیاہ کے استعمال میں اُستاد کو اچھی مہارت ہونا ایک لابُدی امر ہے۔ حقیقت میں تختہ سیاہ کا استعمال اُستاد کی سیرت کا پرتو ہے۔ ایک اچھا اُستاد تختہ سیاہ پر جو کام کرے گا وہ صاف ہوگا، خوشخط ہوگا، اچھی طرح سے مرتب ہوگا اور حد درجہ جاذب نظر ہوگا۔ جامیٹری کی شکلوں کو خاص طور پر صحیح اور صاف بنانے کی ضرورت ہے۔ اچھے اُستاد کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ دائروں کے بنانے اور خطوط کے کھینچنے میں ہر قسم پر پرکار یا اسکیل کی مدد لے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ ان کے استعمال سے سوائے تضیع اوقات کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان آلات کو بالکل ہی ترک کر دیا جائے۔ نہیں، نیچے درجوں میں ان کا استعمال اشد ضروری ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان درجوں میں بچےّ ان آلات کا استعمال سیکھتے ہیں اور جب تک اُستاد یہ نہ سکھائے گا دائرہ کس طرح کھینچیں، زاویہ کیسے بنائیں، خطوط کس طرح بنائیں اور ان کی لمبائیاں کیسے ناپیں اور پڑھیں وغیرہ تو اس وقت تک بچےّ جامیٹری بکس کا صحیح استعمال نہ کر سکیں گے۔

تختہ سیاہ پر شکلوں کے کھینچنے میں اُستاد کو چاہیئے کہ پتلی اور موٹی لکیریں، ٹوٹی

ہُوئے خطوط، دائروں کے قوس، خطوط کے ملنے کے نقاط، وغیرہ وغیرہ باتیں مناسب مقامات پر صاف اَور واضح طور پر بنائیے۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ جیسا کام تختہ سیاہ پر بچّوں کے سامنے پیش کرے گا۔ ویسے ہی کام کی تقلید کا بچّوں سے متوقع ہوگا۔

(۳) استاد تختہ سیاہ کو ایک خط کے ذریعے دو حصّوں میں بانٹ دے تو اچھا ہے ایک حصّہ "کچّے عمل" (Rough work) کے لئے مخصوص ہو اَور دوسرا "صاف کام" کے لئے۔ یہ طریقہ آج کل کے زمانے میں جب کہ کاغذ کی قلّت ہے مفید ہے۔ "کچّا عمل" ہرگز بھی گڑبڑ نہ ہو بلکہ وہ بھی صاف طور پر ترتیب وار درج ہو تاکہ دیکھنے والے کی طبیعت پر گراں نہ گذرے اَور اگر سوال کا حل غلط ہو تو طالب علم بھی اس کو دوہرا سکے اَور اپنی غلطی ٹھیک کر سکے۔

(۴) اُستاد کو چاہیئے کہ حساب کے طریقوں میں زمانہ حال کی تعلیم کے مطابق مختصر قاعدے سوالوں کو حل کرنے میں استعمال کرے۔ لمبے لمبے قاعدوں سے سوال حل کرنا نفسیات کی رُو سے اَور حساب کے اصولوں سے اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو ان سے وقت ضائع ہوتا ہے۔ اَور دوسرے یہ کہ بچّوں کے دماغ کو وہ تربیّت نہیں ملتی جو ریاضی کی تعلیم سے اُمید کی جاتی ہے۔ آج کل ریاضی کی تعلیم کا اصول یہ ہے ۔ "جلدی سے اَور آسانی سے"۔ ایک طالب علم اگر ایک سوال کو جلدی اَور آسانی سے حل کر سکتا ہے تو وہ یقیناً اُس طالب علم سے حساب میں تیز ہے جو اُسی سوال کو دیر میں اَور لمبے طریقے سے حل کرتا ہے۔

(۵) بچّوں کی کاپیوں کی تصحیح کا مسئلہ بھی خاص طور پر اُستاد کی توجہ کا محتاج ہے ہفتہ میں ایک بار تو ضرور اُستاد کاپیوں کا معائنہ کرے۔ کاپیوں کو دیکھنے سے اس کو نئی باتیں معلوم ہوں گی جن پر شاید درجے میں اس کی نظر نہیں پڑ سکی تھی۔ اس کو چاہیئے۔ کہ گندے، لاپرواہی سے کئے ہُوئے، بدخط، غیر مرتب اَور غلط کام کو کسی طور پر بھی نظر انداز

نہ کرے بلکہ طالب علموں کو تنبیہ کرے اور ان کی عادت ڈلوائے کہ وہ کام میں دلچسپی لیں اور اسے صاف، خوشخط، ترتیب وار اور صحیح طور پر کاپی پر لکھیں اگر کسی طالب علم کا کام بالکل ہی خراب ہے تو بہتر یہ ہے کہ استاد اس کو کاٹ دے اور اصرار کرے کہ وہی کام پھر سے کاپی پر اس کی ہدایات کے مطابق کیا جائے اور اس کو دکھایا جائے۔

کاپیوں کی تصحیح کے لئے اگر استاد کچھ "نشانات" مقرر کر لے اور ان کو اپنے طلبا کو سمجھا دے تو اچھا ہے۔ اس سے اس کا کام بھی کم ہو جائے گا اور بچوں کو آسانی بھی رہے گی۔ راقم الحروف نے جو اشارات مقرر کر رکھے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:-

نشان	مطلب
؟	یہاں آپ کچھ کہنا چھوڑ گئے ہیں۔ غور سے دیکھو اور اسے لکھو۔
~~	یہ عبارت غلط ہے اس کی تصحیح کرو۔
|×	یہ پورا شذرہ نظر ثانی کا محتاج ہے۔ تمہارے دلائل غلط ہیں۔
گ ن د ہ	تمہارا عمل گندہ اور ناصاف ہے۔ ترتیب بھی اچھی نہیں ہے اس طرف توجہ دو۔
شکل؟	یہاں شکل کی ضرورت ہے۔ یا یہ شکل جو تم نے بنائی ہے غلط ہے اسے پھر سے بناؤ۔
پنسل سے؟	یہ شکل تم نے پنسل سے کیوں نہیں بنائی۔ جامیٹری کی شکل ہمیشہ سیاہ سیسہ کی پنسل سے بناؤ۔
× دوبارہ	اس کام کو دوبارہ صاف اور صحیح طور پر اپنی کاپی پر لکھو اور مجھے دکھاؤ۔

اگر اسی قسم کی ایک فہرست تیار کر کے درجے میں کسی مناسب جگہ پہ آویزاں کر دی جائے، جہاں پر طلبا اس کو اپنے فرصت کے اوقات میں دیکھ سکیں تو مناسب

اگر پورے مدرسہ میں سب ریاضی کے اُستاد ایک ہی قسم کے نشانات مقرر کر لیں تو بہت ہی اچھا ہے۔ تاکہ جب بچے ایک درجے سے دوسرے درجے میں جائیں تو وہ نئے اُستاد کی نئی اصطلاحیں سیکھنے سے بچ جائیں۔

بچوں کو گاہے بگاہے ریاضی جیسے "خشک اور سخت" مضمون کی اہمیت پر اہم باتیں بتاتے رہنا اور ان کو دنیا کے بڑے بڑے ریاضی دانوں کے خصوصاً مسلم ماہرین ریاضیات کے حالات سُناتے رہنا بھی مفید ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ ہم اپنے بچوں میں پھر سے وہ جوش و خروش اور وہ اعتماد کُوٹ کُوٹ کر بھر دیں جو مسلمانوں کا طرّۂ امتیاز ہے۔ اور جس کی بدولت مسلمانوں نے علم ریاضیات میں کمال حاصل کر لیا تھا اور جو "ابنائے وطن" کی غیر ہمدردانہ حرکتوں کی وجہ سے ختم ہو چلا تھا۔

صحت بخش خوراک

ڈاکٹر محمد موسےٰ خاں

دنیا کی جدوجہد بڑی حد تک پیٹ کی خاطر ہے۔ یہاں سب پیٹ کے دھندے میں مصروف ہیں۔ اور ہر ایک کام روٹی کی خاطر ہی کیا جاتا ہے اور ہر فرد روٹی کیلئے کام کرتا ہے۔ عموماً لوگ محض پیٹ بھرنے کی خاطر جو کچھ سامنے آتا ہے۔ کھا چھوڑتے ہیں۔ اور کبھی دل میں خیال نہیں لاتے۔ کہ جسمانی اور دماغی صحت کے قیام و توازن کے لئے غذا کیسی اور کس قدر مطلوب ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ روزمرّہ کی کھانے پینے کی چیزوں کے متعلق اُن کو سب کچھ معلوم ہے۔ اور اِس بارے میں اُنہیں ماہرینِ غذا کے لیکچر یا نصیحتیں سُننے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن وہ غلطی پر ہیں شائد انہیں یہ معلوم نہیں کہ خوراک کا بھی ایک باقاعدہ علم ہے۔ اس کی تحصیل ضروری ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں کی غذائی خوبیوں کی بابت ضروری واقفیت لازمی ہے۔ کیونکہ جسمانی اور دماغی صحت و توازن صحیح اور مناسب خوراک پر منحصر ہے۔ اچھی یا متوازن خوراک کے اندر بے شمار خوبیاں ہوتی ہیں۔ موزوں قسم کی خوراک ہی طبیعت انسانی کو اعتدال پر رکھتی ہے۔

خوراک کے مقاصد | جسم کی نشو و نما اور اِس کی اصلاح و ترمیم کے لئے ضروری مصالحے کی فراہمی، کام کرنے کے لئے طاقت اور بدن کو گرم رکھنے کے لئے حرارت

غریزی کا مہیا کرنا، خوراک کے بڑے مقاصد ہیں۔

خوراک کے اجزا | پیشتر اس کے کہ متوازن خوراک کے متعلق کچھ تفصیل سے بیان کیا جائے۔ یہ جاننا ضروری ہے۔ کہ انسانی خوراک میں کیا کیا اجزا ہوتے ہیں اور یہ ہمیں کن کن اشیاء سے حاصل ہوتے ہیں۔ ہماری خوراک معجون مرکب ہے۔ جو چھ مختلف اجزا سے مل کر بنتی ہے۔ ان کے نام اور ذرائع حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ **جسمیات**۔ یہ دال۔ گوشت۔ انڈے اور دودھ وغیرہ میں ملتے ہیں۔ اور جسمانی تعمیر کا سب سے بڑا مصالحہ انہی سے حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ **نمکیات**۔ اِن میں مختلف قسم کے نمک شامل ہیں۔ مثلاً چونا۔ فاسفورس کلورین۔ آیوڈین۔ فولاد وغیرہ۔ یہ دودھ اور سبزیوں خاص کر پتے والی سبزیوں اور پھلوں وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ دانتوں اور ہڈیوں کی ساخت میں اِنکا بڑا حصّہ ہے۔

۳۔ **کاربنیات**۔ مثلاً نشاستے اور شکر۔ یہ مختلف قسم کے غلّوں مثلاً گیہوں جَو۔ باجرہ۔ مکی اور چاول اور میٹھی اشیا یعنی گُڑ اور کھانڈ میں ملتے ہیں۔

۴۔ **روغنیات**۔ اِن میں چربی۔ تیل۔ گھی۔ مکھن وغیرہ شامل ہیں۔ کاربنات اور روغنیات دونوں مل کر ایندھن یا خوراک کہلاتے ہیں۔ یہ بدن کو گرم رکھنے کے لئے حرارت اور کام کرنے کے لئے طاقت بہم پہنچاتے ہیں۔

۵۔ **حیاتین**۔ یہ خوراک کے لطیف اجزا ہیں۔ اگر ان کو خوراک کی روح رواں کہا جائے۔ تو بالکل بجا ہوگا۔ اِن کی نہائیت قلیل مقدار میں بدن کو ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی خوراک اِن کے بغیر مکمل و موزوں نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ اِن کے بغیر نشو و نما صحت اور زندگی کا قیام ناممکن ہے۔ یُوں تو اِن کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن اِن میں سے مشہور، بہت ضروری اور کارآمد پانچ ہیں۔ جن کے نام

روف تہجی پر رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً۔ حیاتین "ا" "ب" "ج" "د" اور "ی"۔ مندرجہ ذیل بیان سے آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ آپ اپنی روزمرہ کی خوراک میں اُن کو کھانے پینے کی کن کن چیزوں سے اور کیونکر حاصل کر سکتے ہیں۔

حیاتین "ا":۔ یہ جسم کی نشو و نما اور صحت کے قیام کے لئے ضروری ہے خاص طور پر آنکھوں پھیپھڑوں۔ جلد اور مثانے کو درست حالت میں رکھتی ہے۔ یہ دُودھ اور خالص دُودھ سے بنی ہوئی تمام اشیاء میں پائی جاتی ہے مکھن اور دُودھ کے اندر بکثرت ہوتی ہے۔ ہرے پتّوں والی سبزیوں مثلاً پالک میتھی۔ خرفہ۔ بند گوبھی وغیرہ کے اندر افراط سے ملتی ہے۔ گاجروں کے اندر بھی بکثرت پائی جاتی ہے مچھلیوں کے تیل خصوصاً کاڈ لور آئل اور ہیلی بیٹ لور آئل اِس حیاتین سے مالا مال ہوتے ہیں۔ انڈے بھی اِس کے حصول کا اچھا ذریعہ ہیں۔ جگر یا کلیجی بھی اِس سے بھرپور ہوتی ہے۔

حیاتین "ب":۔ یہ بھی صحت اور زندگی کے قیام کے لئے اشد ضروری ہے۔ اعضائے رئیسہ خصوصاً دماغ۔ دل۔ جگر اور گُردوں کو درست حالت میں رکھتی ہے۔ حیاتین "ب" صرف ایک حیاتین نہیں بلکہ کئی حیاتینوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں سے دو مشہور ہیں۔ حیاتین "ب نمبر ۱" جس کی کمی سے بیری بیری کی بیماری ہو جاتی ہے۔ اِسے تھایا مین بھی کہتے ہیں۔ اور حیاتین "ب نمبر ۲" جس کی پھر کئی قسمیں ہو جاتی ہیں جن میں سے دو مشہور ہیں۔ یعنی ربوفلیوین اور نکوٹینک ایسڈ۔ اِن میں سے ربوفلیوین کی کمی سے ہونٹوں کے کنارے سُوج جاتے ہیں۔ اور زبان پر بھی ورم سا ہو جاتا ہے اور آنکھوں سے پانی بہنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور نکوٹینک ایسڈ کی کمی سے

ایک خطرناک بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ جسے پیلاگرا کہتے ہیں۔ حیاتین ب کی ان دونوں قسموں کے ذریعے مندرجہ ذیل ہیں:۔

حیاتین ب نمبر ۱ یا تھایامین	اناجوں اور دالوں کے چھلکے۔ ہری ساگ والی سبزیاں دودھ انڈے۔ جگر۔ دل۔ دماغ اور مغزیات۔
حیاتین ب نمبر ۲ یعنی ربوفلیوین اور نکوٹینک ایسڈ	دودھ۔ خمیر (Yeast.) انڈے۔ بغیر چربی کا گوشت۔ مچھلیاں اور ہرے پتوں والی سبزیاں۔

حیاتین ب ہر قسم کے اناجوں اور مختلف دالوں میں خاص کر ان کے چھلکوں میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔ مثلاً گندم۔ جو۔ باجرہ۔ چاول وغیرہ اگر اپنی اصلی حالت میں کھائے جائیں۔ تو اس کا اچھا ذریعہ ہیں لیکن میدہ اور چمکیلے چاول یعنی مشینی چاول جن کے چھلکوں کو خاص طور سے علیحدہ کر دیا گیا ہو۔ اس سے خالی ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کی دالیں ماش۔ مونگ۔ ارہر۔ چنے۔ مسور۔ مٹر وغیرہ اس حیاتین سے مالا مال ہوتی ہیں۔

حیاتین "ج":۔ خون کو مصفا حالت میں رکھتی ہے۔ یہ حیاتین نہایت نازک واقع ہوئی ہے۔ گرمی اور حرارت برداشت نہیں کر سکتی۔ اشیاء خوردنی کے پکانے اور اُبالنے سے یہ بڑی حد تک ضائع ہو جاتی ہے۔ برخلاف اس کے دیگر حیاتین کھانا پکانے سے ضائع نہیں ہوتے۔ یہ حیاتین صرف تازہ سبزیوں اور پھلوں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے حصول کے لئے تازہ سبزیوں مثلاً گاجر۔ مولی۔ ٹماٹر۔ سلاد۔ دھنیا اور پودینہ وغیرہ کو کچا کھانا ضروری ہے۔ یوں تو یہ ہر قسم کے تازہ پھلوں میں پائی جاتی ہے۔ لیکن نیبو۔ میٹھے۔ سنگترے۔ امرود اور آملے خاص طور سے اس کا بیش قیمت

ذریعہ ہیں۔ آملے میں حیاتین "ج" سب سے زیادہ ہوتی ہے یعنی ایک چھوٹے سے آملے میں دو سنگتروں کے برابر حیاتین "ج" ہوتی ہے۔

حیاتین "د":۔ یہ ہڈیوں اور دانتوں کی صحت کی معاون ہے۔ ہوا اور پانی کی طرح قدرت اس حیاتین کو ہمارے لئے مفت بھی مہیا کرتی ہے سورج کی شعاعیں جب ہمارے بدن کی کھال پر پڑتی ہیں۔ تو اُن کے اثر سے بدن میں خود بخود پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ننھے بچے جو دھوپ میں کھیلتے پھرتے ہیں۔ یا جن کے بدن کا کچھ حصّہ کھُلا ہوتا ہے۔ اور جو لوگ باہر پھرتے اور کام کرتے ہیں۔ وہ قدرت کے اِس بیش بہا عطیّے سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ پردہ نشین مستورات کو اور اِن عورتوں کو اور بچّوں کو جو تنگ و تاریک مکانات میں رہتے ہیں۔ دن کے کسی نہ کسی حصّے میں ضرور دھوپ سینکنی چاہیئے۔ یا کم از کم بدن کے مختلف حصّے کچھ دیر کے لئے دھوپ میں کھولنے چاہئیں۔ اِس کے علاوہ یہ حیاتین دُودھ۔ مکھن۔ گھی۔ انڈے۔ چربی۔ جگر اور مچھلی کے تیلوں خصوصاً کوڈ لِور آئیل اور ہیلی بیٹ لِور آئیل میں حیاتین "ا" کی طرح بکثرت ملتی ہے۔

حیاتین "ی":۔ قوتِ تولید کے لئے ضروری ہے۔ اِس کی کمی سے نر اور مادہ بانجھ ہو جاتے ہیں۔ یہ حیاتین بھی دُودھ۔ انڈے۔ اناجوں اور ہرے پتّے والی سبزیوں میں بکثرت پائی جاتی ہے۔

(۶) پانی زندگی کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اور یہ خوراک کا اشد ضروری حصّہ ہے۔

غذائی اصطلاح میں صحت بخش اور ہر لحاظ سے مکمل۔ خوراک کو متوازن خوراک کہتے ہیں۔ اِس میں شخصی ضروریات کی بنا پر خوراک کے جملہ اجزا صحیح تناسب

ں پائے جاتے ہیں۔ یہ مقدار میں اتنی کافی ہونی چاہیئے۔ کہ کھانے والے کو
بھوک کی شکایت باقی نہ رہے۔ اور اوصاف کے لحاظ سے اس میں مندرجہ بالا
ہ اجزا ٹھیک مقدار میں موجود ہونے چاہئیں۔ ہماری خوراک عام طور سے مندرجہ
یل اشیاء پر مشتمل ہوتی ہے:-

۱) مختلف قسم کے اناج مثلاً گیہوں۔ جو۔ باجرہ۔ مکئی وغیرہ۔
۲) مختلف قسم کی دالیں مثلاً ماش۔ مونگ۔ چنے۔ ارہر وغیرہ۔
۳) سبزیاں۔
۴) گوشت مچھلی۔ انڈے وغیرہ۔
۵) گھی۔ مکھن۔ تیل۔ وغیرہ۔
۶) دودھ۔
۷) میٹھا۔
۸) پھل۔
۹) مصالحہ جات۔

مختلف اشیاء کی غذائی طاقت مختلف ہوتی ہے۔ کسی کے اندر کوئی اجزا زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور کسی کے اندر کوئی۔ سوائے دودھ کے کوئی ایک قدرتی خوراک ایسی مکمل نہیں ہے۔ جس کے اندر چھ مطلوبہ اجزا جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ درست مقدار اور صحیح تناسب میں پائے جاتے ہوں۔ اس لئے ہم مختلف چیزوں کو ملا جُلا کر اور ادل بدل کر کے کھاتے ہیں۔ تاکہ مختلف ذرائع سے مل جُل کر مطلوبہ اجزا ہمیں مناسب مقدار میں حاصل ہوجائیں۔

اس گرانی کے زمانے میں ہمیں علم غذا کے چند سنہری اصولوں کا علم ہونا لازمی ہے۔ تاکہ اُن پر عمل پیرا ہو کر کم سے کم لاگت میں ہم اپنے اور اپنے عزیزوں

کے لئے بہتر اور متوازن خوراک کا اہتمام کر سکیں۔

ذیل میں چند موٹے موٹے اصول بیان کئے جاتے ہیں۔ جن پر عمل پیرا ہو کر بہترین صحت کے علاوہ ہم کو بہت سا اقتصادی فائدہ بھی حاصل ہو سکتا ہے

(۱) اناجوں کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سوائے معمولی فرق کے مختلف قسم کے اناجوں مثلاً گیہوں۔ جَو۔ چاول۔ مکی۔ باجرہ وغیرہ میں غذائی طاقت تقریباً ایک جیسی ہوتی ہے۔ لیکن کئی اناج دوسروں سے کافی سستے مل سکتے ہیں اس لئے وہ خوشی سے استعمال کرنے چاہئیں۔ اور وقتی ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنے ذائقے اور ہاضمے کو اُن کے استعمال کا عادی بنا لینا چاہیئے مثال کے طور پر چاول ہی کو لیجئے۔ یہ سب اناجوں سے بلحاظ غذائی طاقت بہت گھٹیا ہے۔ لیکن قیمت میں سب سے گراں ہے۔ غذائیت کے لحاظ سے ہاتھ کی چکی یا خراس کا پیسا ہوا آٹا مشین کے باریک آٹے کی نسبت بہتر ہوتا ہے۔ اور میدے سے تو بدرجہا بہتر ہے۔ اسی طرح مشین کے چمکیلے چاول اوکھلی کے کوٹے ہوئے چاولوں کے مقابلے میں گھٹیا ہوتے ہیں۔

(۲) دالوں کا بھی یہی حال ہے۔ کئی دالیں دوسروں سے کافی سستی ہوتی ہیں غذائی طاقت میں دالیں تقریباً ایک جیسی ہوتی ہیں۔ لیکن چھلکے والی دالیں دَلی ہوئی دالوں سے زیادہ مقوی ہوتی ہیں۔ اور بازار میں سستی بھی بکتی ہیں۔

(۳) سبزیوں کے متعلق یہ گُر یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ غذائی طاقت کے لحاظ سے سبزیوں کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ ان میں اوّل نمبر ہرے پتّے والی سبزیاں ہیں۔ مثلاً پالک میتھی۔ قلفے کا ساگ۔ سرسوں اور چنے کا ساگ وغیرہ دوسرے نمبر پر وہ سبزیاں آتی ہیں۔ جو پتّوں والی اور جڑوں والی سبزیوں کے بین بین ہیں۔ جیسے بھنڈی۔ کریلے۔ بینگن۔ گھیا۔ کدّو وغیرہ۔ جڑوں والی

زمین کے اندر اُگنے والی سبزیوں کا تیسرا درجہ ہے۔ مثلاً آلو۔ کچالو۔ اروی۔
شقندر اور شلغم وغیرہ۔ قیمت کے لحاظ سے بھی اول درجے کی یعنی ساگ کی قسم کی
سبزیاں باقی سبزیوں سے سستی ہوتی ہیں۔

(۴) گوشت بھی بے حد مہنگا ہے۔ لیکن کئی قسم کا گوشت مثلاً کلیجی۔ دل۔ گردے
اوجھڑی اور سری اب بھی عضلاتی گوشت سے سستے بکتے ہیں۔ اور عضلاتی گوشت سے
کہیں زیادہ فائدہ مند ہیں۔ غذائیت کے لحاظ سے بڑے اور چھوٹے گوشت میں
خاص فرق نہیں ہوتا۔ لیکن بڑا گوشت کم خرچ بالا نشین ہے۔ یعنی قیمت میں بھی
کم ہوتا ہے۔ اور چربدار ہونے کی وجہ سے گھی وغیرہ کی کمی کو بھی پورا کر دیتا ہے۔

(۵) گھی اور مکھن تو بہترین چیزیں ہیں۔ لیکن اگر بناسپتی گھی ہی استعمال کرنا
پڑے۔ تو اس کی نسبت عام تیل مثلاً سرسوں یا تلوں کا تیل استعمال کرنا زیادہ بہتر
ہے۔ کیونکہ غذائیت کے لحاظ سے بناسپتی گھی اور عام تیل ایک جیسی طاقت رکھتے ہیں
دونوں کے دونوں حیاتین "ڈ" اور "د" سے مبرا اور خالی ہوتے ہیں۔ جو گھی اور
مکھن میں پائی جاتی ہیں۔

(۶) دودھ بہترین غذا ہے لیکن بے حد گراں ہے۔ جو اصحاب خالص دودھ
نہیں خرید سکتے۔ وہ مکھن نکلا ہوا دودھ استعمال کر سکتے ہیں۔ گو یہ غذائی لحاظ سے
خالص دودھ کی نسبت گھٹیا ہوتا ہے۔ لیکن پھر اس میں سوائے مکھن کے باقی دودھ
کی سب خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ اسی زمرے میں لسی اور چھاچھ بھی آتی ہے۔ جو عام
طور سے گاؤں میں اور بسا اوقات شہروں میں بھی ہمسایوں سے مفت مل سکتی ہے
ان سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

(۷) مٹھاس کے زمرے میں گڑ اور دیسی شکر بہترین چیزیں ہیں۔ اور غذائی خوبیوں
کے لحاظ سے سفید چینی یا کھانڈ سے بہتر بھی ہوتی ہیں۔ اور سستی بھی۔ کیونکہ چینی صوفی صدی

مٹھاس ہے۔ لیکن گُڑ اور شکر میں مٹھاس کے علاوہ دیگر غذائی خوبیاں بھی موجود ہیں مثلاً
اِس کے اندر چُونے۔ فاسفورس اور فولاد کے قیمتی نمک پائے جاتے ہیں۔ اور کچھ حیاتین
بھی مِل سکتی ہیں۔ اِس لحاظ سے گُڑ اور شکر کم خرچ اور بالا نشین کا مصداق ہیں۔

(۸) پھل سب ہی اچھے ہیں مگر انتہائی گرانی کے باعث پھلوں کا استعمال غریبوں
کی طاقت سے باہر ہو گیا ہے۔ وہ پھلوں کی بجائے سبزیوں کا "سلاد" استعمال کر سکتے ہیں
مثلاً گاجر۔ مولی۔ککڑی۔کھیرے۔ ٹماٹر۔ پیاز وغیرہ کے ٹکڑے کر لئے جائیں پھر کھانے
کے ساتھ کچے کھائے جائیں۔ اور ہرے دھنیئے یا پودینے کی چٹنی اِن کے ساتھ مِلالی جائے
تو نہایت مزیدار چیز دستر خوان کی رونق بن جاتی ہے۔ قدرت نے اِن سب میں
پھلوں جیسے جوہر پیدا کر رکھے ہیں۔

اپنی روز مرّہ کی خوراک میں اگر آپ مندرجہ بالا چند سادہ اصولوں کو مدِّ نظر
رکھیں۔ تو کم سے کم لاگت میں متوازن خوراک حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اِسے کھاکر
بہترین صحت کی برکتوں سے مالا مال ہو سکتے ہیں۔

اسکول میں آرائش

از محمد مظفر الدین

خوبصورتی ایک ایسا وصف ہے کہ ہر انسان بے ساختہ اس سے متاثر ہوتا اور اس کی جاذبیت سے اس کی طرف متوجہ اور مائل ہوتا ہے۔ خوبصورت چیز سے انسان کا دل نہیں بھرتا۔ اور اسے دیکھ دیکھ کر طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

جمادات، نباتات اور حیوانات کی دنیا میں یہی اصول کارفرما ہے یہ سب اپنے حسن و خوبی کی جاذبیت کے باعث ہی دنیا کے لئے توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

معلمین کو بھی قدرت کے اس اصول سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اور مدرسہ میں کشش پیدا کرنے کے لئے اسے آرائش و زیبائش کے ذریعے خوبصورت بنانا چاہیئے۔

آرائش و زیبائش ہر جگہ پائی جاتی ہے۔

آرائش و زیبائش قدرتی نظام کے ہر حصے میں ظاہر ہے۔ چنانچہ نیلگوں آسمان کو چاند اور ستاروں سے آراستہ کیا ہے۔ زمین کو ہزارہا اقسام کے پودوں اور درختوں سے مزین کیا ہے ۔

رنگین کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت پہنا کے لال جوڑا شبنم کو آرسی دی

پرندوں کو دیکھا جائے تو وہ بھی اپنے گھونسلے نہائیت خوبصورت طریقے سے بناتے ہیں۔ تنکوں کو ایسے قرینے اور ترتیب سے رکھتے ہیں کہ ان کے گھونسلے جاذب نظر ہوتے ہیں۔ چنانچہ بیا کا گھونسلہ اپنا نمونہ آپ ہے۔

دنیا میں تقریباً ہر شخص آرائش کرتا ہے۔ چاہے وہ تھوڑی ہو یا زیادہ۔ مرد نہا دھو

اپنے بال بناتا ہے۔ داڑھی رکھی ہو تو اس کو صاف کرتا ہے۔ داڑھی رکھنے سے تعرض ہو تو اس کو مونڈھتا ہے۔ داتن منجن کے ذریعے اپنے دانت صاف کرتا ہے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہے۔ پگڑی کا عادی ہو تو اس کو مایہ لگا کر کلاہ پر باندھتا ہے۔

عورتیں اپنے ہاتھ منہ صاف رکھتی ہیں۔ حسب توفیق منہ پر کریم یا سرخی لگاتی ہیں سک ملتی ہیں۔ آنکھوں میں کاجل لگاتی ہیں۔ اپنے سر کے بال تیل لگا کر بناتی ہیں۔ ان میں مانگ نکالتی ہیں۔ پیچھے پراندہ باندھتی ہیں۔ اور اس طرح بناؤ سنگار کرتی ہیں۔ مائیں اپنے بچوں کو اسی طرح آراستہ کرتی ہیں۔ یہ سب کچھ آرائش ہی ہے۔

شہروں میں دکاندار اپنی دکانوں کو سجا کر رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے دوکاندار سامنے کی دیواروں میں شیشے لگا کر ان میں قرینے سے چیزیں رکھتے ہیں۔ پودوں کے گملے بھی رکھتے ہیں۔ اچھی سجی ہوئی دکان میں خواہ مخواہ اندر جانے کو دل چاہتا ہے۔ اور اس طرح دکانوں میں گاہکوں کے لئے کشش پیدا ہوتی ہے۔

جاہل عورتیں بھی اپنے اپنے گھروں کو آراستہ کرتی ہیں۔ وہ اگر غریب ہوں۔ اور چونے کے خرچ کی متحمل نہ ہو سکتی ہوں تو چکنی مٹی سے اس کی دیواروں کو مصفا کرتی ہیں۔ فرش پر گوبری کرتی ہیں۔ دیواروں کے ساتھ دیوارگیر لگا کر یا گھر میں الماریاں ہوں تو الماریوں میں اور دودکش کے ساتھ دیواری انگیٹھی ہو تو اس انگیٹھی پر خوبصورت کپڑا لٹکا کر اس کے اوپر رکابیاں۔ تھالیاں۔ گلاس۔ چمچے۔ پلیٹے دانی۔ پیالیاں وغیرہ قرینے سے لگاتی ہیں۔ پنکھیوں پر دلفریب کنارے لگا کر انہیں دیواروں پر آویزاں کرتی ہیں۔ اور اس طرح اپنے گھروں کو آراستہ و پیراستہ کرتی ہیں۔

مدرسہ ایک ایسی جگہ ہے۔ جہاں انسانیت پرورش پاتی ہے۔ اس پرورش کے لئے بھی جاذبیت بہت ضروری ہے۔ ورنہ اس کی طرف کوئی توجہ نہیں ہو سکتی۔ مدرسہ صاحبان کو بھی اپنے اپنے مدارس کو آراستہ کر کے دلفریب اور جاذبِ نظر بنانا چاہیئے۔

سکولوں میں آرائیش کے فائدے۔

آرائیش سے سکولوں کو کئی فائدے ہوتے ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں:۔

(۱) فراہمی طلبا اور حاضری میں امداد۔

آرائیش اگر اچھی ہو اور اعلےٰ پیمانہ پر کی جائے تو یہ لڑکوں اور لوگوں کے لئے بڑی کشش کا باعث ہوتی ہے۔ مدرسے کو بچوں کے لئے دلچسپ جگہ بناتی ہے۔ جس سے وہ جوق جوق مدرسے میں آتے ہیں۔ اور اس کی حاضری اور تعداد میں اضافہ کرتے ہیں چنانچہ کئی غیر آباد سکول آرائیش کے بعد آباد ہو گئے ہیں۔

(۲) جاہل اور بڑی عمر کے لوگوں میں مدرسہ کے لئے دلچسپی۔

آرائیش مدرسہ بڑی عمر کے لوگوں کی طبائع پر بھی خوشگوار اثر کرتی ہے۔ آرائیش سے مقام درس کے دلکش بن جانے پر اس کی اہمیت ان کی نظروں میں قائم ہوتی ہے۔ ان کا اکثر وہاں جانے کو دل چاہتا ہے۔ علاقہ کے جاہل لوگوں کے لئے بھی کشش پیدا ہوتی ہے۔ یہاں آنے جانے سے مدرسے کے لئے ان کے دلوں میں قدر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ بھی اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض علاقوں کے سکولوں میں عملی طور پر ایسا دیکھنے میں آیا ہے۔

(۳) آرائیش سکول کے لئے زبردست پروپیگنڈا کا کام کرتی ہے۔ اسے کامیاب بنانے میں مد ہوتی ہے۔ مدرس کی عزت وناموس میں اضافہ کرتی ہے۔ لوگوں میں تعلیم کے لئے شوق پیدا کرتی ہے۔

(۴) ماحول کا اثر۔

بچے کی تربیت پر ماحول یعنی ارد گرد کی اشیاء کا اثر پڑتا ہے۔ اگر وہ اچھی چیزیں دیکھے گا۔ تو خود بھی اچھی چیزوں کو رکھنا پسند کرے گا۔ سکول میں جیسی چیزیں دیکھے گا۔ اپنے گھر میں آکر نقل کرنے کی کوشش کرے گا۔ خربوزہ سے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے چنانچہ

میری اپنی مثال لیجئے۔ میرے بچے نے جسے میرے ساتھ چند سکولوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ گھر آکر اپنے گھر میں اسی قسم کے قطعات اور چارٹس بنا کر آویزاں کئے۔ جیسے کہ اس نے باہر مدرسوں میں دیکھے۔ مثلاً "ہمیشہ سچ بولو"۔ "صاف رہو"۔ "آج کا کام کل پر نہ چھوڑو"۔

مدرسے کے اخلاقی سبق آموز قطعات دیکھ کر بچے کے دل میں نیک باتوں کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ جو اس کے اخلاق پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چارٹوں کی صفائی اور ان کی ترتیب سے اس کے دل میں قرینے اور سلیقے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اس میں انتخاب۔ صفاپسندی اور نفاست کے مذاق کی تربیت ہوتی ہے۔ جو اس کی آئندہ زندگی میں کام آنے والی چیز ہے۔ ابھارنے والے قطعات اور چارٹس لڑکوں کے دلوں میں ترقی کے لئے جوش پیدا کرتے ہیں۔

(۵) تعلیم میں آسانی۔

اگر استاد مختلف مضامین سے متعلق چارٹس بنا کر کمروں میں آویزاں کرے تو لڑکے ان کو دیکھ کر خود بخود بہت سی باتیں غیر شعوری طور پر سیکھ جاتے ہیں۔ ہر ایک چارٹ بذاتِ خود ایک استاد بن کر مدرس کی معاونت میں ساعی رہتا ہے۔ اور ہر وقت اپنے حالات کا سبق پڑھاتا رہتا ہے۔ اسباق پڑھاتے وقت استاد اپنے تیار کردہ چارٹس سے مدد لے سکتا ہے۔ اور ان کے ذریعے اپنے اسباق کو سہل اور دلچسپ بنا سکتا ہے۔ چارٹس میں لکھی ہوئی باتوں کو بار بار سوچنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان کے تیار کرنے کے لئے استاد کو مختلف کتب کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ جس سے اس کی اپنی علمیت میں وسعت پیدا ہوگی۔

علاوہ ازیں چارٹس کے ذریعے جو باتیں پڑھائی جاتی ہیں۔ وہ زیادہ دیر تک یاد رہتی ہیں۔ بچہ کتاب سے بھاگتا ہے۔ لیکن چارٹ سے محبت کرتا ہے اور اس

یدہ اُٹھاتا ہے۔

ارس میں آرائش کیسی ہونی چاہیئے۔

ہر ایک چیز کی جو مدرسہ میں ہو کوئی نہ کوئی غرض ہونی چاہیئے۔ بغیر غرض کے کوئی
یز مدرسہ میں نہیں رکھنی چاہیئے۔ چنانچہ مدارس میں آرائش بھی تعلیمی ہونی چاہیئے۔
طعات سبق آموز ہوں۔ دیہات سدھار اور تعمیر ملت سے متعلق ہوں۔ چارٹس اور اشیاء
علیم میں مدد دینے والی اور معلومات افزا ہوں۔ مفید تصاویر۔ نقشے۔ نظارے اور ماڈل
ہوں تعلیمی کھلونے ہوں۔ تعلیم کو دلچسپ بنانے کے وسائل تعلیمی کھیلوں کا سامان اور
نقردن اشیاء ہوں۔ آلات کی اشکال ہوں۔

دیہاتی مدارس میں آرائش کی اشیاء کو دیہاتی ماحول سے بھی متعلق ہونا چاہیئے۔
واقفیت عامہ بڑھانے والے چارٹس مثلاً گاؤں کے عہدیداروں کے نام۔ عہدہ۔ اور
فرائض کے چارٹس ہوں۔ آلات کشاورزی کی تصاویر ہوں۔ گرد و نواح کی فصلات۔
امراض مویشیان اور رفاہ عامہ کے محکمہ جات کی سرگرمیوں کی بابت واقفیت درج ہو۔
اپنے ملک اور علاقہ کے حالات سے روشناس کرانے والے چارٹس وغیرہ ہونے
چاہیئیں۔ کمروں کے قطعات اور چارٹس ان لڑکوں کی لیاقت کے مطابق ہونے
چاہیئیں۔ جو ان میں بیٹھتے ہیں۔ یہ ان کی کتب میں سے تیار کئے جائیں۔ تو بہتر ہوگا۔
انہیں ان کا مطالعہ کرایا جائے۔ اور ان سے مستفیض کیا جائے۔

جماعت کے سلیبس۔ ٹائم ٹیبل۔ پروگرام پی ٹی۔ فہرست داخلہ و خارجہ
وغیرہ بھی آویزاں ہوں۔

آرائش مدرسہ کے لئے صفائی کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ دونوں لازم
ملزوم ہیں۔ بغیر صفائی کے آرائش کچھ نہیں ہوتی۔

سامان مدرسہ کو ترتیب سے رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ آرائش کا

ایک مطلب یہ بھی ہے۔ کہ ہر چیز قرینے کے ساتھ مناسبت کا لحاظ کر کے ایسے طریقے سے رکھی جائے کہ وہ زیادہ بھلی معلوم ہو۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا۔ آرائش قابلِ تعریف یا مکمل نہیں ہوگی۔

قطعات خوشخط موٹے جلی حروف میں ہوں۔ پڑھنے والے چارٹس وغیرہ اتنے فاصلہ پر ہوں کہ طلبا ان کو آسانی سے پڑھ سکیں۔ نقائص سے مبرّا ہوں۔ ورنہ بجائے فائدہ کے نقصان پہنچائیں گے۔

آرائش میں سادگی کو مدِ نظر رکھا جائے۔

بچّوں کی تعلیم

از شریف کنجاہی

پڑھنا لکھنا مہذب انسان کے لئے ضروری چیز ہے۔ اسی لئے اچھے ماں باپ چاہتے
ں کہ ان کے بچے پڑھ لکھ جائیں۔ لیکن بچے اسی وقت اچھی طرح پڑھ لکھ سکتے ہیں۔ جب
ں کے سامنے کوئی آسان سی راہ ہو۔ کیونکہ مشکل کام کو کوئی بھی ہاتھ میں نہیں لیتا۔ (بہت
ے بچے اس لئے اَن پڑھ رہ جاتے ہیں۔ کہ تعلیم اتنی آسان نہیں جتنی ضروری سمجھی جاتی
ے۔ اور اس میں کئی ایسی باتیں بھی مل گئی ہیں۔ جن کا بچوں کو پڑھانا یا بتانا ضروری نہیں)
اس وقت سکولوں میں اور گھروں میں بھی بچوں کو پڑھانے کا جو طریقہ کام میں لایا
تا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے الف ب ت پڑھائی جاتی ہے پھر قاعدہ اور پھر پہلی کتاب۔
دسری کتاب۔ تیسری کتاب یہاں تک کہ لڑکا دسویں جماعت پاس کر لیتا ہے۔ یا راہ میں
ی چھوڑ کر کوئی اور کام کرنے لگ جاتا ہے۔

پڑھنے لکھنے کے کام میں دلچسپی لینے والے بعض آدمی اس طریقے کو اچھا نہیں
سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ بچّے کو حروف یاد کرانے کی جگہ پوری ایک بات یاد کرا دینی
چاہیئے۔ اور ایک حرف کی پہچان کی جگہ پوری لکھی ہوئی بات کی پہچان کرانی چاہیئے۔
پہلے خیال کے لوگ کہتے ہیں کہ دوسرے خیال کے لوگ غلط راہ پر چل رہے ہیں اور

دوسری راہ پر چلنے والے پہلے طریقے سے کام لینے والوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا؟ میرے خیال میں "جوڑ کرکے" پڑھنے کا طریقہ وہ پرانا طریقہ ہے۔ جو مسجدوں میں بچوں کو قرآن شریف پڑھانے کے وقت کام میں لایا جاتا تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ وہاں یہ طریقہ کام دے جاتا تھا۔ کیونکہ مسجدوں میں پڑھنے پڑھانے والوں کو کسی دوسرے امتحان لینے والے کا ڈر یا کھٹکا نہیں ہوتا تھا۔ اور مولوی صاحب نے بچے کو پہلے جوڑ سے قرآن شریف ختم کروا دیتے پھر رواں۔ لیکن سکولوں کا باوا آدم نرالا ہے۔ یہاں ایک سال کی حد لگا دی جاتی ہے۔ اس ایک سال کے اندر امتحان لینے والے بھی اور بچوں کے ماں باپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ اُردو کی ایک کتاب ختم ہو جائے حساب کی ایک کتاب ختم ہو جائے (اور حساب کی کتاب میں وہ وہ سوال دیئے ہوتے ہیں کہ جن کو بچہ ابھی سمجھ ہی نہیں سکتا۔ عام سودے کے سوالوں کی جگہ جن کی ضرورت اسے ہر روز پڑتی ہے۔ اس کے سوال اس طریقے سے تیار کئے گئے ہوتے ہیں۔ کہ جیسے کل صبح سکول میں آنے کی جگہ اُسے کسی بیوپاری کے پاس جاکر اس کا کاروبار سنبھالنا ہے۔ یا کسی دفتر میں جاکر کام کرنا ہے)۔

پانچویں جماعت سے غیر زبان بھی گلے سے آکر چمٹ جاتی ہے۔ اس صورت میں جوڑ کے ساتھ پڑھانے کے لئے بھلا وقت کہاں۔ اور اسی لئے بچوں کو جوڑ کرنے کی پوری پوری مشق نہیں ہو سکتی۔ دوسرے وہ بیچارے ابھی چھوٹے ہی تو ہوتے ہیں۔ کوئی مشکل لفظ آگیا۔ جماعت کے کسی اچھے لڑکے نے آپ ہی پڑھ لیا۔ اب وہ ڈرتے کہیں گے نہیں کہ ماسٹر جی اس کا جوڑ کر دیجئے۔ کیونکہ ماسٹر جی کا خوف دل پر چھایا رہتا ہے۔

اسی لئے میرے خیال میں سکولوں کے اندر چوتھی جماعت تک جوڑ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان جماعتوں میں جو کتابیں پڑھائی جائیں ان میں سے وہ تمام لفظ نکال دئے جائیں جو بچے نے اپنے آس پاس سے پہلے نہ سُنے

ہوں اَور جن کو سمجھنے کے لیئے اسے ماسٹر جی کی ضرورت پڑے۔ اَور اگر بعض ایسے لفظ لائے بغیر چھٹکارا نہ ہو۔ تو وہ لفظ بار بار لانے چاہئیں۔ تاکہ کسی زیادہ محنت کے بغیر ہی بچہ انہیں سمجھ جائے۔

اگر لفظ مشکل نہ ہوں تو پڑھنا لکھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ گلی کوچے میں کھیلنے والے اَن پڑھ بچّوں کو آپ سے آپ ہی ضرورت کے لفظ یاد ہو جاتے ہیں۔ آپ سے آپ ہی وہ ضرورت کی چیزوں کو پہچاننے لگ جاتے ہیں۔ یہی حال لفظوں کا ہے۔ بچّے آپ سے آپ ہی ان کو بھی پہچان سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ لفظ بہت زیادہ نہ ہوں۔ اَور بار بار ان کی نظروں کے سامنے آئیں۔ اس دنیا میں آکر بچّہ آس پاس والوں کو بھی اسی طریقے سے پہچاننے لگتا ہے۔ پہلے دن اسے ماں باپ کی پہچان نہیں ہوتی۔ جُوں جُوں وہ بڑا ہوتا ہے اَور ایک عورت اَور ایک مرد کو بار بار اپنے پاس دیکھتا ہے۔ وہ ان کو دوسروں میں سے پہچاننے لگ جاتا ہے۔ اَور جانے پہچانے لوگ دن بدن زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ اس کی جان پہچان بڑھ جاتی ہے۔ پڑھنے اَور بولنے میں کوئی لمبا چوڑا فرق بھی نہیں ہے۔ جب ہم اپنے لڑکے سے کہتے ہیں "بیٹا وہ برتن لاؤ" تو ہم اپنی بات کانوں کی راہ اس تک پہنچاتے ہیں لیکن جب اسی فقرے کو کاغذ پر لکھ کر اسے دکھاتے ہیں تو وہی بات آنکھوں کی راہ اس تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جس طرح کانوں کی راہ بات سمجھتے وقت اسے کوئی تکلیف نہ ہوئی تھی اسی طرح آنکھوں کی راہ سمجھتے وقت بھی کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ اتنا ضرور ہے کہ چونکہ دوسرا طریقہ ہمارا اپنا بنایا ہوا ہے۔ اس لیئے اس کا عادی بننے میں کچھ دن لگتے ہیں۔ اَور اس کے لیئے وقت اَور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن جوڑ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جس طرح بچّہ ب اَور ت میں پہچان کر سکتا ہے۔ اسی طرح وہ رحیم اَور کریم میں پہچان کر سکتا ہے۔ اسے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ر زبر را ح ی حی م موقوف رحیم اَور ک زبر کا ر ی ری م موقوف کریم۔

بچّے کا دماغ بھی جو ابھی پُوری طرح پڑھنے کا عادی نہیں ہُوا۔ یہی چاہتا ہے۔ کہ اسے حرفوں کی پہچان کی جگہ پہلے لفظوں اَور فقروں کی پہچان کرائی جائے۔ دماغ کے تین پرت ہوتے ہیں۔ بیرونی، وسطی اَور اندرونی۔ ان تینوں کے کاروبار ایک دوسرے سے کچھ جُدا جُدا ہیں۔ جب بچّہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ پرت ایک سے اس وقت بڑھے ہوئے نہیں ہوتے۔ پہلا پچاس فی صدی کے حساب سے بڑھا ہُوا ہوتا ہے۔ دوسرا چھپتر اَور تیسرا بیاسی فی صدی۔ ان میں سے باہر والا پرت زیادہ کام دینے والا ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے دماغ زیادہ پیچیدہ باتوں سے نبٹنے کے قابل ہوتا ہے۔ دماغی قابلیّت سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ کُند ذہن لوگوں میں پُوری طرح نشو ونما نہیں پاتا۔ اور عام انسانوں میں بھی باقی دونوں پرتوں کے بعد پختہ ہوتا ہے۔ اَور تعلیمی لحاظ سے بہت اہم ہے۔

وسطی پرت گویا ایک آلہ ہے جس کے ذریعے ہم دیکھتے، سُنتے، سُونگھتے، چکھتے یا ٹٹولتے ہیں۔ اندرونی پرت کا تعلق زیادہ تر ان حرکتوں سے ہے۔ جن میں ہمارے ارادے کو دخل نہیں۔ اَور جو ہمارے پیدائشی میلانوں کے چشمے سے پھُوٹتی ہیں۔ بچپن میں یہ دماغی پرت اسی حد تک بڑھتے ہیں۔ جس حد تک کہ زندگی کے لئے ان کی نشو ونما کی ضرورت ہے۔ پھر چونکہ سب سے پہلے بچّے کو ان پیدائشی میلانات کا سہارا لے کر زندہ رہنا ہوتا ہے۔ اس لئے اس عمر میں بھی پرت زیادہ تربیت پاتا اَور بڑھتا ہے۔ جب وہ بالغ ہونے لگتا ہے۔ اس میں زیادہ باریکیوں اَور پیچیدگیوں کو سمجھنے کی صلاحیّت آنے لگتی ہے چنانچہ بیرونی پرت اس رفتار سے بڑھتا ہے کہ سب سے بعد میں پختہ ہو سکے۔

تعلیم کے نقطہ نظر سے یہ باتیں بہت مفید ہیں۔ ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیوں عمر کے ابتدائی سالوں میں تعلیم بچّے کی پیدائشی رغبتوں کے مطابق ہونی چاہیئے یا سیدھے سادے حواس کے متعلق۔ اَور زیادہ پیچیدہ باتیں کیوں ابتدا میں بتانے سے پرہیز کرنا چاہیئے الفاظ کی نسبت حروف کی پہچان زیادہ پیچیدہ کام ہے۔

عام تجربہ کی بات ہے کہ بچے شروع شروع میں چیزوں یا شکلوں کو مجموعی طور
ٖانی سے پہچان سکتے ہیں لیکن ان کے ہر حصے میں فرق یا تمیز نہیں کر سکتے۔ مثلاً
م اور دام" ایک چھوٹے بچے کو ایک سے معلوم ہوں گے۔ پھر پانچ چھ سال کی عمر تک کے
فرق کی نسبت مشابہت کو جلد پا جاتے ہیں۔ اور ان بچوں کو چھوڑ کر جو بلا کے ذہین ہوتے
ٖ۔ اوسط درجہ کے بچے "رو" "دو" میں آسانی کے ساتھ پہچان نہیں کر سکتے۔ پھر صرف
د۔ ڈ کا معاملہ تو اور بھی ٹیڑھا ہے۔

بات مختصر کیوں نہ کی جائے۔ دو تو اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک سہی۔ بچے کو پہلے
ٖ پڑھائی جائے۔ جوڑ سکھلائے جائیں۔ اور پھر کوئی کتاب پڑھائی جائے یا پہلے دن ہی سے
ٖ کتاب شروع کرادی جائے۔ بچے کو آپ جس طریقے کا عادی بنائیں گے۔ بن جائے گا۔ جس
ٖ پر چلائیں گے چل پڑے گا۔ اس کو لکھنا پڑھنا سکھلانے میں ان باتوں کے متعلق کشمکش
ضرورت نہیں۔ (بچے وہ مصری خط بھی سیکھ لیا کرتے تھے جن میں حروف، تہجی کی کوئی گنجائش
ٖ نہ ہوتی تھی۔) ضرورت صرف اِس بات کی ہے کہ بچے کو کسی طریقے سے نت نئے لفظ
ٖھائے جائیں۔ اس کی اپنی عمر کے مطابق اس پر بوجھ ڈالا جائے۔ تاکہ وہ جی نہ ہار بیٹھے
ٖر پھر آہستہ آہستہ اس بوجھ کو زیادہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر پہلی جماعت کے لئے ڈیڑھ
ٖ سو لفظ چُن لئے جائیں اور اس جماعت کے لئے جو کتاب لکھی جائے اس میں وہی لفظ
ٖر بار لائے جائیں۔ پھر دوسری جماعت کے لئے اسی قدر یا اس سے کچھ زیادہ نئے لفظ
ٖچن لئے جائیں۔ اور پہلی جماعت میں پڑھے گئے لفظوں کے ساتھ ملا کر ایک ایسی کتاب
ٖتیار کی جائے جس میں یہ تین چار سو لفظ ہی ہوں اور بس۔ الفاظ چُنتے وقت اس بات
کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ کوئی ایسا لفظ پہلی اور دوسری جماعت کی کتاب میں نہ
آئے۔ جس کو لڑکا پہلے ہی سے نہ سمجھتا ہو۔ مشکل لفظوں سے یا ایسے لفظوں سے جن کو سمجھنے
کے لئے لڑکے کو اُستاد کی مدد لینا پڑے۔ ابھی اسے دُور ہی رکھنا چاہیئے۔ کیونکہ بچے کا چھوٹا

سا دماغ زیادہ بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ آہستہ آہستہ اسے ضروری ضروری نئے لفظ پڑھائے لکھائے جائیں اور ان نئے لفظوں کی تعداد اس قدر زیادہ نہیں ہونی چاہیئے کہ لڑکا گھبرا جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہر سال دو سَو کے قریب نئے لفظ بچّے کو یاد کرانے سے چار سال کے اندر اندر بچّے کے پاس اس قدر لفظ ہو جاتے ہیں۔ کہ وہ اپنے دِل کی بات بیان کر سکتا ہے اِسی مضمون کو لیجئے۔ اس میں گنتی کے چند الفاظ کو چھوڑ کر باقی اِتنے آسان ہیں کہ پرائمری پاس بچّہ آسانی سے انہیں پڑھ سمجھ سکتا ہے۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ اُردو کی ابتدائی کتابیں جو اس وقت رائج ہیں۔ انہیں لکھتے وقت اس ضروری بات کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اس سے پڑھنے والوں اور پڑھانے والوں کے سر پر جو کچھ گذرتی ہے یا گذر رہی ہے۔ اس کو کچھ وہی خوب سمجھتے ہیں۔

چھوٹی جماعتوں میں پڑھنے پڑھانے کے لئے جتنی بھی کتابیں ہیں۔ ان میں سے صرف ایک ادارے کی کتابوں کی زبان بہت اچھی ہے۔ لیکن ان میں بھی لفظوں کا استعمال کسی سوچے سمجھے طریقے سے نہیں کیا گیا۔ جو خیال دل میں آیا اسی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر دیا پہلی کتاب کو لیجئے۔ اس میں چالیس سبق ہیں۔ اور ساری کتاب ایک سَو تیس صفحوں کی ہے۔ مَیں یہ تو نہیں کہتا کہ ایک سال کے لئے چالیس سبق زیادہ ہیں یا ایک سَو تیس صفحے زیادہ ہیں۔ ہاں یہ ضرور کہوں گا۔ کہ پہلے دو سبقوں میں ایک سَو سے زیادہ ایسے لفظ آ گئے ہیں جو پہلی جماعت میں کہیں بھی نہیں پڑھائے جاتے۔ اب آپ ہی سوچئے کہ وہ سَو لفظ بچّہ کتنے وقت میں یاد کر سکتا ہے۔ اور ابھی پورے ایک سَو بیس صفحے پڑھنے باقی ہیں۔ اور ان میں بھی نئے لفظوں کی بھرتی اسی طرح ہے۔

نظم کے بارے میں یہ تکلیف اور بھی زیادہ ہے۔ اور یہاں انگریزی۔ اُردو دونوں زبانیں برابر ہیں۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ نظم لطف لینے کے لئے پڑھنی پڑھانی چاہیئے لیکن سوچئے کہ جس نظم کی ایک ایک سطر میں تین تین چار چار نئے لفظ موجود ہوں۔ اس نظم سے ایک ب

لف لے گا۔ اس کا خیال تو لفظوں کو سمجھنے کی طرف لگا رہے گا ۔ وہ دوسرے دن تک ان نئے
ں کا مطلب بھی مشکل ہی سے یاد کر سکے گا۔ مثال کے طور پر میں مارٹن صاحب کی تیار کی ہوئی کتاب
ہ لیتا ہوں (New Study readers) بچوں کے لئے یہ کتاب انگریزی کی سب سے
کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کے کئی حصے ہیں۔ میں اس وقت تیسرے حصے میں سے مثال دیتا ہوں
صفحے پر ایک نظم ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے۔ کہ شاہ بروس اپنے ملک کے لئے لڑتے لڑتے ایک دن
ر بیٹھ جاتا ہے۔ اور ہمت ہار دیتا ہے۔ اچانک وہ ایک مکڑے کو دیکھتا ہے جو بار بار اُوپر چڑھنے کی
شش کرتا ہے۔ اور بار بار گر پڑتا ہے۔ لیکن جی نہیں ہارتا۔ بروس اس سے سبق لیتا ہے اور پھر دلیری
ے کام بنا لیتا ہے۔

نظم اِتنی اچھی ہے کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اسی ۶۴ سطروں کی نظم میں کم سے کم
یس الفاظ ایسے آتے ہیں۔ جو اس سے پہلے لڑکوں نے کہیں پڑھے سُنے نہیں۔ اب خود سوچئے۔ کہ
ے اس نظم سے کیا خاک لطف اُٹھائیں گے۔ ان کو تو یہ ڈر رہے گا کہ کل اگر کسی لفظ کے معنی یاد نہ
ئے تو ماسٹر جی کا بید ہوگا اور اپنے ہاتھ۔ پھر مزے کی بات سنئے کہ یہی نظم دسویں جماعت کی نظموں
کتاب میں موجود ہے۔ گویا ساتویں اور نویں دسویں جماعت کے بچوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ ایک
ے آدمی کی تیار کی ہوئی کتاب کا حال ہے۔ جسے چوٹی کا تعلیمی آدمی گنا جاتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی تو
ت ہی کیا۔

اُردو کی کتابوں میں بھی بچوں کی راہ میں اسی طرح کانٹے بوئے گئے ہیں۔ ہر کتاب میں آپ کو
یسے ایسے الفاظ ملیں گے۔ جن کو لکھنے بولنے کی ضرورت شاید پھر آپ کو عمر بھر نہ پڑے اور ایسی ایسی
ظمیں ملیں گی۔ جن کو بچے تو رہے ایک طرف، خود ماسٹر جی کے لئے بھی مشکل ہے۔ لیکن کتاب میں وہ
ڑھنے والے اور پڑھانے والے دونوں کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

یہی نہیں۔ اپنے ملک کے جانے پہچانے ناموں کو چھوڑ کر سمندر پار کے انوکھے اور نہ سُنے
ہُوئے ناموں والے لوگوں کی کہانیاں اور باتیں بیان کی گئی ہیں۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ دُوسری

جماعت کے لڑکوں کو لفظ الزبتھ یاد کراتے کراتے مَیں نے آدھا دن ضائع کر دیا۔ پھر بھی لڑکوں کو یہ نام نہ آیا۔ پر نہ آیا۔ مَیں ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔ کہ تیسری چوتھی جماعت کے بچّوں کو دوسرے ملکوں کے لوگوں کے نام یاد کرانا کون سے دُکھ کی دوا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ اپنے گورے مالکوں کو خوش رکھنے یا نمک حلال کہلانے کا یہ بھی ایک طریقہ گنا جاتا ہو۔ مگر اب تو فضائیں بدل چکی ہیں نیا راگ ہے۔ ساز بدلے گئے۔

اِس کا علاج اسی طرح ہو سکتا ہے۔ کہ محکمۂ تعلیم سکولوں کی کتابوں کو منظور کرتے وقت اِس قسم کی بعض باتوں کو سامنے رکھے جو اُوپر بیان کی گئی ہیں۔ تاکہ ملک کے بچّے تعلیم میں دلچسپی لینے لگیں۔ اَور تعلیم ٹیڑھی کھیر بن کر نہ رہ جائے +

سویڈن میں تعلیم و تدریس کی روئیداد

متعلقہ سال ۱۹۴۸-۱۹۴۷

ترجمہ ـــ سلیم فارانی

معاملات مدارس کے لئے دو تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوئے تھے ایک ۱۹۴۰ء میں۔ جو ماہرین فن پر مشتمل تھا۔ اور دوسرا ۱۹۴۶ء میں جو ماہرین فن پر مشتمل ہونے کے علاوہ پارلیمانی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ ان کمیشنوں کے نتائج کے انتظار میں گذشتہ سال بڑی بڑی مدرسی اصلاحات معرض التوا میں رہیں۔ پہلے کمیشن نے اپنا کام ۱۹۴۷ء کی ابتدا میں ختم کر لیا، دوسرے کے متعلق توقع تھی۔ کہ وہ اپنی پہلی رپورٹ، جس میں مجوزہ نظام کا عام خاکہ دیا ہوگا۔ گذشتہ موسم خزاں میں شائع کر دے گا لیکن یہ رپورٹ، جس کا مافیہ پہلے ہی سے معلوم ہو چکا ہے، اب کہیں طبع ہو رہی ہے۔ چھپ جانے کے بعد یہ متعلقہ مدارس اور ارباب اہتمام کے غور و خوض کے لئے بھیج دی جائے گی۔ ابھی کچھ اُمید باقی ہے کہ حکومت ۱۹۴۹ء میں ایک نیا تعلیمی بل پارلیمان میں پیش کر سکے گی۔ مجوزہ اصلاحات کے متعلق آئندہ سال ہی کی روئیداد میں ذکر کا موقعہ آئے گا۔

۱۔ بندوبستِ مدارس

تعلیمی بورڈ (Board of Education) جو تعلیم سے متعلق ملازمتوں کا ایک مرکزی محکمہ ہے، بندوبستِ مدارس کے سلسلے میں نہایت مفید مسائل کا فیصلہ کرتا ہے؛ اور وزارت معارف (حکومت) اور پارلیمان کے فیصلوں کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ گذشتہ سال اس بورڈ میں تین مشیرانِ تعلیم اور ایک معتمد معاون کی نئی اسامیوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور ایک مشیر کی سرکردگی میں تعلیم بالغان کے لئے ایک مخصوص محکمہ بھی کھول دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ نظام دستکاری کا ایک ناظر بھی مقرر کیا گیا ہے اور نگران طبّی افسر کو ایک معاون طبّی افسر دیا گیا ہے۔ دو غیر تعلیمی اشخاص جو ۱۹۴۷ء سے بورڈ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور عوام کے نمائندے ہیں ان کا ذکر تو پچھلے سال کی روئیداد میں آ ہی چکا ہے

ابتدائی مدارس میں نگران اساتذہ کے انتخابات پہلے کی نسبت زیادہ ہوتے ہیں مدرسی ضلعوں میں جہاں کم از کم دس معلّم ہوں اب ایک نگران کا تقرر لازمی ہے۔

تعلیمی بورڈ نے حال ہی میں کسی حد تک مرکز ہٹانے کی رائے دی ہے۔ اور تجویز کی ہے۔ کہ بہت سے مسائل جن کا فیصلہ اب وزارت کیا کرتی ہے؛ تمام تر بورڈ کے ہاتھوں میں آجانے چاہئیں۔ اور بعض امور جن کا فیصلہ اب بورڈ کیا کرتا ہے۔ صدر معلّموں کو سونپ دئے جائیں۔

ابتدائی مدارس کے بندوبست کے متعلق ایک مجلس خصوصی نے ابھی ابھی اپنا کام ختم کیا ہے۔ اس نے تجویز کی ہے کہ تعلیمی بورڈ اور مقامی ارباب اہتمام کے درمیان علاقہ بینی ارباب اہتمام ہونے چاہئیں۔ جنہیں طرفین سے فرائض سپرد ہوں۔

تمام قسم کے صنعتی مدارس کے لئے ایک خاص بورڈ ہے اس روئیداد میں ان مدارس کا مذکور نہیں۔ ملک کے صنعتی اداروں کا مالیہ میزانیہ ۲۳ ملیون (۲۳۰ لاکھ) سویڈش کراؤن ہے۔ گذشتہ سال ۲۱ ملیون یعنی ۲۱۰ لاکھ تھا۔

۲- تنظیم مدارس

(الف) ابتدائی مدارس۔

(۱) طلبہ کی تعداد وغیرہ:

سال تعلیمی ۴۷-۱۹۴۶ کے خاتمہ پر ابتدائی مدارس میں طلبہ کی تعداد ۵۴۴۰۰۰ ہے۔ اس سے پچھلے سال میں ۵۲۷۰۰۰ تھی۔ ایک استاد والی جماعتوں کی تعداد بھی ۲۶۴۴۰ سے ۲۶۸۹۰ تک پہنچ گئی تھی۔

پیدائش کی بڑھتی ہوئی رفتار جو ۱۹۳۵ کے بعد کے دور کی خصوصیت تھی کچھ عرصے سے ابتدائی مدارس پر اثر کرتی رہی ہے۔ اور اب ثانوی مدارس پر اثر دکھانے لگی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ استادوں کی کمی اور عمارتوں کی قلت کے باعث بڑی مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ بہرحال، ہر سال مدرسوں کی عمارتوں کے سلسلے میں کچھ کوٹا مخصوص کیا جا رہا ہے۔ عمارتی سامان اور مزدوری کی قلت، نیز خارجی مبادلات کی منڈی کے حالات مشکلات کو اور بھی بڑھا رہے ہیں۔ بہت سے مقامات پر نئی عمارتوں کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جا رہی ہے۔ اور یہ ضرورت مسلسل بڑھ رہی ہے۔

(۲) لازمی تعلیم کی مدت۔

۱۹۳۶ء میں جب ساتواں سال ابتدائی مدارس کی تعلیم میں بڑھایا گیا تھا۔ تو بارہ سال کی مدت تک اس ہفت سالہ تجویز پر عمل پیرا ہو جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ وہ مدت اب ختم ہو چکی ہے۔ لیکن عمارتوں کی قلت کے باعث بہت سے مدرسی ضلعوں میں اس اصلاحی اقدام کو ملتوی رکھنے کی اجازت دینے کے بغیر چارہ نہیں۔

۱۹۴۰ء کے کمیشن نے لازمی تعلیم کی طبعی مدت آٹھ سال تجویز کی ہے۔ ۱۹۴۶ء کا کمیشن نو سال تجویز کرتا ہے۔ بہت سے مدرسی ضلعوں نے پہلے ہی سے آٹھواں سال شروع کر دیا ہے۔ اور چند ایک اضلاع میں اختیاری نویں سال کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔

(۳)- مرکزیت :

ابتدائی مدارس کے سب سے اعلےٰ طبقوں (ساتویں اور آٹھویں) کو زیادہ سے زیادہ ایک مرکز پر لایا جارہا ہے۔ جس سے اچھے مدارس کے نمونے مہیا کئے جاتے ہیں۔ بچّوں کی آمد و رفت کے اخراجات کے لئے حکومت کی طرف سے امدادی رقوم ملتی ہیں۔ نہ صرف اقتصادی غرض سے بلکہ ۱۹۴۷ء سے اس غرض سے بھی کہ مدرسی حالات بہتر ہو جائیں۔

۱۹۴۷ء سے حکومت کی طرف سے سب سے اعلےٰ دو جماعتوں کے طلبہ کو آمد و رفت کے ذاتی اہتمام (سائیکل) کے لئے بھی امدادی رقم ملتی ہے۔ جو ۴۰ یا ۵۰ کراؤن یومیہ بیٹھتی ہے۔

(۴)- میزانیہ :

آخر میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی طرف سے چند موٹی موٹی چیزوں کے سلسلے میں جو امدادی رقوم ابتدائی مدارس کو مل رہی ہیں۔ ان کی مقدار کے متعلق کچھ اطلاع بہم پہنچائی جائے۔ ذیل میں گذشتہ دو سالوں کی رقوم سویڈ کراؤن میں دی گئی ہیں ان سے خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔ کہ امداد میں کتنا اضافہ یا ترقی یا کمی ہوئی ہے۔

	۱۹۴۶-۴۷ء	۱۹۴۷-۴۸ء
اُستادوں کی تنخواہیں	۱۳۶۰۰۰۰۰۰	۱۴۱۰۰۰۰۰۰
معلّمین دستکاری	۳۶۲۵۰۰۰	۴۰۲۵۰۰۰
معلّمین معاشیات خانگی	۳۵۰۰۰۰	۴۰۰۰۰۰
فرصتی مدارس کے معلّمین	۳۶۷۵۰۰۰	۳۵۰۰۰۰۰
طلبہ کی خوراک	۲۰۵۰۰۰۰	۳۰۵۰۰۰۰
طلبہ کی آمد و رفت کا اہتمام	۴۱۰۰۰۰	۴۸۰۰۰۰
مفت درسی کتابیں	۵۵۰۰۰۰	۵۵۰۰۰۰
ضروریات و سامان	۱۰۰۰۰۰۰	۲۹۰۰۰۰۰

ری کام	۸۰۰۰۰۰	۱۲۰۰۰۰۰
، صحت	۵۰۰۰۰	۸۴۵۰۰۰
ی تغذیہ گاہیں	۴۰۰۰۰۰	۱۰۵۸۵۰۰
تی مدارس کا تمرکز	۵۰۰۰۰	۵۳۰۰۰
شی مدارس	۴۵۷۰۰	۵۷۹۰۰
صارف ابتدائی تعلیم	۱۹۴۰۰۰۰۰	۲۱۸۰۰۰۰۰

(ب) ثانوی مدارس:

ا) ۔ گذشتہ سال سرکاری ثانوی مدارس کی تعداد ۲۰۶ تھی۔ جن میں سے ۶۷ فوقی
ی مدارس تھے جن کی حد میٹرکولیشن ("Student examen") تھی اور ۱۳۹
ثانوی مدارس (یا وسطانی مدارس) تھے۔ جن کی آخری حد فقط ماڈرن سکول کا امتحان
("real exame) تھا۔ فوقی مدارس بھی ماڈرن اسکول کے امتحان ("real
exame کے لیے تیار کرتے ہیں۔

اس سال کی پارلیمان نے صرف ایک نیا وسطانی مدرسہ کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اِن کے
، پندرہ قصباتی ہائی سکول (Gymnasia) یعنی فوقی ثانوی مدارس کے اعلےٰ
ن سکے سکول ہیں۔ جن میں سے سات گذشتہ سال کھولے گئے تھے۔ اور پھر کافی تعداد
قصباتی زنانہ مدارس اور قصباتی وسطانی مدارس بھی ہیں۔ جن میں سے بعض صنعتی حیثیت
ہیں۔ تین بڑے قصباتی وسطانی مدارس حکومت نے جولائی ۱۹۴۷ء سے لے لئے تھے۔
اس قسم کے گیارہ اور مدارس جولائی ۱۹۴۸ء سے لے لے گی۔ چند نئے قصباتی مدارس
کھول دئے گئے ہیں۔

سرکاری ثانوی مدارس میں ۱۹۴۸ء کی پارلیمان نے علمی مضامین پڑھانے کے لئے
موں کے مستقل سٹاف پر ۱۵۷ نئی اسامیوں کا فیصلہ کیا ہے۔ اس وقت مستقل اساتذہ

کی مکمل تعداد ۲۰۰۴ ہے۔ جن میں ہیڈ ماسٹر بھی شامل ہیں۔ انہی مدارس میں غیر مستقل اساتذہ کی تعداد ۶۶۲ ہے۔

ابتدائی مدارس کے بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد ثانوی مدارس کی طرف جاتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے موسم خزاں میں مختلف قسم کے ثانوی مدارس میں مبتدیوں کی تعداد ۲۵۰۰۰ تھی۔ جو اس عمر کی جماعت کے ۹ فیصدی کے برابر تھی۔ اگر اس رجحان میں کوئی چیز خلل انداز نہ ہوئی تو ۱۹۵۳ء میں ثانوی مدارس کی پہلی جماعت میں زیادہ سے زیادہ اس سے دگنی تعداد کی اُمید کی جا سکتی ہے یعنی اس عمر کی جماعت کے ۲۷ فیصدی کے برابر۔

(۲) میزانیہ :

یہاں ثانوی مدارس کے پچھلے دو سالوں کے میزانیہ کی چند موٹی چیزیں (سویڈش کراؤن میں) دینی مناسب ہوں گی۔

	۱۹۴۶-۴۷ء	۱۹۴۷-۴۸ء
سرکاری مدارس کے استادوں کی تنخواہیں	۳۴۵۳۵۰۰۰	۵۲۷۲۱۰۰۰
آزمائشی اساتذہ کی ٹریننگ کی فیسیں	۳۲۰۰۰۰	۳۲۰۰۰۰
بعض قصباتی ہائی سکولوں کو سرکاری امداد	۳۰۰۰۰	۱۲۵۰۰۰
قصباتی زنانہ مدارس کو " "	۵۳۷۰۰۰۰	۶۰۰۰۰۰۰
وسطانی مدارس کو " "	۳۳۷۰۰۰۰	۲۷۷۰۰۰۰
وسطانی صنعتی مدارس کو " "	۲۷۷۷۰۰۰	۲۷۷۷۰۰۰
پرائیویٹ سکولوں کو " "	۱۳۲۰۰۰۰	۱۱۸۳۰۰۰
طلبہ کو وظائف	۴۵۰۰۰۰	۸۰۰۰۰۰
ثانوی تعلیم کے مصارف کا کل میزان	۵۵۰۰۰۰۰۰	۷۸۰۰۰۰۰۰

۳۔ نصاب و طریق تعلیم

(۱) نئے مضامین:

گذشتہ چند سالوں سے ابتدائی مدارس میں جن کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے ایک اجنبی زبان کا مطالعہ جس میں انگریزی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ساتویں اور آٹھویں جماعت میں تجربے کے طور پر شامل کر دیا گیا ہے۔ تلفظ' درسی کتاب، خوانی' اور مکالمہ اس مطالعہ کے خاص عناصر ہیں۔ قواعد کے مسائل بھی سمجھائے جاتے ہیں۔ اور مطالعہ کے ساتھ ساتھ تحریری مشقیں بھی کرائی جاتی ہیں۔

۱۹۴۰ء کے کمیشن کی تجویز کے مطابق گذشتہ تین سالوں سے ایک دلچسپ تجربہ کیا جا رہا ہے یعنی انگریزی زبان کا ایک مرکب ریڈیائی اور مراسلاتی نصاب ۴۶-۱۹۴۵ء میں چھٹی جماعت کے لئے ۴۷-۱۹۴۶ء میں ساتویں جماعت کے لئے اور ۴۸-۱۹۴۷ء میں ابتدائی مدارس کی پانچویں جماعت کے لئے جاری کیا گیا۔ یہ تجربہ جس کے لئے محکمہ نشریات کو حکومت کی طرف سے امدادی رقم دی گئی ہے بعض رقبوں تک محدود رہا ہے۔ اس کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ عام اسباق کے ساتھ ساتھ ریڈیائی اسباق کے ذریعے حتی الامکان کہاں تک کامیاب نتائج حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ اس کام کے لئے ہفتے میں چھ پیریڈ رہے ہیں۔ دو ریڈیائی استاد کے لئے' دو جماعت کے استاد کے لئے جو عموماً انگریزی پڑھانے کے لئے مناسب اور ضروری قابلیت یا سند نہیں رکھتا۔ اور دو استاد کی ہدایات کے مطابق طلبہ کی خاموش مشق کے لئے۔

چھوٹے چھوٹے رسالے جن میں درسی نصاب کے ساتھ ضروری تشریحات اور مشقیں ہیں اس مطالعہ میں حصّہ لینے والے طلبہ کو بھیج دی گئی ہیں۔ ان طلبہ کو سوالات کے جوابات اور فقروں کے ترجمے لکھ کر اصلاح کے لئے محکمہ نشریات کو بھیجنے پڑتے ہیں۔ اس تجربے کے نتائج جن پر مختلف طریقوں سے ضبط رکھا گیا ہے۔ غیر ہموار سے ہیں۔ لیکن بہت سے طلبہ کے

حق میں یہ تجربہ حیرت انگیز طور پر مفید ثابت ہُوا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہو گیا ہے۔ کہ اِس طریق سے زبان پڑھانا ممکن ہے۔

اِس قسم کے ریڈیائی طریق تعلیم میں بھی یہی پایا گیا ہے۔ کہ نتائج کا زیادہ تر انحصار معلّم جماعت ہی کی دلچسپی اور قابلیت پر ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے۔ کہ غیر زبان کا مطالعہ دوسرے مضامین کے مطالعہ پر خوشگوار اثر ڈالتا ہے۔ خاص طور پر مادری زبان کے مطالعہ میں اگرچہ اس میں طلبہ کے گھریلو کام کا بہت سا وقت صرف ہوتا ہے۔

یہ ریڈیائی اور مراسلاتی نصاب محکمہ نشریات اور تعلیمی بورڈ کے اشتراک عمل سے تیار کیا گیا ہے۔ اور اس کے متعلق درسی کتابوں اور ریڈیائی اسباق کا ذمہ وار ثانوی مدارس کا ایک قابل ترین انگریزی کا معلّم ہے۔

لڑکوں کو معاشیات خانگی میں تربیت دینے کے لئے اب پہلے سے زیادہ مواقع مہیّا کئے جاتے ہیں۔ پارچات کے متعلق صنعتی تربیت زیادہ عام ہو رہی ہے۔

مدارس میں بڑے بچّوں کو چھوٹے بچّوں کی نگرانی کرنا بھی سکھایا جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں بڑھتی ہوئی دلچسپی دیکھی جاتی ہے۔

مختصر یہ کہ مدرسی تعلیم کو زیادہ عملی بنانے کی طرف رجحان سا ہے۔ جہاں تک علمی مضامین کا تعلق ہے۔ اس میں بھی ایک طرح کا یہی رجحان پایا جاتا ہے۔

جہاں تک ثانوی مدارس کے نصاب کا تعلق ہے۔ اس میں کوئی جاذب توجہ تبدیلی نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ انگریزی جسے ۱۹۴۶ء میں پہلی زبان قرار دیا گیا تھا اور جرمن زبان جو اس وقت ثانوی زبان قرار دی گئی تھی۔ ان دونوں کے ٹائم ٹیبل میں کچھ ترمیم ہوئی ہے۔ طریق تعلیم میں کچھ درونی طور پر بتدریج نشوونما ہو رہی ہے اور اس کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ طلبہ کو مطالعہ میں زیادہ خود مختار بنا دیا جائے۔ ۱۹۴۶ء سکول کمیشن نے ابتدائی اور ثانوی مدارس میں استادوں کے مخصوص طریقہ ہائے تعلیم

کی تحقیقات کی ہے۔ اور اس سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ بہت سے استاد تعلیم و تربیت میں اپنے ہی طریقے استعمال کرتے ہیں اور نئے نئے اسالیب عمل میں لا رہے ہیں۔ غالباً کمیشن اپنی اس تحقیقات کے نتائج شائع کر دے گا۔

ہسپانوی زبان بعض سرکاری فوقی ثانوی مدارس کی دو فوقانی جماعتوں میں داخل کی گئی ہے۔ کچھ عرصہ کیلئے یہ چند پرائیویٹ سکولوں میں مضمون کی حیثیت سے شامل تھی۔

(۲) مدرسی کتب نصاب و دیگر سامان:

درسی کتب کے لئے ٹیکسٹ بک بورڈ اور تعلیمی بورڈ کی منظوری ضروری ہے۔ جو کتابیں ٹیکسٹ بک کی فہرست میں شامل نہ ہوں اُن پر ضابطہ یہ ہے کہ وہ مدرسوں میں استعمال نہ کی جائیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ کو حال ہی میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اس بورڈ میں اب چار غیر تعلیمی ارکان ہوں گے۔ اور ان کی اکثریت ہوگی۔ اور باقی تین نمائندے ہوں گے ایک ابتدائی مدارس کا، ایک ثانوی مدارس کا اور ایک صنعتی مدارس کا تعلیمی بورڈ کو بھی اس ٹیکسٹ بک بورڈ میں نمائندگی دی جائے گی۔ لیکن اس کے بعد درسی کتب کی منظوری صرف ٹیکسٹ بک بورڈ کے ہاتھ میں ہوگی۔ نفسیات اور مختلف مضامین کے ماہرین بورڈ کے ساتھ حسب ضرورت تعاون کریں گے۔ بورڈ کے اراکین اشاعتی اداروں اور مصنفوں کے مشیر بھی ہوں گے۔ اور وہ درسی کتب کی بہتری کے لئے ہر ممکن اقدام کر سکیں گے۔

عام مدرسی سامان کے لئے یکم جولائی ۱۹۴۷ء سے سرکار کی طرف سے مزید امدادی رقوم منظور ہوئی ہیں۔ ایک استاد والی جماعتوں کے لئے ۶۰ سے ۲۰۰ کراؤن تک سالانہ گرانٹ ہے۔ اور مختلف طبقوں والی جماعت کے لئے اس سے زیادہ رقم ہے۔

تعلیمی بورڈ کو اختیار دیا گیا ہے۔ کہ ابتدائی مدارس کے لئے موزوں تعلیمی سامان کے متعلق تازہ ترین ضروریات کے مطابق فہرست تیار کرے۔

(۳) ضبط :

سکول میں ضبط قایم رکھنے کے لئے جو تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ ان میں عوام نے حال ہی میں زیادہ دلچسپی دکھائی ہے۔ ثانوی مدارس میں جسمانی سزا ممنوع ہے۔ لیکن ابتدائی مدارس میں بعض حالات کے اندر اس تک نوبت آ جانے کی اجازت ہو سکتی ہے ماہرین کی ایک مجلس اس مسئلہ پر رپورٹ پیش کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے۔ اس مجلس کو ہدایات دی گئی ہیں۔ کہ کسی طرح ہر قسم کی جسمانی سزا کے انسداد کے امکانات معلوم کرے۔

۴ : اساتذہ

جنگ کے بعد فرصتی و تجدیدی نصاب (Continuation & refresher courses) دوبارہ جاری کر دئے گئے تھے۔ حکومت کی طرف سے جدید زبانیں سیکھنے کے لئے پہلی بار ابتدائی مدارس کے اساتذہ کو سفری وظائف دئے گئے ہیں۔ (۲۵ ہزار کراؤن) اور ثانوی مدارس کے لسانی معلّمین کے لئے ایسے وظائف دوبارہ جاری کر دئے گئے ہیں۔ (۵۰ ہزار کراؤن) ان سے صحیح قسم کا فائدہ اٹھانے کی خاطر ابھی اور زیادہ رقوم مطلوب ہوں گی۔

ابتدائی مدارس کے لئے اساتذہ کے روز افزوں مطالبے کی بنا پر جو کہیں ۱۹۵۰-۶۰ء میں جا کر پورا ہوگا۔ اور جس کے لئے ہر سال قریباً تین ہزار اساتذہ تیار کرنے پڑیں گے - یہ ضروری ہو گیا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں چار نئے ٹریننگ کالج کھولے جائیں۔ ابتدائی سکولوں کے اور اساتذہ کو انگریزی پڑھانے کے قابل بنانے کے لئے بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ لیکن یہ قابلیت ایک ادنیٰ قسم کی قابلیت ہے۔ بمقابلہ اس قابلیت کے جو ثانوی مدارس کے عام لسانی اساتذہ کے لئے مطلوب ہے۔

جولائی ۱۹۴۷ء سے تنخواہ کے نئے میزان جاری کئے گئے۔ پہلے زندگی کے معیار و مصارف کے مطابق نو مختلف درجے ہوتے تھے۔ لیکن اب یہ بعد میں پانچ کر دئے گئے۔ یہ اقدام کچھ اس طرح عمل میں لایا گیا کہ ان اساتذہ یا اور قسم کے ملازمین کو فائدہ پہنچے - جو ان

مقامات میں رہتے ہیں۔ جہاں معیارِ زندگی نسبتاً کم ہے۔ تنخواہوں کے مدارج میں جو پہلے
نمایاں تھا۔ اسے بہت زیادہ سمجھا گیا۔ اِن نئے درجاتِ مشاہرہ سے غیر مستقل اساتذہ کی حالت
خاص طور پر بہتر ہوگئی۔

ابتدائی سکول کے اساتذہ کو عموماً سرکاری کمرے ملتے ہیں۔ جو انہیں قصبات مہیا کرتے
ہیں۔ اس قسم کے کمرے کُل چودہ ہزار کے قریب ہیں۔ یہ اساتذہ کے مشاہروں کا حصّہ سمجھے
جاتے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں سرکاری طور پر ان تمام کمروں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اور انکی باقاعدہ تدریج کی
گئی تھی منظور شدہ کمرے اپنی خوبی کے لحاظ سے اس وقت تین درجوں میں تقسیم کردئے گئے
تھے۔ اے۔ بی۔ سی۔ ۱۹۴۷ء میں نئے قواعد وضوابط نافذ کئے گئے تھے جن کی رُو سے کمرے
کی زمین کا رقبہ مستقل اساتذہ کے لئے تقریباً ۹۰ مربع میٹر اور دوسرے اساتذہ کے لئے
۶۰ مربع میٹر ہونا چاہیئے۔ کمروں میں پانی کا انتظام اور پانی کے اخراج کا راستہ، بجلی،
مرکزی آتش گاہ، حمام اور طہارت خانہ ضروری ہے۔ اور اس قسم کی تبدیلی کیلئے عرصہ مقرر کردیا
گیا۔ جولائی ۱۹۴۷ء سے مدرسی ضلعے نئے کمروں کی تعمیر اور پُرانے کمروں کی مرمت کے لئے
امدادی رقوم لے سکتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے۔ اساتذہ کی قلت شدّت کے ساتھ محسوس کی جارہی ہے
خاص طور پر ثانوی مدارس میں اور بھر خاص کر حساب اور سائنس کے مضامین کیلئے تعلیمی بورڈ
نے حال ہی میں اس مسئلہ پر اپنی تحقیقات مکمل کی ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ کہ اگر ہر ایک
چیز اسی رفتار سے چلتی رہی۔ اور انتظامات میں کسی قسم کی تبدیلی نہ ہوئی تو ۱۹۵۲ء میں تقریباً
دو ہزار اساتذہ کا توڑا ہوگا۔ معلّمی کو زیادہ جاذب بنانے کی خاطر محکمہ تعلیم نے مختلف طریقے اور
ذرائع تجویز کئے ہیں۔ جن پہ غور وخوض ہورہا ہے۔ مثلاً مستقل یا نیم مستقل اسامیوں کے لئے
جلد جلد ترقیاں، زائد الوقت کام کے لئے بہتر معاوضے۔ ابتدائی مدارس کے اساتذہ کے لئے
طبیعات وکیمیا کے اسباق کا ایسا اہتمام ہے۔ کہ وہ وسطانی سکولوں میں ان مضامین

کی کسی حد تک تعلیم دے سکیں۔ بہرحال، اغلب ہے۔ کہ اساتذہ کے متعلق مطالبہ کو بھی کم کرنے کے لئے اقدامات کرنے پڑیں۔ مثلاً، ثانوی مدارس کے ٹائم ٹیبل میں گھنٹیوں کی تعداد کم کرنے پر غور و خوص ہو رہا ہے۔ اس قسم کی تخفیف البتہ معیارِ تحصیل کو نقصان پہنچائے بغیر بہت زیادہ حد تک نہیں کی جا سکتی۔ ثانوی مدارس میں معلّم کی مستقل اسامی کے استحقاق کی خاطر ایک سال کی عملی تربیت کے علاوہ ایک جامعی سند بھی ضروری ہے۔ یہ تربیت گیارہ سرکاری ثانوی مدارس میں حاصل کی جاتی ہے۔ اکثر حالات میں اُستادوں نے اپنے سال تربیت سے پہلے کئی سال یا کئی ماہ استادوں کی حیثیت سے کام کیا ہوتا ہے۔ اِس طرح وہ اپنی ملازمت کے ابتدائی سالوں میں عموماً عملی تربیت سے نابلد ہوتے ہیں۔

اِس بے ضابطگی کو روکنے کی خاطر جامعی شہروں میں بعض نوجوان اساتذہ کی منظم جماعتوں نے عملی اَور تدریسی اسباق کا اہتمام کیا ہے۔ جن کے ساتھ ساتھ طریقہ ہائے تعلیم کے مسئلوں پر لیکچر، جماعتوں میں حاضری اَور بعض حالات میں تدریسی مشقوں کا انتظام بھی ہے۔ ۱۹۴۳ء سے سرکار کی طرف سے اس قسم کے اسباق کی خاطر کچھ تھوڑی مقدار کی امدادی رقوم دی گئی ہیں ۱۹۴۷ء میں اِس طرح کے اسباق کا سارا خرچ سرکار کی طرف سے دیا گیا تھا۔

۵۔ ضمیمی و خارج از مدرسہ مشاغل

(۱) مدرسی حفظانِ صحت :

۱۹۴۴ء سے پہلے ابتدائی مدارس میں مدرسی حفظانِ صحت کا انتظام مطلقاً قصبات کے ذمے تھا۔ جو امیر و غریب قصبوں کے درمیان بہت بڑے تفاوت کا باعث تھا۔ سرکاری ثانوی مدارس اِس سلسلے میں اُنیسویں صدی کے اواخر سے امدادی رقم لے رہے تھے۔

۱۹۴۴ء سے مدارس کے لئے ایک نگران طبی افسر (معالج) مقرر کیا گیا تھا۔ اس وقت سے ابتدائی اَور ثانوی دونوں قسم کے مدارس میں صحتی نظام کی از سرِ نو تشکیل ہوئی ہے۔ اب

سکول میں صرف ایک مدرسی معالج ہی نہیں بلکہ ایک نرس بھی ہے جو سکول کے طلبہ کی تعداد
مطابق کچھ وقت کے لئے یا سارے وقت کے لئے مقرر ہوتی ہے۔ اس کام کے لئے اب ساری
ادی قوم کا میزان ڈیڑھ ملیون کراؤن ہے ۱۹۴۳ء میں ایک لاکھ کراؤن تھا۔ ابتدائی اور
غیر قصباتی مدارس میں نصف مصارف حکومت ادا کرتی ہے۔ اور نصف قصبہ۔

مدرسی معالجوں اور اُستادوں کی ہدایات کے لئے تعلیمی بورڈ نے ۱۹۴۷ء میں مدرسی
حفظانِ صحت پر ۶۵۰ صفحوں کا ایک رسالہ شائع کیا جس میں مدرسی حفظانِ صحت کے تمام
مسائل کی مکمل بحث ہے۔

۱۹۴۵ء کے بعد سے ہر سال تعلیمی بورڈ کی طرف سے مدرسی معالجوں، نرسوں اور
استادوں کے لئے تجدیدی نصاب (Refresher course) کا اہتمام ہوتا رہا ہے۔

(۲) مدرسی تغذیہ گاہیں:

مدرسی تغذیہ گاہوں کا وہ شعبہ جو ۱۹۴۶ء میں جاری کیا گیا تھا۔ اور جسے سرکاری امداد
بھی ملتی ہے۔ سرعت کے ساتھ نشو و نما پا رہا ہے۔ حالانکہ اس کی راہ میں عمارت، سامان اور کارکنوں
کی قلت کے باعث بہت مشکلات حائل ہیں۔ گذشتہ سال تقریباً ۴۵۰ مدرسی ضلعوں میں جہاں
ابتدائی مدارس کے طلبہ کی تعداد ۱۶۵۰۰۰ (یعنی کل تعداد کی ایک تہائی) تھی۔ اس قسم کا اہتمام
کیا گیا تھا۔ اس سے ایک سال پہلے تقریباً ۳۵۰ مدرسی ضلعوں میں یہ انتظام تھا جہاں کوئی
۱۳۰۰۰ کے قریب طلبہ تھے۔ اِس سال کے مصارف کا اندازہ ایک کروڑ کراؤن سے زائد ہے
مرکزی مدرسے میں مدرسی خوراک کا اہتمام موجود ہو تو بچّوں کے والدین مرکزیّت کی راہ میں کم
حائل ہوتے ہیں۔

مدرسی خوراک عام طور پر پکی ہوئی ترکاری، روٹی، مکھن اور دودھ پر مشتمل ہوتی ہے۔

(۳) مدرسی نفسیاتی یا ہدائیتی شعبے:

ان مسائل پر آج کل خوب بحث ہوتی رہتی ہے۔ مدرسی ماہر نفسیات کی حیثیت سے

کام کرنے کے خواہشمند اساتذہ کی تربیت کے لئے ۱۹۴۷ء میں پہلی بار ایک مختصر سا نصاب مقرر کیا گیا تھا۔ اگلے سال کے لئے ذرا اس سے لمبے عرصے کا نصاب تیار کیا جا رہا ہے لیکن مدرسی ماہرین نفسیات کی باقاعدہ تربیت کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہؤا۔ اور نہ ہی اب تک اس قسم کی کوئی اسامیاں ہیں۔

رضاکارانہ ہدایتی شعبے زیادہ بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ چند مدرسوں نے اس قسم کے مدرسی نگران (School Curators) مقرر کئے ہیں لیکن اس کے متعلق ابھی تک سرکار کی طرف سے کوئی امداد نہیں دی گئی۔ یہ نگرانی کا سلسلہ بہت مفید ثابت ہؤا ہے۔

۶۔ تعلیم بالغان

جیسا کہ گذشتہ سال کی روئیداد میں ذکر کیا گیا تھا، ۱۹۴۷ء سے تعلیم بالغان کا نیا دور شروع ہؤا۔ عام سائنسی لیکچروں، درسی سلسلوں اور مطالعی حلقوں کے لئے سرکاری امدادی رقوم دینے کے نئے قوانین مرتب کئے گئے، حکومت کُل مصارف کا پچاس فیصدی ادا کرنے لگی۔ تعلیم بالغان کے تمام طبقوں کے لئے ایک مخصوص کارکن جماعت مقرر کی گئی ہے۔ جس کا نام سرکاری مجلس تعلیم بالغان (State Adult Education Committee) ہے۔ یہ مجلس مشاورتی فرائض سرانجام دیتی ہے۔ اور اس میں مشہور تعلیمی انجمنوں کے نمائندے اور اربابِ تعلیم شامل ہیں۔

تعلیمی بورڈ کا کام ہے کہ اس قسم کی تنظیموں کی اجازت دے جو مطالعی حلقے ترتیب دیں اور ان حلقوں پر نگران افسر مقرر کرے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں تعلیمی بورڈ نے اس قسم کی بارہ مجالس کو تسلیم کیا ہے، ان کو نظم و نسق اور اہتمامات کے مصارف کے لئے سرکاری امداد ملتی ہے۔ تاکہ وہ معلّم و منتظم مقرر کر سکیں اور مطالعی حلقوں کے سرداروں کو کچھ تربیت دے سکیں۔ تقریباً ۱۴۰۰۰ مطالعی حلقے یعنی ایسے تمام حلقوں کے ۶۰ ـ ۷۰ فیصدی حصے کو اب سرکاری امداد مل رہی ہے جس کا اندازہ دس لاکھ کراؤن سے زائد ہے۔

ایک مشہور فلمی انجمن "فلمو" نے انگریزی زبان کی ایک فلم تیار کی ہے۔ یہ انگریزوں کے اشتراک عمل سے سویڈن ہی میں تیار ہوئی ہے۔

تعلیم بالغان کے ایک کمیشن نے اپنی تحقیقات ابھی ابھی ختم کی ہے۔ اس کی گذشتہ روئیداد میں تمثیل، موسیقی اور آرٹ کے میدان میں مناسب اقدامات کے متعلق تجاویز تھیں۔

۷۔ اعلےٰ تعلیم

سویڈن کی پہلی سالانہ روئیدادوں میں جامعی تعلیم (University Education) کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا۔ یونیورسٹیاں اور اس طرح کے دیگر ادارے تعلیمی بورڈ کے ماتحت نہیں، بلکہ ایک خاص یونیورسٹی کے چانسلر (میر جامعہ) کے دفتر کے ماتحت ہیں۔ جو براہِ راست وزارتِ معارف کے ماتحت ہے۔ بہر حال، اس موقعہ پر یہ بیان کر دینا چاہیئے۔ کہ گذشتہ تین سالوں میں یونیورسٹی کے معاملات میں کچھ ایسا اصلاحانہ ردّ و بدل ہؤا ہے۔ جسے "جامعی تجدید" (University rearmament) کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ اصلاحات ۱۹۴۵ء کے مخصوص جامعاتی کمیشن، علوم طبیعیہ کے تحقیقاتی کمیشن اور شعبہ ہائے طبی کے تنظیمی کمیشن نے مرتب کی ہیں۔

۱۹۴۶ء کی پارلیمان کے فیصلوں میں ریاضیات اور علوم طبیعیہ کی تعلیم اور علمی تحقیقات کو فروغ دینا سب سے مقدم رکھا گیا تھا۔ اپسالا اور لونڈ کی یونیورسٹیوں میں نو پروفیسروں کی نئی اسامیاں (جن میں تحقیقاتِ موسیقی (Music Research)، کیمیائے طبیعی (Physical Chemistry)، کیمیائے حیاتیاتی (Bio-chemistry)، ارضیات (Geology)، رانجنیات (Roentgenology) کی پروفیسریاں بھی شامل ہیں) اور کچھ نئے تجربی معاونین کے دفاتر (Demonstrator's offices) اور سٹاک ہولم کے کیرولین میڈیکو سرجیکل انسٹی ٹیوٹ میں علم الجراثیم (Bacteriology)، نفسیاتی تشخیص (Psychiatric Juriopruduce) اور عصباتی جسمانیات

(Neuro-physiology) کی تین نئی پروفیسریاں قایم کی گئیں۔

اسی پارلیمان نے اور چیزوں کے علاوہ، موسمیاتی تحقیق وتعلیم کی از سرِ نو تنظیم کے متعلق اقدامات کرنے، اپسالا اور لونڈ کے سائنسی اور ریاضیاتی شعبوں کے کارکنوں اور معاونوں کی تعداد میں کافی اضافہ کرنے، سامان کے متعلق امدادی رقوم بڑھا دینے، علوم طبیعیہ کی تحقیق کے متعلق ایک مشاورتی مجلس (Natural Science Research Council) قایم کرنے، طب ہوائی (Aero medicine) اور سالمی قوت (Atomic energy) کے میدان میں تحقیقاتی کام کو سنبھالنے اور سٹاک ہولم کی غیر سرکاری اور قصباتی یونیورسٹی کے شعبہ ریاضیات وسائنس کو مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۴۷ء کی پارلیمان نے جو "تجدید واصلاح" کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا زیادہ تر مقصد ادبیات اور طب کے شعبوں کا فروغ تھا۔ اس طرح اپسالا کی یونیورسٹی کو سولہ[16]، لونڈ کی یونیورسٹی کو چودہ اور سٹاک ہولم کی کیرولین میڈیکو سرجیکل انسٹی ٹیوٹ کو پانچ نئی پروفیسریاں ملیں ان میں انگریزی زبان وادب، فرنساوی زبان وادب، سکینڈے نیویائی زبانیں، صوتیات، جغرافیہ، ادبیات، سیاسی اقتصادیات، معاشیات وعمرانیات، تاریخ قانون، جدید سیاسی اجتماعی تاریخ، علم التعلیم، علم دِق، عضویات، جلدیات (Dermatology) مع امراض جسمانی اطفال، نسیجیات (Histology) اور امراضِ متعدی کی پروفیسریاں قابلِ ذکر ہیں۔

یونیورسٹی کی بہت سی اوراسامیاں اور رفقائے جامعہ کی تعداد میں کافی نئی نشستیں قایم کی گئیں۔ علم وادب اور عمرانیات میں تحقیقی کام کے لئے فنڈ کا فیصلہ کیا گیا۔ ایک عمرانی تحقیقات کی مشاورتی مجلس بھی قایم کی گئی۔

یونیورسٹی کے ان طلبہ کو وظائف دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ جو اعلےٰ تعلیمی اسناد کی خاطر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ یا جنہیں افتتاحی تعلیمی مقالات وغیرہ چھپوانے میں مالی امداد

ضرورت تھی، یونیورسٹیوں کی عمارتوں میں بھی اضافہ کیا گیا۔ اور بہت سی عمارتوں کی یا تو توسیع کردی گئی یا انہیں دوبارہ تعمیر کرایا گیا۔

گذشتہ پارلیمان (جو ۱۹۴۸ء میں ہوئی) نے بھی پروفیسریوں کے لئے نئی اسامیاں قائم کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اگرچہ بہت تھوڑی تعداد میں یعنی کُل چھ اور وہ بھی تمام طب کے متعلق۔

یونیورسٹی لائبریریوں کی گرانٹ میں بھی گراں قدر اضافہ کیا گیا ہے۔ اِس سال پارلیمان نے اصولاً سٹاک ہولم اور گاتھن برگ کی غیر سرکاری یونیورسٹیوں کے مختلف شعبوں کو (۱۹۴۹ء سے) گرانٹ دینے اور گاتھن برگ میں ایک نیا طبی شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

موجودہ اقتصادی مشکلات نے جامعاتی تجدید کے سلسلے میں مزید اقدامات کو بہت حد تک روک دیا ہے۔ ابھی بہت سے مسائل جامعاتی کمیشن کے زیرِ غور ہیں +

اصطلاحی غور و فکر

(گذشتہ سے پیوستہ)

71. Senate

اس کے لئے مندرجہ ذیل ترجمے موصول ہوئے ہیں:۔

شعبۂ اعلےٰ، ایوان اعلےٰ، مجلس آئین ساز، مجلس وضع قوانین، مجلس اکابر، مجلس انتظامی، مجلس عمائد، جماعت عاملہ، مجلس نگران، ایوان جامعہ،

ان میں سے شعبہ تو موزوں نہیں مجلس اور جماعت کے الفاظ اگرچہ مفہوم کے قریب تر ہیں۔ تاہم ان میں وہ جلال نہیں جو Senate کے لفظ میں ہے۔ مجلس اکابر یا مجلس عمائد سے البتہ کچھ اس قسم کا مطلب ادا ہو جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک جامعہ کے ساتھ اس لفظ کے استعمال ہونے کا تعلق ہے۔ بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لئے ایوان کا لفظ استعمال کیا جائے۔ ایوان جامعہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

72. Dean

نگران، منتظم، رفیق، افسر اعلےٰ، مہتمم، ناظم شعبہ، کے مقابلے میں صدر شعبہ زیادہ جچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ افسر اعلےٰ عام ہے۔ رفیق بھی موزوں نہیں منتظم یا مہتمم 'Manager' کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ Dean کے لئے "صدر شعبہ" ہی بہتر ہے۔

73. Prospects

اس کے لئے بہت سے ترجمے موصول ہوئے ہیں۔

امید، رجا، توقع، دماغی منظر، فضا، سماں، منظر، مواقع ترقی، منافع، امکان ترقی،

امکانات ترقی، توقع کامیابی، توقعاتِ ترقی، صلاحیتیں وغیرہ اِن تمام میں سے "امکانات ترقی" ہی زیادہ موزوں ہے۔

74. Lecturer

شیخ، معلّم، اُستاد، مقرر وغیرہ سے تو بہتر یہی ہے۔ کہ لیکچرار ہی کہا جائے۔ یہ لفظ عام مستعمل بھی ہے اور بہت مانوس و مناسب بھی۔

75. Public Service Commission

اِس کے لئے چھ ترجمے موصول ہُوئے ہیں:۔

ادارہ خدمت قومی، ادارہ خدمت عامہ، ادارہ انتخاب ملازمین، مجلس انتخاب ملازمین، ادارہ ملازمت سرکاری، ادارہ خدمت سرکار،

ان تمام میں سے "مجلس انتخاب ملازمین" یا "ادارہ انتخاب ملازمین" قابلِ ترجیح ہے۔ ادارہ خدمت قومی یا ادارہ خدمت عامہ سے یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ خدمت خلق کی کوئی مجلس ہے اسی طرح ادارہ ملازمت سرکاری اور ادارہ خدمت سرکار بھی سرکاری کام میں امداد کی مجلس معلوم ہوتی ہے۔ ان میں انتخاب ملازمین کے وہ فرائض نہیں پائے جاتے۔ جو Public Service Commission کے سپرد ہوتے ہیں۔

76. Post

اِس کے لئے بعض حضرات نے "ڈاک" تجویز کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ ڈاک ہی کے لئے مستعمل نہیں ہوتا۔ بلکہ اصطلاحاً اسامی یا عہدے کے لئے بھی مستعمل ہوتا ہے۔ اور یہی دوسرا مفہوم زیادہ ترقابلِ غور ہے۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے اس اصطلاح کے مختلف ترجمے پہنچے ہیں:۔

منصب، اسامی، جگہ، عہدہ، موقف، مقام، ملازمت، خدمت، ان میں سے منصب، اسامی، عہدہ Post کے مفہوم کے زیادہ قریب ہیں۔ اسامی کا لفظ عام مستعمل ہے

لیکن اسے Vacancy کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ اور Post کے لئے "منصب" ہی اختیار کیا جائے۔ تو بہتر ہو گا۔

77. Minimum

کم از کم، کم سے کم، اقل، قلیل ترین مقدار۔
محل استعمال کے لحاظ سے چاروں ترجمے استعمال میں آ سکتے ہیں۔ لیکن عام طور پر "کم از کم" ہی اچھا ہے۔

78. Maximum

کُل، اکثر، اعظم، منتہا، غائت، انتہا، بڑی سے بڑی تعداد، بڑی سے بڑی مقدار، زیادہ سے زیادہ۔ ان میں سے اعظم، منتہا اور انتہا اور اکثر تو غیر موزوں ہیں۔ اور مفہوم کے لحاظ سے Maximum سے بہت دور۔ "زیادہ سے زیادہ" عام اور سہل ہے۔ "غائت" بھی موزوں ہے۔ "کُل" بھی کہیں کہیں استعمال ہوتا ہے مثلاً Maximum Marks کُل نمبر۔ لیکن عام طور پر استعمال کے لئے "زیادہ سے زیادہ" ہی قابل ترجیح ہے۔

79. Tentative

آزمائشی نظریہ، آزمائشی تجویز، تجربی، آزمائشی
نظریہ یا تجویز کی قید لگانے کی ضرورت نہیں۔ تجربی اور آزمائشی دونو بہتر اور موزوں ترجمے ہیں۔ لیکن چونکہ آزمائشی کو ہم "On Probation" کے لئے مخصوص کر چکے ہیں۔ اس لئے بہتر ہو گا۔ کہ Tentative کے لئے تجربی کو ترجیح دی جائے۔ ورنہ تجربی اور آزمائشی دونو استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

80. Notes

نوٹ، اشارات، مختصرات، حاشیے، مندرجات، اندراجات، یادداشت، شرح۔ کوئی آٹھ ترجمے موصول ہوئے ہیں لیکن ان سب میں سے اشارات اور مختصرات

"Note" کے لئے موزوں ہیں۔ اور چونکہ مختصرات کے مقابلہ میں "اشارات" زیادہ واضح ہی ہے۔ اور عام مستعمل بھی۔ اس لئے یہی ترجیح کے قابل ہے +

اصطلاحات زیر غور

81. Proceedings.
82. Incumbent.
83. Relief.
84. Disciplinary action.
85. Enquiry Committee.
86. Contingent.
87. Emergency.
88. Efficieny.
89. Net Income.
90. Counter-Signed.
91. Graduate.
92. Terms of reference.
93. Vice-Chancellor.
94. Declaration.
95. Time-Table.
96. Period.
97. Curator.
98. Bureau.
99. Constitution.
100. Chairman.
101. Intermediate Examination.
102. Aggregate.
103. Diploma.
104. Remuneration.
105. Testimonial.
106. Privilege Leave.
107. Syndicate.
108. Secretariat.
109. Plenipotentiary.
110. Status quo.

سرکاری جریدہ کے اعلانات

سررشتہ تعلیم، مغربی پنجاب

صیغہ رجال ——— شعبہ کالج

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	درجہ مشاہرہ	کس تاریخ سے مستقل قرار دئے گئے
۷ دسمبر سنہ ۴۸ء ۲۲۴۴۷-E	ڈاکٹر چراغ حسن ایم ایس سی پی۔ ایچ ڈی	لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور	۵۰-۱۰-۳۵۰	۱۰ اکتوبر سنہ ۴۸ء سے
"	م۔ عبدالرحمٰن رانا، ایم ایس سی	"	"	"
"	م۔ افتخار احمد غوری ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور	"	"
"	م۔ معزالدین، ایم اے	لیکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور	"	۱۱ اکتوبر سنہ ۴۸ء سے
"	م۔ محمد ضیاء اللہ، ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج کیمبلپور	"	"
"	م۔ ظفر حسین، ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور	"	"
"	رانا رشید احمد خان ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازیخان	"	۱۳ اکتوبر سنہ ۴۸ء سے
"	م۔ دلاور حسین، ایم ایس سی	لیکچرار گورنمنٹ کالج کیمبلپور	"	"
"	م۔ محمد عبداللہ خان ایم ایس سی (کیمیا)	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور	"	۱۴ اکتوبر سنہ ۴۸ء سے
"	م۔ بشیر احمد، ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور	"	۲۴ اکتوبر سنہ ۴۸ء سے
"	م۔ محمد اقبال انصاری ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج کیمبلپور	"	۲۷ اکتوبر سنہ ۴۸ء سے

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تقرر ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۱ دسمبر سنہ ۴۸ء ۲۲۴۵۵-۱	ڈاکٹر غلام جیلانی برق ایم اے پی ایچ ڈی	لیکچرار گورنمنٹ کالج کیمبلپور	ایس ای ایس (عملہ تحتانی) شعبہ کالج ۱۵۰-۱۰-۳۵۰	پی ای ایس (عملہ فوقانی) درجہ دوم (۱۵۰-۱۵-۲۰۰) عارضی مستقل	۱۵ اگست سنہ ۴۷ء سے	م۔ محمد جمیل واسطی کی جگہ جنکی خدمات سندھ مدرسہ کالج نے مستعار لی ہیں اور جنکا حق عہدہ اب ختم کر دیا گیا
"	م۔ غلام احمد ایم ایس سی	لیکچرار گورنمنٹ کالج۔ لاہور	"	"	"	م۔ تاج محمد خیال کی جگہ جنکی خدمات زمیندارہ کالج نے مستعار لی ہیں اور جن کا حق عہدہ اب ختم کر دیا گیا

نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تعین ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
محمد عبد العظیم ایم ایس سی	لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور	ایس ای ایس (عملہ تحتانی) شعبہ کالج ۱۵۰-۱۰-۳۵۰	پی ای ایس (عملہ فوقانی) درجہ دوم ۲۵۰-۵۰-۷۵۰ سب پروویژنل (عارضی مستقل)	۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے	ایچ۔ اے صوفی کی جگہ جو فوجی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور جن کا حق عود اب ختم کر دیا گیا ہے۔
کرامت حسین ایم اے	لیکچرار ڈی مونٹ مورینسی کالج سرگودھا	〃	〃	〃	مرزا نثار علی بیگ کی جگہ جو فوجی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور جن کا حق عود اب ختم کر دیا گیا ہے۔
محمد یونس ایم ایس سی	لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور	〃	پی ای ایس (عملہ فوقانی) درجہ دوم۔ قائم مقام	〃	ایم۔ اے مخدومی کی جگہ جو پی ای ایس درجہ اول میں قائم مقامی کر رہے ہیں۔
غلام رضا ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور	〃	〃	〃	ڈاکٹر محمد صادق سینئر لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور کی جگہ جو پی ای ایس درجہ اول میں قائم مقامی کر رہے ہیں
محمد رشید ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور	〃	〃	۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے ۳۰ ستمبر ۱۹۴۷ء تک	ڈاکٹر حشمت خان کی جگہ جو گورنمنٹ کالج لائل پور کے پرنسپل کی حیثیت سے پی ای ایس درجہ اول میں قائمقامی کر رہے ہیں
				یکم اکتوبر ۱۹۴۷ء سے	چودھری محمد صادق ایم اے کی جگہ جو پرنسپل گورنمنٹ کالج جھنگ کی حیثیت سے پی ای ایس درجہ اول میں قائمقامی کرتے ہیں

صیغہ رجال ——— شعبہ اسکول

نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تعین ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
غلام یسین خان نیازی اے پی ایچ ڈی	ناظر مدارس ضلع لائل پور	ایس ای ایس (عملہ تحتانی — مردانہ) ۲۳۰-۱۰-۳۰۰	پی ای ایس (عملہ فوقانی) درجہ دوم ۲۵۰-۵۰-۷۵۰ قائم مقام	۱۶ دسمبر ۱۹۴۷ء سے ۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء تک	میر محمد محسن کی جگہ جنکی خدمات حکومت پاکستان نے مستعار لی ہیں اور چودھری علی محمد ناظر مدارس ضلع ملتان کی خالی اسامی میں جو پی ای ایس میں عارضی مستقل ہو گئے ہیں۔
〃	〃	پی ای ایس (عملہ فوقانی) درجہ دوم قائم مقام	پی ای ایس (عملہ فوقانی) درجہ دوم (عارضی مستقل)	یکم فروری ۱۹۴۸ء سے ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء تک	کیپٹن محمد رفیع کی جگہ جو فوجی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور جنکا حق عود اب ختم کر دیا گیا ہے۔ اے محمد اسمٰعیل ہیڈ ماسٹر نارمل اسکول شاہ پور کی اسامی میں جو پی ای ایس درجہ دوم میں مستقل ہو گئے ہیں۔
〃	〃	پی ای ایس (عملہ فوقانی) درجہ دوم عارضی مستقل	پی ای ایس (عملہ فوقانی) درجہ دوم مستقل	۱۶ مئی ۱۹۴۸ء سے	م۔ برکت علی بی اے بی ٹی پی ای ایس ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ہاکا ل گرلو کی جگہ جو ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔
شبیر حسین ایم اے بی ٹی	ناظر مدارس ضلع راولپنڈی	ایس ای ایس (عملہ تحتانی) درجہ اول (۲۳۰-۳۰۰)	پی ای ایس (عملہ فوقانی) درجہ دوم عارضی مستقل	۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء سے ۱۵ جون ۱۹۴۸ء تک	کیپٹن سکندر خان کی جگہ جو فوجی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور جنکا حق عود اب ختم کر دیا گیا ہے اور چودھری علی محمد ناظر مدارس ضلع ملتان کی خالی اسامی کی جگہ جو اب پی ای ایس میں مستقل ہو گئے ہیں۔

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تعین ہؤا	کس تاریخ سے	کیفیت
۳۱ دسمبر ۱۹۴۷ء ۲۲۴۵۷۰	س- تشبیر حسین ایم اے بی ٹی	ناظر مدارس ضلع راولپنڈی	پی ای ایس (عملہ فوقانی) درجہ دوم (عارضی مستقل)	پی ای ایس (عملہ فوقانی) درجہ دوم مستقل	۱۶ جون ۱۹۴۸ء سے	خ- عزیز الدین احمد بی اے بی ٹی ناظر مدا(رس) لائلپور کی جگہ جو ملازمت سے سبکدوش ہو
۲۲ دسمبر ۱۹۴۷ء ۲۲۴۵۶۴-۱	م- اللہ داد نمبر۱: ۱۰۵-۱۴۰	معلم ڈرائنگ (نقشہ کشی) گورنمنٹ ہائی سکول حضرو (اٹک)	درجہ دوم شعبہ کلاسیکل ورنیکولر (۱۰۵-۷-۱۴۰)	درجہ اول شعبہ کلاسیکل ورنیکولر (۱۴۰-۱۰-۲۲۰) عارضی مستقل	۱۵ فروری ۱۹۴۸ء سے ۵ جون ۱۹۴۸ء تک	ایم-اے خورشید ہاشمی (۱۴۰- کی جگہ جو فوجی خدمات سرانجام دے ہیں اور جن کا حق عود اب ختم کر د ہے۔
"	"	"	درجہ اول شعبہ کلاسیکل ورنیکولر (۱۴۰-۱۰-۲۲۰) عارضی مستقل	درجہ اول شعبہ کلاسیکل ورنیکولر (۱۴۰-۱۰-۲۲۰) مستقل	۶ جون ۱۹۴۸ء سے	م- علی احمد اوٹی کی جگہ جو ملازمت سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔
"	م- غلام محمد نمبر۲: ۱۰۵-۱۴۰	معلم دستکاری گورنمنٹ ہائی سکول جام پور (ڈیرہ غازیخان)	درجہ دوم شعبہ کلاسیکل ورنیکولر (۱۰۵-۷-۱۴۰)	درجہ اول شعبہ کلاسیکل ورنیکولر (۱۴۰-۱۰-۲۲۰) عارضی مستقل	۶ جون ۱۹۴۸ء سے ۱۹ اگست ۱۹۴۸ء تک	ایم-اے خورشید ہاشمی کی جگہ جو فو سرانجام دے رہے ہیں۔ او حق عود اب ختم کر دیا گیا ہے۔
"	"	"	درجہ اول شعبہ کلاسیکل ورنیکولر (۱۴۰-۱۰-۲۲۰) عارضی مستقل	درجہ اول شعبہ کلاسیکل ورنیکولر (۱۴۰-۱۰-۲۲۰) مستقل	۲۰ اگست ۱۹۴۸ء سے	س- واجد علی شاہ نمبر ۳۶ (۱۴۰-۱۰- معلم نقشہ کشی سنٹرل ماڈل سکول لا جگہ جو ملازمت سے سبکدوش ہو ہیں۔
"	م- کریم بخش یوہا نمبر۳: ۱۰۵-۱۴۰	معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی سکول کوٹ ادو (مظفرگڑھ)	درجہ دوم کلاسیکل ورنیکولر (۱۰۵-۷-۱۴۰)	درجہ اول شعبہ کلاسیکل ورنیکولر (۱۴۰-۱۰-۲۲۰) عارضی مستقل	۲۰ اگست ۱۹۴۸ء سے	ایم-اے خورشید ہاشمی کی جگہ ج خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ ا حق عود اب ختم کر دیا گیا ہے۔

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہؤا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۰ جنوری ۱۹۴۹ء ۴۲۱-E	م- بشیر الدین بی اے بی ٹی (نمبر ۱۶۵: ۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول کہوٹہ	معلم انگریزی سنٹرل ماڈل سکول لاہور بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م- محمد اشرف خان ایم ایس سی (ر (۹۰-۱۵۰) کی جگہ جو گورنمنٹ کالج میں کام کر رہے ہیں۔ اور جن کا حق عو گورنمنٹ ہائی سکول کہوٹہ کو منتقل ک
۱۰ جنوری ۱۹۴۹ء ۴۲۴-E	س- رضا حسین بی اے (۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول پسرور	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ بمشاہرہ سابقہ	"	م- احمد دین بی اے کی جگہ جن کا ہو چکا ہے۔
"	م- احمد دین بی اے (۹۰-۱۵۰)	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول پسرور بمشاہرہ سابقہ	"	س- رضا حسین بی اے کی جگہ جن ہو چکا ہے۔
۱۲ جنوری ۱۹۴۹ء ۴۰۹-E	م- ذوالفقار علی بی اے بی ٹی نمبر ۴۶: ۱۵۰-۲۲۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول مٹھا ٹوانہ بمشاہرہ سابقہ	"	م- محی الدین خان بی اے بی ٹی (۹۰-۱۵۰) کی جگہ جو فوت ہو انا للہ۔

کیفیت	کس تاریخ سے	تبادلہ یا تقرر کہاں ہُوا	منصب	نام	...رہ احکام
م - ذوالفقار علی بی اے بی ٹی (نمبر ۶۴ : ۱۵۰ - ۲۲۰) کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے - اور اس اسامی میں جو م - محی الدین خان بی اے بی ٹی معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول ٹھاٹھوانہ کی وفات سے خالی ہوئی ہے -	تاریخ حاضری سے	قایم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول اکال گڑھ - درجہ سوم ایس ای ایس (عملہ تحتانی) ۹۰ - ۵ - ۱۵۰	ایک امیدوار	ملک محمد صادق ایم اے (جغرافیہ) بی ٹی	...ری ۱۹۴۹ء ۷۰
شیخ نور حسین معلم السنہ شرقیہ کی جگہ جو رخصت قبل از سبکدوشی پر ۱۳ دسمبر سے ہیں - اور جن کا حق عود اب سنٹرل موڈل سکول کی طرف منتقل کیا جاتا ہے -	۱۳ دسمبر ۱۹۴۸ء سے	معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی سکول فتح جنگ بمشاہرہ سابقہ (جو اب محکمہ پولیس میں کام کر رہے ہیں)	معلم السنہ شرقیہ سنٹرل موڈل سکول لاہور (جو اب محکمہ پولیس میں کام کر رہے ہیں -	م - عبدالرشید خان (۵۰ - ۳ - ۸۰ / ۴ - ۱۰۰)	...ی ۱۹۴۸ء ۷۱
م - عبدالرشید خان کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے - اور شیخ نور حسین کے حق عود کی جگہ جو رخصت قبل از سبکدوشی پر ہیں -	۱۳ دسمبر ۱۹۴۸ء سے ۱۴ فروری ۱۹۴۹ء تک	قایم مقام معلم السنہ شرقیہ سنٹرل موڈل سکول لاہور بمشاہرہ ۵۰ روپے ماہوار - درجہ مشاہرہ سوم کلاسیکل ورنیکولر	قایم مقام معلم السنہ شرقیہ سنٹرل ماڈل سکول لاہور (م. عبدالرشید خان کے حق عود میں جو اب محکمہ پولیس میں کام کر رہے ہیں)	م - نور حسین شاہ (۵۰ - ۳ - ۸۰ / ۴ - ۱۰۰)	،
شیخ نور حسین کی جگہ جو ۱۵ فروری ۱۹۴۹ء سے ملازمت سے سبکدوش ہو رہے ہیں -	۱۵ فروری ۱۹۴۹ء قبل از دوپہر سے	قایم مقام معلم السنہ شرقیہ سنٹرل موڈل سکول لاہور -	″	″	،
مستقل قرار دئے گئے ہیں -	۷ جولائی ۱۹۴۸ء سے		معلم گورنمنٹ ہائی سکول شورکوٹ - عملہ تحتانی درجہ سوم (۹۰ - ۵ - ۱۵۰)	م - صلاح الدین بی اے بی ٹی	...ری ۱۹۴۹ء ۶۲۲
مستقل قرار دئے گئے ہیں -	۸ نومبر ۱۹۴۸ء سے		″	م - امیر محمد خان بی اے بی ٹی	،

اِسلام کے عالمگیر اصول

مصنّفہ — علامہ فرید وجدی مصری

ترجمہ — سید احمد حسن نقوی

مصر کے نامور فلسفی علامہ فرید وجدی کی مشہور کتاب "الاسلام دین عام خالد" کا اُردو ترجمہ جس میں اسلامی اصول کا علم و فلسفہ کی روشنی میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ وہ بھی اُس دور میں جبکہ مغرب میں نئی نئی ایجادات نے مغربی قوموں کے ہمہ گیر سیاسی اقتدار کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ جب سائنس کی کرشمہ سازیوں سے مشرقی اقوام بھی اثر انداز ہو رہی تھیں۔ یہاں تک کہ مذہب اسلام پر بھی زد پڑ رہی تھی۔ چنانچہ فاضل مصنّف نے اقوام عالم کے سامنے واضح کیا ہے۔ کہ اسلام کو سائنس سے کوئی پُرخاش نہیں۔ بلکہ اسلامی تعلیمات ہی سائنس کا مظہر ہیں۔ "اسلام کے عالمگیر اصول" میں معاندین و مخالفین اسلام کے نظریات و اعتراضات کا مدلّل جواب ہے۔ تمدن و معاشرت کے موجودہ سینکڑوں قوانین کے مقابلہ میں اسلام کے ہمہ گیر اور حیرت انگیز اصول پیش کئے گئے ہیں۔ جن سے اسلام کی سربلندی و سرفرازی کو چار چاند لگ گئے۔ اور جو آج بھی ہماری رہنمائی کے لئے اٹل ہیں۔

ترجمہ نہایت آسان اور عام فہم زبان میں کیا گیا ہے۔ جس سے نئی تصنیف کا شبہ ہوتا ہے۔ قیمت مجلد تین روپے۔

ہماری دیگر بلند پایہ اسلامی مطبوعات کے لئے فہرست مُفت طلب فرمائیں۔

کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور

"عرفانِ اقبالؒ"

اور

"افاداتِ نیازی"

مصنّفہ۔ صاحبزادہ بشیر محمد نفی

مفکرِ اعظم حکیم اسلام شاعرِ مشرق علامہ اقبال علیہ الرحمتہ کے انقلابی عالمگیر روحانی عرفانی پیغامات اور عمیق فلسفیانہ نظریات کا ایک مخصوص تحقیقی مطالعہ ——

اقبالؒ کے محسن روحانی کی "درسگاہِ علم و معرفت" "پانی پت" کے افادات ثقافتِ اسلامیہ اور آپ کے ہمہ گیر بین الاقوامی آفاقی مشن کے متعلق نادر و اہم رموز و نکات ——

اقبالؒ کی ادبی عظمت و روایات کا پس منظر

اقبالؒ کے بلند و بالا آفاقی آرٹ کے نتائج

خودشناسی خداشناسی کے رموز و حقائق

فقرِ محمدی کی سطوتِ کبرائے عصرِ حاضر کے نام روحانیتِ اسلام کا پیغام

مولانا ماہر القادری۔ علامہ سید سلیمان ندوی۔ پروفیسر مولانا شاہ عبدالغنی نیازی ایم۔ اے جبل پوری کے افکار و مباحثات پر ایک نظر۔

نوجوانانِ ملت کو اقبالؒ کی سچی محبت و عقیدت کی دعوت۔ اقبالیات میں ایک نادر کتاب کا اضافہ

قیمت مجلد صرف تین روپے

کتاب منزل کشمیری بازار۔ لاہور

● "آموزش" ہر ماہ شائع ہوتا ہے، سالانہ چندہ چھ روپیہ ہے
نیز چندہ مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور کے نام روانہ کریں۔

● مضامین ایڈیٹر "آموزش" سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور
کو ارسال کئے جائیں۔ اشاعت کے لئے منظور شدہ
مضامین کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

● "آموزش" تمام تعلیمی حلقوں میں مقبول اور جملہ تعلیمی اداروں
میں رائج ہے۔

● "آموزش" میں اشتہار دیکر آپ تعلیم یافتہ جماعت
میں مشہور و مقبول ہو سکتے ہیں۔

● اشتہارات اور دوسرے کاروباری معاملات کے لئے
مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور سے مراسلت کریں۔

مارچ سنہ ۱۹۴۹ء

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس، ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔

لاہور

مدیر:-

محمد ناظر

ناشر
کتاب منزل
لاہور

مارچ ۱۹۴۹ء
جلد : ـــ ۱
شمارہ :- ۱۱ـــ۱۲

قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ

سالانہ چندہ:-
پاکستان کیلئے: ۶ روپے
غیر ممالک کیلئے: ۸ روپے

رموز

دو صدیوں کی غلامانہ بود و ماند کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ کہ غلاموں میں کاہلی، حرص، خود غرضی، بزدلی، ظلم اور جہالت کے متعدی امراض پیدا ہوں۔ بے انصافی کے مظاہرے ہوں، امتیاز من و تو ہو، اذہان منتشر ہوں، ذلتِ افلاس بڑھ کر جرائم کی مرتکب ہو، اور جلب منفعت و زرطلبی کی اندھی خواہش میں خود فراموشی، خود فروشی، بددیانتی، سیہ کاری، فریب و کذب، نمود و نمائش اور بغض و حسد کی کمینہ عادات جڑ پکڑیں۔ یہی وہ جہزا ہے جو محکومی کی جادوگری نے اس برعظیم کی بدنصیب معاشرت کو دو صدی کی مجبور اطاعت کے صلے میں عطا کی۔ اور یہی وہ ورثہ ہے جو بھاگتی ہوئی غلامی ان غلاموں کے لئے چھوڑ گئی۔ گذشتہ عہدِ غلامی کا رونا کہاں تک رویا جائے۔ ہمارے معاشرے کا عضو عضو مفلوج اور مریض ہے۔ اور اس پر سرمایہ و محنت کی کشمکش نے مزید غضب ڈھا رکھا ہے۔

غلامانہ زنجیریں ٹوٹ جانے کے بعد معاشرے کے سر سے استبداد کا سایہ تو ہٹ چکا ہے۔ لیکن اس استبداد کی زخم خوردہ معاشرت میں اس کے اثرات ان قبیح عادات کی صورت میں ہنوز باقی ہیں۔ معاشرت کو خطرہ لاحق ہے۔ اور وہ اصلاح و حفاظت کی خاطر مصلحانہ اقدام کے لئے ہر طرح محتاج ہے۔

آزادانہ فضا میں معاشرت کو اب تعمیرِ جدید کا لائحہ عمل تیار کرنا ہے۔ اور ایسا لائحہ عمل

کہ جس سے غلامانہ عہد کی یادگار مندرجہ بالا بدعادات کا ازالہ ہو جائے۔ عدل ومساوات اور اخوت کے زرّیں اصولوں پر تعمیر جدید کی بنیادیں قائم ہوں۔ اور افرادِ قوم میں زندہ قوموں کے افراد کی خوبیاں پیدا ہوں۔ وہ چست ہو جائیں۔ ان میں ایثار کا مادہ پیدا ہو۔ دلیری اور جرأت سے کام لیں۔ ان کے دلوں میں ہمدردی، خلوص اور محبت کے جذبات چمک اُٹھیں، حوصلہ اور قناعت ان کا شیوہ بن جائے۔ دیانت ان کا اصول عمل ہو، وہ اپنے آپ کو پہچانیں۔ صداقت اور ایمانداری ان کا شعار ہو، اور ذہنی پریشانی کی جگہ انہیں جمعیت خاطر نصیب ہو۔

ایسا نسخۂ کیمیا سوائے اسلام کے کہیں سے ہاتھ نہیں آئے گا۔ اسلام ہی تمام بدیوں کا مداوا اور تمام خوبیوں کا خلاق ہے۔ وقت کی اہم ضرورت اسی سے پوری ہو سکتی ہے۔ اور موجودہ معاشرتی قباحتوں کا ازالہ اسی سے اور صرف اسی سے ممکن ہے۔

اصلاح ہمیشہ تعلیم کے ذریعے ہوا کرتی ہے۔ تعلیم کی اہمیت اس قدر زیادہ ہے۔ کہ قوم کی معاشرت، تہذیب، عمران و تمدّن کی بُری بھلی تشکیل اسی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ بُری قسم کی تعلیم سے قوموں کو پستی و انحطاط کے اسفل گڑھوں میں دھکیلا جا سکتا ہے۔ اور اچھی قسم کی تعلیم سے حضیض انحطاط سے قوموں کو اُٹھا کر رفعت کے فلک الافلاک تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ انفرادی سیرت کی تعمیر بھی تعلیم سے ہوتی ہے اور اجتماعی کیریکٹر بھی اسی سے بنتا ہے۔ گویا قوم کی رفعت و تہذیب کی تشکیل کے لئے صحیح مقاماتِ عمل وہ گہوارے ہیں جن میں قوم کی اُمیدیں پلتی اور نشوونما لیتی ہیں۔ تربیت و نشوونما دینے والے گہوارے ہی قوم کے آڑے وقت میں کام آتے ہیں۔ درسگاہیں قومی تقدیر کا سانچہ ہوتی ہیں جس قسم کی ذہنیتیں اور جس قسم کی سیرتیں درسگاہیں پیدا کرتی ہیں۔ اسی قسم کی رفعت وحیثیت اس قوم کو حاصل ہوتی ہے۔ جس کے افراد وہاں تعلیم پاتے ہیں۔ درسگاہیں قوم کا دارالتعمیر بھی ہیں اور دارالعلاج بھی۔

ہماری موجودہ معاشرت کی بُرائیاں اصلاح کی خاطر اس بات کی متقاضی ہیں ۔

ہمیں اسلامی اصولوں کی تعلیم دی جائے۔ اور ہمارے افکار و کردار کو اسلامی تقویت دی جائے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہمارے اُس تعلیمی نصاب کو جو عہدِ غلامی کی یادگار ہے سراسر بدل دیا جائے۔ انحطاط کی طرف لے جانے والے تمام عناصر سے اسے پاک کر کے اسے اسلامی اصولوں پر ڈھالا جائے اور اسلامیات پر خاص زور دیا جائے۔ تاکہ قوم کے افراد اپنے آپ کو پہچانیں۔ اور اپنی صحیح قومی تعمیر کے لئے کوشاں ہوں۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے اربابِ اقتدار کو اس چیز کا زبردست احساس ہے۔ اور وہ اس قسم کے اقدامات کے لئے بے تابی سے مصروفِ عمل ہو رہے ہیں۔

وزیرِ اعظم پاکستان آنریبل لیاقت علی خان صاحب نے پنجاب یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم سندات کے موقعہ پر اپنے خطبے میں نہایت بلیغ الفاظ میں طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"غلامی کی لعنت اب ختم ہو چکی ہے۔ اور اب آپ کے سامنے واضح اور صاف میدان ہے۔ بے شک آپ کا کام بڑا محنت طلب ہے۔ تاہم اتنا بلند ضرور ہے کہ اس کے لئے جانفشانی سے کام کیا جائے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ ایک دیوانی دنیا میں صحیح اخلاقی اقدار کو زندہ رکھیں۔ کرۂ ارض میں موجودہ کشمکش اور اضطراب کا حل اس سے بہتر نہیں ہے۔ جو اسلامی روایات نے انسانی مساوات اور سماجی عدل کے اصولوں میں پیش کیا ہے۔ اب یہ آپ کا کام ہے کہ اسلام کے اس پیغام امن اور خوشنودی کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں اور اسے ایک زندہ حقیقت بنا دیں۔ کمرِ ہمت باندھیئے اور اس عمدہ کام کو انجام دینے کے لئے تیار ہو جایئے۔"

وزیرِ تعلیم پاکستان آنریبل مسٹر فضل الرحمٰن نے پشاور میں مشاورتی بورڈ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"موجودہ وقت کی سرمایہ و محنت کی خطرناک کشمکش اور برائیوں میں ہمارا مداوا اسلام ہے۔ اسلام ہماری تمام وقتی ضروریات پوری کرتا ہے۔ ہم موجودہ دنیا کی برائیوں کا مقابلہ کمیونزم کی قسم کی دباؤ ڈالنے والی تحریکوں کے ذریعے سخت گیر انتظامی مشینری کو حرکت میں لا کر نہیں کر سکتے۔

لیکن اسلام کے ساتھ محض رسمی اظہارِ ہمدردی احمقانہ ہو گی۔ ہمیں یہ خیال رکھنا چاہیئے ۔ کہ ہماری قومی سرگرمیوں کے ہر شعبے میں یہ نظریہ کار فرما ہے۔ اور چونکہ تعلیم ہر ملک کی بنیادی سرگرمی ہوتی ہے۔ اس لئے مجھے احساس ہے۔ کہ ابتدا یہیں سے شروع کی جانی چاہیئے۔ پاکستان کے تعلیمی نظام پر اسلامی اصولوں کو جس کی خصوصیات عالمگیر اخوت، انصاف اور رواداری ہیں اثر انداز ہونا چاہیئے۔ پاکستان کی تمام آبادی کو ایسی تعلیم دی جانی چاہیئے جس کی بدولت وہ اسلامی اصولوں کی صحیح قدر و اہمیت پہچاننے کے قابل ہو سکیں۔ ہماری نوزائیدہ مملکت میں تعلیم کا کردار نہایت ہی تخلیقی اور اُبھارنے والا ہونا چاہیئے۔"

اسلامی اصول و قوانین کی پابندی کی اس اہم ضرورت نے اسلامی تعلیم کی اہمیت سب کی نظروں میں قائم کر دی ہے۔ اور اب یہ تقاضا زوروں پر ہے کہ مدارس میں اسلامی تعلیم رائج کر دی جائے۔

اسلامی تعلیم کے اجرا کی صرف یہی صورت نہیں کہ اسے بحیثیت موضوع دینیات یا اسلامیات کے نام سے درسی نصاب میں شامل کر دیا جائے۔ اس سے اصل مقصود کی تحصیل دشوار ہے۔ اصل مقصود تو یہ ہے کہ اسلامی آئین و اصول ہمارے اعمال میں جھلکیں، ہماری زندگی اسلامی سانچے میں ڈھل جائے اور غلامانہ زندگی کی بدعادات جو ہمارے معاشرے کو خراب کر رہی ہیں۔ دُور ہو جائیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اس کا تعلق عمل سے ہے۔ زبانی تلقین اور نصابی تعلیم سے ذہنی اصلاح تو شاید کسی حد تک ہو جائے لیکن عملی اصلاح کی ضرورت اس سے پوری ہونی مشکل ہے حالانکہ یہی سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کے لئے ہمیں عملی فضا پیدا کرنا ہو گی۔ زبانی لفاظیوں اور صحیح اصول و آئین اور طرزِ عمل کے متعلق گفتاری ہمہوں کا ہمارے معاشرے میں قحط نہیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ عمل ہے۔ عمل میں نقص و عیب نہ ہوتا۔ تو پھر معاشرے کی بدحالی کا رونا کیوں رویا جاتا۔ اور اصلاح کی ضرورت ہی کیوں پیدا ہوتی۔

اسلام تعلیم کی تین صورتیں بتاتا ہے۔ زبانی، قرآنی اور عملی۔ ان میں سے آخری پر بہت

زیادہ زور ہے۔ کیونکہ زبانی اور قرآنی تعلیم کا اصل مقصود عمل ہے۔

اسلامی اخلاق و اقدار کی تعلیم بھی اسی نہج پر ہونی چاہیئے۔ اور یہ کام عام مدارس اور دینی مدارس دونوں بخوبی سرانجام دے سکتے ہیں۔ قرآنی یا نصابی تعلیم کے لئے تو مخصوص قابلیت و صلاحیت کے معلّم اور علیحدہ مقررہ وقت کی ضرورت ہوگی۔ لیکن عملی تعلیم میں تمام معلّمین غیر محدود اوقات میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ اکثر اخلاقی اقدار ایسی ہیں۔ کہ طلبہ کو دورانِ تعلیم میں ان کی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے۔ بدعادات سے بچایا جا سکتا ہے۔ اور اچھی عادات کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً نقل کرنا، جرم کرنا، جھوٹ بولنا، لائبریریوں کی کتابیں چرانا اور اسی قسم کے اور عیوب بظاہر معمولی سے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا مناسب اور بروقت انسداد نہ کیا جائے۔ تو معاشرے کے لئے بالآخر خطرناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور یہی بعد میں سرقہ، فریب، دروغ گوئی، غیبت، خود غرضی، غصب مال، ظلم، وغیرہ مخرب قوم عیوب کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں۔ دورانِ تعلیم میں ان بدعادات کو دُور کرنے کی تدابیر ہر معلّم کر سکتا ہے اور ان کے مقابل اچھی عادات پیدا کرنے کے لئے مناسب مواقع مہیا کر سکتا ہے۔ بہت سی اخلاقی اقدار اور اسلامی اوامر و نواہی اسی طرح سکھائے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان اوامر و نواہی کی عملی تعلیم دینے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ خود ان کا عملی طور پر پابند ہو۔ معلّم کی عملی زندگی طلبہ کے لئے نمونے کا کام دیتی ہے۔ طلبہ اکثر اعتقادی حمیت کے ساتھ استاد کی نقالی کرتے ہیں۔ جو کچھ اُستاد کرتا ہے اُنہیں درست اور قابلِ عمل نظر آتا ہے۔ اور جو چیز اُستاد کے عمل میں ظاہر نہ ہو۔ یا اُستاد کا عمل جس چیز کے خلاف نظر آئے۔ وہ کبھی خلوص کے ساتھ اس چیز پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ بے نماز اساتذہ کے ماحول میں طلبہ نماز پڑھنے کے عادی نہیں ہو سکتے۔ طلبہ کے لئے سچ بولنے کی پابندی ہزار طریق سے لگائی جائے۔ لیکن اگر انہیں نظر آئے کہ ان کا اُستاد خود سچ نہیں بولتا، بلکہ جھوٹ کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ تو ان کے دماغ میں سچ کی عملی اہمیت مرکوز نہیں ہو سکتی۔ نہ ہی وہ خلوص سے اس طرف راغب

ہو سکتے ہیں۔ مدرس کا عملی نمونہ بننا ضروری ہے۔ اور اب جب کہ ہم محسوس کر رہے ہیں۔ کہ ہمارا رہن سہن اسلامی شعار کے مطابق ہو' ہمارے دل ودماغ میں اسلامی طرزِ عمل کے جذبات چمکیں' ہماری معاشرت کی بدیاں دُور ہوں' اور وہ اسلامی رنگ روپ اختیار کرے تو اور بھی ضروری ہوگیا ہے کہ ہماری تدریسی فضائیں اسلامی اصول وضوابط کی پابندی کے اچھے نمونے پیش کریں۔ اسلامی آئین واصول کی پابندی کی تعلیم مطلوب ہے۔ تو مدرسین اپنے آپ کو اسلامی قوانین کا عامل ثابت کریں۔

رسم الخط' تدوین تاریخ' توسیع تعلیم' معلّمین کا اقتصادی واجتماعی وقار وقت کے اہم تعلیمی مسائل میں سے ہیں۔ اور ان کی طرف فوری توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اربابِ اقتدار ان چیزوں کے سلسلے میں ہر طرح مصروف سعی واجتہاد ہیں۔ حال ہی میں تعلیم کے مرکزی مشاورتی بورڈ نے اجلاسِ پشاور میں ان کے متعلق اہم قراردادیں حکومتِ پاکستان سے سفارشات کی صورت میں پاس کی ہیں۔

(۱) حکومتِ پاکستان سے سفارش کی گئی ہے کہ اُردو کے رسمِ خط کے متعلق ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو عربی رسمِ خط کا جائزہ لے اور حکومت کے سامنے اس سلسلے میں تفصیلی رپورٹ پیش کرے۔ اس قرارداد میں مزید کہا گیا ہے کہ بورڈ کی رائے ہے کہ پاکستان کی تمام علاقائی زبانیں ایک ہی رسمِ خط میں لکھی جائیں۔ اس مقصد کے لئے عربی رسمِ خط سب سے زیادہ مفید ہے۔

(۲) حکومت پاکستان سے سفارش کی ہے۔ کہ ماہرین تاریخ سے برِعظیم پاک وہند کی نئی تاریخ لکھائی جائے جس میں مسلمانوں کی اُن خدمات کو واضح کیا جائے جو انہوں نے تہذیب وتمدّن کی ترقی کے لئے کی ہیں۔

(۳) تجویز کیا ہے کہ مشرقی ومغربی پاکستان میں تمدّنی وثقافتی تعلقات کو اور زیادہ بڑھانے کے لئے مغربی پاکستان کے اسکولوں میں بنگالی اختیاری زبان کی حیثیت سے شامل

دی جائے۔

(۴) حکومتِ پاکستان سے درخواست ہے کہ تعلیمی اخراجات کو پورا کرنے کے لئے حکومت ڈیوں اور دوسرے آمدنی کے وسائل پر مزید ٹیکس عائد کرے۔

(۵) سفارش کی ہے کہ اُستانیوں اور اُستادوں کی تنخواہوں میں فرق نہ ہونا چاہیئے۔

نیوایجوکیشن فیلوشپ کی کانفرنس ۲۸ - ۲۹ - ۳۰ جنوری کو منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت جناب بشیر احمد صاحب ہاشمی ایم۔اے - ایم ایڈ (لیڈس) ڈائرکیٹر تعلیمات حکومت مغربی پنجاب نے فرمائی مجلس استقبالیہ کی طرف سے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ اعلٰے پیمانے پر تعلیمی نمائش ہوئی۔ جس میں مقامی اور بیرونی مدارس کے علاوہ سنٹرل ٹریننگ کالج اور سنٹرل ماڈل سکول لاہور کا کافی اور مفید تعلیمی سامانِ نمائش پیش کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس کی تین دن بڑے زور وشور سے گہما گہمی رہی - ایک ہزار سے زیادہ مندوبین نے شمولیت کی۔ ڈراموں اور تعلیمی فلموں کے پروگرام کے علاوہ مقالات اور تقاریر کے لئے چھ بڑی اہم نشستیں منعقد ہوئیں۔ جن میں تعلیمِ بالغان' تعلیم صحت جسمانی' تربیت اساتذہ بہام تعلیمی مسائل پر تقاریر ہوئیں۔ اور مقالات پڑھے گئے۔ گرما گرم بحثیں بھی ہوئیں۔ تعلیمی مشاعرہ بھی ہوا۔ اور بہت سے مفید ریزولیوشن بھی پاس ہوئے۔ خواتین کی علیحدہ نشستیں بھی قائم ہوئیں۔ تعلیمی اہمیت کی بنا پر کانفرنس کی تمام کارروائی اس بات کی مستحق ہے۔ کہ اس کی مفصل روداد پیش کی جائے اور وہ بیش بہا اور مفید تعلیمی مقالات جو اس کے مختلف اجلاسات میں پڑھے گئے۔ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی خاطر شائع کئے جائیں۔ اس لئے ادارہ آموزش نے فیصلہ کیا ہے کہ اپریل میں آموزش کا کانفرنس نمبر شائع کیا جائے۔ اس سلسلے میں اہتمامات شروع کر دئے گئے ہیں۔

آموزش کا پہلا شمارہ کچھ غیر معمولی موانع کی بنا پر بجائے اپریل ۱۹۴۸ء کے مئی ۱۹۴۸ء میں شائع ہؤا تھا۔ اب اس کا پہلا سال ختم ہونے کو آیا ہے۔ اور ادارہ کا خیال ہے۔ کہ آموزش کا نیا سال ہمیشہ تعلیمی سال کے آغاز (یعنی اپریل) سے شروع ہؤا کرے۔ چونکہ مارچ ۱۹۴۹ء میں پہلا سال ختم کرنے اور اپریل ۱۹۴۹ء سے آموزش کے نئے سال کو شروع کرنے سے سال گذشتہ کے ایک نمبر کی کمی واقع ہوتی ہے۔ اس لئے ادارہ نے یہ مناسب سمجھا ہے۔ کہ مارچ کا شمارہ سالنامے کی حیثیت سے شائع کیا جائے۔ اس کی ضخامت قریباً دگنی کر دی جائے۔ اسے دو شماروں کا قائم مقام سمجھا جائے۔ چنانچہ یہ شمارہ گذشتہ شماروں کے مقابلے میں تقریباً دگنی ضخامت کے ساتھ حاضر خدمت ہو رہا ہے۔ اُمید ہے۔ قارئینِ آموزش اس اقدام کو نظرِ استحسان سے دیکھیں گے ؛

اُردو رسمُ الخط

عبدالغنی ہمایوں

مملکتِ پاکستان کے منصہ شہود پر آجانے کے بعد منجملہ دیگر مسائل کے رسم الخط کا مسئلہ بھی ہمارے خواص و عوام کی توجہ کا مرکز بن گیا ہے۔ سفید فام آقاؤں سے گلو خلاصی حاصل کر لینے کے بعد اس "کلام الملوک" سے چھٹکارا پانے کی خواہش کا پیدا ہونا بھی ایک قدرتی امر تھا۔ جو ہمارے دفاتر، کاروباری حلقہ جات اور زندگی کے بیشتر شعبوں پر چھائی ہوئی ہے۔ ملک کا بیشتر حصہ اُردو کو انگریزی کے منصبِ جلیلہ پر جلوہ افروز دیکھنے کا ایک مدت سے متمنی تھا۔ چنانچہ اب اُردو کو پاکستان کی سرکاری اور ملکی زبان قرار دے دیا گیا ہے اور یہ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہی زبان ہمارے ملک کی اکثریت کو پسند ہے۔ کسی قوم کی ترقی میں اس ملک کی زبان کو بہت حد تک دخل ہے۔ ایسی قوم کے لئے جس کی زبان اعلیٰ لسانی خوبیوں کی حامل ہو ترقی کے میدان میں بہت سی سہولتیں مہیا ہوتی ہیں۔ خصوصاً اس نشر و اشاعت کے زمانے میں جبکہ ہم اپنے خیالات تمام دنیا میں پھیلا سکتے ہیں اور اس ایجادات کے زمانے میں جب کہ ہر روز نئی نئی اصطلاحیں اور نئے نئے نام وضع کرنے پڑتے ہیں زبان کا مسئلہ زیادہ اہم ہو گیا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے لئے انگریزی کا نعم البدل اُردو کے سوا اور کچھ نہیں

ہوسکتا تھا لیکن یہ زبان (اُردو) جس میں ہم اپنے خیالات و جذبات کی باحسن طریق ترجمانی کر سکتے ہیں۔ جو ہمارے آباؤ اجداد کی صدیوں کی کاوشوں کے نتیجہ میں پروان چڑھی۔ جس میں ہمارا بیشتر قومی و مذہبی لٹریچر محفوظ ہے۔ جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور جو متحدہ ہندوستان میں بھی Lingua Franca کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک نقص رکھتی ہے۔ اور وہ ہے اس کا رسم الخط۔ جو اس کی درخشندہ پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ بنا ہؤا ہے۔ یہ نقص اس زبان کی ترقی کے راستہ میں سدِ راہ ثابت ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے ہم کسی مشکل کا جو ہمارے راستہ میں حائل ہو احساس کرتے ہیں۔ پھر اس کو دُور کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس مشکل کو رفع کرنے کے لئے عملی اقدام کرتے ہیں۔ جس قدر شدّت سے کسی مشکل کا احساس ہو اتنا ہی زیادہ ہم اسے رفع کرنے کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُردو زبان کے اس نقص کا احساس ایک نیک شگون ہے اور مبارک فال۔

نستعلیق :-

نستعلیق کے نقائص عیاں ہیں۔ ان پر زیادہ بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں۔ پریس میں اس امر پر بارہا اس وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہ اُردو ادب میں تھوڑی بہت دلچسپی رکھنے والا بھی اس امر سے بخوبی واقف ہے۔ کہ حروف کی منحنی و مخروطی شکلیں ایسے ٹائپ کی ایجاد کے راستہ میں حائل ہیں۔ جس پر اُردو الفاظ کی چھپائی اسی سہولت اور تیزی سے ہو سکے۔ جیسے انگریزی کی ہو سکتی ہے۔ جب تک اُردو کا ٹائپ نہ بنے نشر و اشاعت میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ ہمیں عوام کو خواندہ بنانے کے لئے اور نئی نئی سکیموں اور نظریوں سے عوام کو روشناس کرانے کے لئے نشر و اشاعت کی بے حد ضرورت ہے۔ رسم الخط کی موجودہ صورت میں ایسے ٹائپ کی ایجاد مشکل ہے۔ جو کماحقہٗ فائدہ مند ثابت ہو سکے۔ اس لئے ہمیں ایسے رسم الخط کی ضرورت ہے۔ جس سے ہماری زبان کی لکھائی چھپائی

آسان ہو جائے۔ اور ہم ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش چل سکیں۔

رومن اُردو۔

رسم الخط کے ضمن میں جتنی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ ہمیں ان پر غیر جانبدارانہ طور پر غور کرنا چاہیئے۔ اور ان کے حسن و قبح کا موازنہ کر کے بلاتعصب اس رسم الخط کو قبول کر لینا چاہیئے جو ہمارے لئے زیادہ مفید ہو۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے رومن رسم الخط کو لیں اس طرزِ تحریر کو رائج کرنے کی آج سے کئی سال پیشتر کوشش کی گئی۔ اور ملک کا کافی حصّہ اس سے روشناس بھی ہے۔ لیکن یہ رسم الخط مقبول نہیں ہو سکا۔ کیونکہ جس شکل میں یہ رائج ہے وہ قطعاً ناقابلِ برداشت ہے۔ اِس کا رواج زیادہ تر فوجی حلقہ تک ہی محدود رہا ہے۔ چونکہ فوج میں رہنے والے ہندوستانیوں کی اکثریّت انگریزی سے ناآشنا تھی۔ اور انگریز افسروں کے لئے ایک محدود عرصہ میں اُردو طرزِ تحریر میں مہارت حاصل کر لینا ایک مشکل امر تھا۔ اس لئے انہوں نے ہندوستانیوں سے رابطہ پیدا کرنے کے لئے رومن طرزِ تحریر کو رواج دیا۔ ظاہر ہے کہ نہ تو وہ اس کے نقائص سے آگاہ ہو سکتے تھے۔ اور نہ ہی انہوں نے ان نقائص کو رفع کرنے کی طرف کوئی توجہ کی۔ بعض حضرات رومن رسم الخط کا نام سُن کر ہی چڑ جاتے ہیں۔ کیونکہ اس نام کے سُنتے ہی ان کے سامنے رومن اُردو کی وہ شکل آجاتی ہے۔ جو اس وقت فوجی حلقوں میں رائج ہے۔ لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کو ان لوگوں نے اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لئے رائج کیا تھا۔ جن کو اُردو کی صوتیاتی مشکلات کا قطعاً علم نہیں تھا۔ ان کے نزدیک "صاحب" اور "ساہب" میں کوئی فرق نہ تھا۔ جو مانگتا کو "مانگٹا" کہہ کر اپنا مطلب حل کر لیتے تھے۔ اس لئے ان کو اس میں ترمیم و تنسیخ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ کیا مناسب ردّ و بدل کے ساتھ اس رسم الخط کے نقائص رفع کر کے اس سے کماحقہٗ فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اگر ایسا کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر اس کے اختیار کر لینے میں ہمیں کوئی عذر نہیں

ہونا چاہیئے۔ بشرطیکہ کوئی دوسرا طریقہ اس سے بہتر معلوم نہ ہو جائے۔

نستعلیق کے مقابلہ میں اس کی خوبیاں یہ ہیں۔ کہ اس کا ٹائپ موجود ہے۔ جس میں حروف جُدا جُدا لکھے جاتے ہیں۔ اور ایک ہی کرسی پر لکھے جاتے ہیں۔ ان کی شکلیں تبدیل نہیں ہوتیں۔ نستعلیق میں ایک ہی حروف مختلف جگہوں پر مختلف شکلیں اختیار کر جاتا ہے۔ مثلاً بھلی۔ بستہ۔ بارہ۔ کبھی۔ کعبہ۔ بابو۔ سہراب۔ وغیرہ میں ب اور ہ کی مختلف شکلوں کو ملاحظہ فرماویں۔ علاوہ بریں رومن طرزِ تحریر میں اعراب حروف کے اندر ہی شامل ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو ٹائپ کرنے میں دِقت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن نستعلیق میں وہ حروف کے اُوپر نیچے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو ٹائپ کرنے کے لئے بار بار Back spacer کو استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اور اس طرح سے زیادہ وقت خرچ ہوتا ہے۔ اعراب کا مسئلہ رومن رسم الخط سے بآسانی حل ہو سکتا ہے۔ نستعلیق میں ہم عموماً اعراب نہیں لگاتے۔ لیکن تلفّظ کی صحت کا کوئی معیار مقرر نہیں۔ اوّل تو عام لوگ عربی اور فارسی میں اتنی مہارت نہیں رکھتے کہ جو الفاظ ان زبانوں کے اُردو میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا تلفّظ صحیح طور پر ادا کر سکیں۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا اصول مقرر نہیں جس سے ایک مبتدی بغیر کسی کی مدد کے تلفظ کی صحت پرکھ سکے۔ مبتدی کے پاس کون سا اصول ہے۔ جس سے وہ کب کو کِب نہ پڑھے۔ سو اگر ہر حرف پر اعراب لگائے جائیں تو ٹائپ میں دِقت پیدا ہوتی ہے۔ اور اگر نہ لگائیں تو قرأت میں۔ لیکن رومن رسم الخط میں یہ مشکل خود بخود حل ہو جاتی ہے۔ لیکن اِن خوبیوں کے باوجود اس رسم الخط میں بعض قباحتیں بھی ہیں مثلاً:

(۱) انگریزی زبان میں ہجوں کے لئے کوئی اصول مقرر نہیں۔ اس لئے مبتدی کو قرأت میں بہت مشکل پیش آتی ہے۔ لیکن یہ رومن رسم الخط کا قصور نہیں۔ انگریزی زبان میں ہجوں کے لئے کوئی باقاعدہ اصول نہیں مرتب کیا گیا۔ اگر ہم اس رسم الخط کو اختیار کریں تو ہم اصول مقرر کر سکتے ہیں۔ اور بے اصولی کی وجہ سے جو دِقّت پیش آتی ہے۔ اس سے

بچ سکتے ہیں۔

(۲) دوسری قباحت یہ ہے۔ کہ رومن حروف ابجد میں بہت سے حروف کا فقدان ہے۔ مثلاً ت ۔ د ۔ ث ۔ ص ۔ ز ۔ ظ وغیرہ کو ادا کرنے کے لئے اس کے پاس کوئی حرف نہیں۔ علاوہ بریں ہم صوت حروف کے لئے اس رسم الخط میں جُدا جُدا حروف نہیں ہیں۔ مثلاً ح اور ہ کے لئے ایک ہی حرف H استعمال کرنا پڑتا ہے۔ حالانکہ ح کو ہ سے بدل دینے سے لفظ کے معانی میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً صاحب اور ساہب۔ لیکن یہ مسئلہ بھی لاینحل نہیں۔ چند ایسے حروف نئے بنائے جا سکتے ہیں جو متذکرۃ الصدر حروف کے قائم مقام بن سکیں۔ ذیل میں ایک نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں رومن اور اُردو کے وہ حروف دیئے گئے ہیں جو ایک دوسرے کے قائم مقام ہو سکتے ہیں :۔

Z SH S R D KH H CH J T P B A

ا ب پ ٹ ج چ ح خ ڈ ر س ش ظ

CHH Y W N M L G K Q F GH

غ ف ق ک گ ل م ن و ی چھ

THH BHH PHH DHH GHH KHH JHH

جھ بھ پھ ڈھ گھ کھ ٹھ

اعراب کے قائم مقام مندرجہ ذیل حروف چنے جا سکتے ہیں :۔

زبر a ۔ زیر i ۔ پیش u ۔ آ aa ۔ اے ai ۔ ای ee ۔ اَے ae ۔ او o ۔ اَو ou ۔ اُو oo ۔ وغیرہ۔

مندرجہ ذیل حروف ایسے ہیں۔ جن کے لئے ہمیں نئے حروف ایجاد کرنا پڑتے ہیں۔ ت ۔ ث ۔ د ۔ ذ ۔ ڑ ۔ ز ۔ ژ ۔ ص ۔ ض ۔ ط ۔ ع ۔ ہ ۔ ۃ اور ی۔

c اَور X کو ہم نے کہیں استعمال نہیں کیا۔

انگریزی زبان میں بڑے اَور چھوٹے حروف میں فرق ہے۔ لیکن اُردو میں یہ چیز نہیں۔ اِس لئے محولہ بالا نئے حروف بنا لینے کے بعد بھی ان حروف ابجد کی تعداد رومن حروف ابجد کی کل تعداد سے کم رہے گی۔ اَور رومن اُردو ٹائپ رائیٹر انگریزی ٹائپ رائیٹر سے مختصر ہوگا۔

اگر ہم محسوس کریں کہ رومن رسم الخط نستعلیق کا نعم البدل ہو سکتا ہے۔ اَور اس سے بہتر اَور کوئی رسم الخط اُردو زبان کی کتابت کے لئے نہیں مل سکتا۔ تو متذکرۃ الصدر چند حروف کی بجائے نئے حروف بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اس طرزِ تحریر کی مزید چھان بین کریں۔ ہمیں دوسرے طرز ہائے تحریر کا مطالعہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اَور پھر ان کا اس کے ساتھ موازنہ کر کے دیکھنا ہے۔ کہ ان میں سے کون سا ہمارے لئے زیادہ سود مند ہے۔ مندرجہ بالا بیان سے یہ تو ثابت ہو گیا۔ کہ اگر ہم اس کو اختیار کرنا چاہیں تو اس میں مناسب ترمیم کی گنجائش ہے۔ اَور اس کا اُردو کی کتابت کے لئے استعمال میں لانا چنداں مشکل نہیں۔ لیکن اب تک ہم نے اسے صرف ایک ہی پہلو سے دیکھا ہے۔ آیئے اب تصویر کا دُوسرا رُخ بھی ملاحظہ کریں۔

بہت سی خوبیوں کا حامل ہونے کے باوصف رومن رسم الخط میں بعض اہم قباحتیں ہیں۔ جن سے کسی صورت میں بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اس رسم الخط کو اختیار کر کے ہم اپنے منبع سے جُدا ہو جائیں گے۔ اَور یہ امر زبان کی ترقی کے راستہ میں ایک مضبوط چٹان ثابت ہوگا۔ ہماری زبان کے اصل ماخذ عربی اَور فارسی ہیں۔ وہ درخت ہیں اَور یہ شاخ۔ شاخ درخت سے علیحدہ رہ کر ہری بھری نہیں رہ سکتی۔ رومن رسم الخط کو اختیار کرنا اصل سے فرع کو جُدا کرنے کے مترادف ہے۔ دوسرے ہمارا بیشتر مذہبی۔ سماجی اَور معاشرتی لٹریچر انہیں دو زبانوں میں محفوظ ہے۔ ہماری تہذیب و تمدّن کا

س مرکز یہی دو زبانیں ہیں۔ اور یہی زبانیں ہمارے قانونِ زندگی کی حامل ہیں ۔
ارے ثقافتی تعلقات ان سے اس درجہ منسلک ہیں۔ کہ ان سے کٹ کر ہم سے
نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم" کے مصداق بن جائیں گے۔ جس وقت کوئی قوم اپنے کلچر
چھوڑ دے ۔ اسی وقت اس قوم کا زوال شروع ہو جاتا ہے ۔ قومی زندگی کی بقا کے
ے کلچر کا تحفظ نہایت ضروری ہے ۔ اور یہ ظاہر ہے ۔ کہ اگر مروجہ ابجد کو ہی سرے سے
لا دیا جائے ۔ تو ان زبانوں سے ہمارے تعلقات وابستہ نہیں رہ سکتے ۔ اور آئندہ نسلیں
بی اور فارسی سے بالکل بے بہرہ ہو جائیں گی ۔ تیسرے موجودہ طرزِ تحریر سے ہم مانوس
ں ۔ مانوس سے غیر مانوس کی طرف جانے کا کیا فائدہ ۔ اگر ہم موجودہ طرزِ تحریر میں ایسی
ناسب تبدیلیاں پیدا کر لیں جن سے اس کے نقائص محاسن میں تبدیل ہو جائیں ۔
ہم ایک تکلیف مالا یطاق سے بچ جائیں گے ۔ اغلب ہے کہ رومن طرزِ تحریر کو اختیار
کے ہماری بھی وہی حالت ہو ۔ کہ "کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا ۔ دو کشتیوں میں
وار ہونے والے کا جو حشر ہوتا ہے ۔ وہی ہمارا ہو گا ۔ معنوی لحاظ سے ہمارا رشتہ عربی فارسی
سے ہو گا ۔ اور طرزِ تحریر کے لحاظ سے رومن کے ساتھ ۔ ایک پھلے پھولے درخت کو جڑ سے
کھاڑ پھینکنا کہاں کی دانشمندی ہے ۔ ہاں مناسب کتر و بیونت سے اس کی خوبصورتی
یں اضافہ کیا جا سکتا ہے ۔ اور پیوند لگا کر اس سے زیادہ لذیذ پھل حاصل کئے جا سکتے
یں ۔ ایک ایسے طرزِ تحریر کو جو ہمارے خواص و عوام کے دل و دماغ میں رچ چکا
ہے ۔ بالکل اجنبی اور غیر مانوس طرزِ تحریر کے ساتھ بدل دینا کچھ آسان کام نہیں ۔ ہمارے
ملک کا قریباً ہر انگریزی دان اردو طرزِ تحریر سے واقفیت رکھتا ہے ۔ لیکن بیشمار لوگ
ایسے موجود ہیں ۔ جو اردو جانتے ہیں لیکن انگریزی سے نا آشنا ہیں ۔ عوام کو وسیع
پیمانے پر ایک محدود عرصہ میں اس رسم الخط سے روشناس کرنا جوئے شیر لانے کے
مترادف ہے ۔ پھر کس قدر لٹریچر اردو کی مروجہ طرزِ تحریر میں موجود ہے ۔ اس کو نئی طرز میں

ڈھالنے کے لئے کس قدر مصارف برداشت کرنے پڑیں گے۔ اور کتنا وقت درکار ہوگا۔ کیونکہ جو لوگ اس وقت اُردو پڑھنا نہیں جانتے۔ اور ان کو نئے سرے سے رومن رسم الخط کے ذریعے تعلیم دی جائے گی۔ ان کے لئے تو موجودہ کتب کا ذخیرہ جس میں علم کے بیش بہا موتی بکھرے پڑے ہیں۔ لاطینی ہی ہوگا۔ لیکن اگر نستعلیق کے مروجہ رسم الخط میں تھوڑی بہت ترمیم کر کے مطلوبہ معیار تک پہنچایا جا سکے۔ تو یہ مشکلات پیدا ہی نہیں ہوتیں۔ اسلامی ممالک کے ساتھ ہمارے ثقافتی تعلقات بھی بدستور قائم رہتے ہیں۔ اور عوام کے سر پر ایک اجنبی زبان بھی نہیں ٹھونسی جاتی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ اس کے علاوہ کون سا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے اس کے متعلق کسی بزرگوار کی طرف سے ایک تجویز تو یہ پیش کی گئی ہے۔ کہ موجودہ حروف تہجی کو ہی ہم الگ الگ لکھ کر اس کام سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ مثلاً " آ ج - م ج ھ ے۔ ا س - ک و چ ہ - م ی ں - ن ا ص ح - ک و - ل ے ک ر - ج ا ن ا - ہ ے "۔ یعنی " آج مجھے اس کوچہ میں ناصح کو لے کر جانا ہے "۔ اگر اس مسئلہ کا حل اتنا ہی آسان ہوتا۔ تو اتنی بحث و تمحیص کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگر سطحی نظر سے دیکھا جائے تو شائد ہم میں سے بہت سے احسنت پکار اٹھیں لیکن دوسرے ہی لمحے معلوم ہو جائے گا۔ کہ صحرا میں بعض دفعہ جو ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر معلوم ہوتا ہے۔ وہ پیاسے کی تشنہ لبی کی تسکین کا باعث نہیں بن سکتا۔ ٹائپ میں تو آپ بیشک اس طریقے کو استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن ہاتھ سے لکھنے میں دقت پیش آئے گی۔ اگر آپ حروف کو اسی طرح الگ الگ لکھیں تو لکھنے کی رفتار ناگفتہ بہ حد تک سست ہو جائے گی۔ لکھنے میں روانی کبھی پیدا نہیں ہو سکتی اور اگر ہاتھ سے لکھنے کے لئے مروجہ طریقہ ہی قائم رہے۔ تو ٹائپ کے لکھے ہوئے اور ہاتھ کے لکھے ہوئے میں بعد المشرقین ہوگا۔ ہم چونکہ مروجہ طریقہ پر کُلی طور پر حاوی ہیں۔ اس لئے ہم ان مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے جو مبتدی کو پیش آئیں گی۔ جو کتابوں میں تو اس نئے

ریقہ کی وساطت سے تعلیم حاصل کرے گا۔ اور ہاتھ سے لکھنے کے لئے اسے ایسا طریقہ
ستعمال کرنا پڑے گا جس میں حروف کی اشکال میں اس کی توقعات سے بھی کہیں زیادہ
بدیلی واقعہ ہو جاتی ہے۔ لہذا یہ اس مشکل کا حل نہیں۔ بلکہ مشکل کو مشکل تر بنانا ہے۔
ور "آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا" کا مصداق۔ ان مشکلات کی بنا پر اس قسم کے خط پر
مزید غور و خوض کی ضرورت ہے۔

خطِ نسخ :-

اس خط کے بعد خط نسخ کی باری آتی ہے۔ میں اپنے بیان کو مختصر کرنے کے لئے
کہوں گا۔ کہ میرے نزدیک اس مسئلہ کا صحیح حل اسی میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس کا
ٹائپ موجود ہے۔ اس میں طبع شدہ لٹریچر موجود ہے۔ اور اس کے پڑھنے میں کوئی دقت
محسوس نہیں ہوتی۔ یہ نستعلیق سے قریب ترین ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ نستعلیق کی
ایک معمولی سی بدلی ہوئی شکل ہے۔ چنانچہ ہمارے ارباب بست و کشاد نے بھی اسی کو اختیار
کرنے کی تجویز پیش کی ہے لیکن ابھی اس طرزِ تحریر میں بھی کچھ خامیاں موجود ہیں۔ اور ان کا
رفع کرنا ضروری ہے۔ مثلاً حروف کو آپس میں ملانے کے لئے کچھ زائد Strokes سے
کام لینا پڑتا ہے۔ نیز حروف کی اشکال اس طرزِ تحریر میں بھی رنگ بدلتی رہتی ہیں۔ اور وہ
بھی Storke Bars کی تعداد میں اضافہ کرنے کا موجب ہوتی ہیں۔ اس سے ٹائپ
کی رفتار میں روانی قائم نہیں رہ سکتی۔ مثلاً جب بازیچہ لکھنا ہو تو " ہ " کی شکل اور ہے
اور جب "مشہور" لکھنا ہوتا ہے تو اور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح نظر اور وزن میں ن کی
حالت ملاحظہ فرمادیں و علیٰ ہذا القیاس۔

اس نقص کو رفع کرنے کی کوشش شایئد نہیں کی گئی۔ اگر ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ اس
طرف متوجہ ہو۔ تو اس میں اصلاح کی کافی گنجائش ہے۔ اور اس میں ایسی ترمیم کی جا سکتی ہے
ایک تجویز یہ ہے کہ حروف تہجی کی شکل میں تھوڑی سی تبدیلی کر دی جائے۔ اس میں اصول

یہ مدنظر رکھا جانا چاہیئے۔ کہ ایک تو کسی حرف کی شکل تبدیل نہ ہو۔ خواہ وہ کسی جگہ بھی واقع ہو۔ دوسرے تمام حروف ایک ہی کرسی پر آئیں۔ مثلاً حروف کی شکلیں مندرجہ ذیل صورت میں متعین کر دیں۔

ا ب ج د ر س ص ط ع ف ک ل م ن و ھ ی ے

مندرجہ بالا حروف کی تشریح کی تو ضرورت نہیں۔ ن اور ی کو ن اور ے کی صورت میں لکھا جائے۔ اور یہ جہاں کہیں بھی آئیں اسی صورت میں لکھے جائیں۔ صرف ا اور ل دو ایسے حرف ہیں۔ جن میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ تو اس کے لئے الف کو ہمیشہ (ا) کی صورت میں لکھا جائے۔ خواہ یہ کسی جگہ بھی ہو۔ اور لام کو ہمیشہ ل کی صورت میں لکھا جائے۔ اب اس میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے۔ کہ ٹائپ میں یہ حروف جُدا جُدا لکھے جائیں گے۔ مثلاً جب ہم نے چراغ لکھنا ہے تو یوں لکھیں گے۔ چ ر ا غ مخروطی اور منحنی شکلیں یک قلم نکال دی جائیں گی۔ ہ جہاں بھی ہو ھ کی شکل میں لکھی جائے گی۔ مثلاً "لاھور"۔ یعنی لاہور اور "ھ" ٹائپ میں ان کو ایک دوسرے کے ساتھ بالکل ملا دینے کی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں دقّت تو شاید رفع ہو جائے اور ہاتھ سے لکھنے میں روانی بدستور قائم رہے۔ لیکن یہ تجویز بھی ایک غیر مانوس اقدام کی طرف لے جائے گی۔ اور بیگانگی کی شکایت ویسے رہے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نسخ بحالت موجودہ اختیار کر کے رفتہ رفتہ سہل تر بنانے کی تدابیر کی جائیں۔ اگر ایک مخصوص مجلس اس طرف متوجہ ہو۔ تو مختلف طرز ہائے تحریر کا موازنہ کر کے اور مناسب ردّ و بدل کے ساتھ رسم الخط پیدا کر سکتے ہیں۔ جس سے نشر و اشاعت کی سہولتیں حاصل ہو جاویں۔ اور ہم مختلف علوم و فنون کی کتابیں تھوڑے مصرف کے ساتھ قلیل مدّت میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں طبع کرا کے عوام النّاس تک پہنچا سکیں۔

بگڑے ہوئے بچّے

مرزا مقبول بیگ بدخشانی

طبعاً اور فطرتاً بچّے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ اکثر خودغرض ہوتے ہیں۔ بعض خودسر ہوتے ہیں، صرف اپنی مرضی ہی کے کام کرنا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں چیزیں بگاڑ کر اور دوسروں کو پریشان کرکے خوشی ہوتی ہے، انہیں دن بھر اپنے تخریبی مشغلوں سے کام ہوتا ہے اور بس۔ کئی بچّے گستاخ ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچّوں سے تو اکثر ہر ایک کو کسی نہ کسی صورت میں سابقہ پڑتا ہوگا۔ بعض بچّے لاپرواہ اور بعض بالکل چُپ چاپ سے ہوتے ہیں۔ بعض سلیم الطبع بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں مؤخرالذکر بچّوں سے بحث نہیں۔ ہم اس وقت صرف ان بچّوں کے کردار پر سرسری سی نظر ڈالیں گے جو کسی نہ کسی شکل میں ماں باپ یا ہمجولیوں کے لئے غیرمعمولی طور سے تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ یا خود اپنے لئے بربادی کا موجب بنتے ہیں۔

والدین کو دنیا میں یوں تو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن اولاد کی تربیت ان کا سب سے بڑا فرض ہے، ایسا فرض جسے ریاضت، عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ اُستاد اُستانیاں بھی بچّوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کی ذمہ دار ہیں۔ کوئی بچّہ اگر خودغرض ہے تو اس کو "خودغرض" کا طعنہ دے کر یا اُسے بُرا بھلا کہہ کر ہم بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔

دوسرے گستاخ، جھوٹے، چُپ چاپ اور لاپرواہ بچّوں کو لعن طعن کر کے اپنے فرائض سے بدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اور نہ یہی سمجھ کر کہ بڑے ہوں گے تو آپ ہی آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہم ان کی اصلاح کے لئے کوئی مفید صورت پیدا کرتے ہیں۔ ایسے بچّے بڑے ہو کر شخصی اور قومی کردار کے لئے خطرے کا موجب بنتے ہیں۔ ہمیں شروع ہی میں ان کے اطوار کا بڑے غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ان کی اصلاح کے لئے کوئی قدم اُٹھانے سے پیشتر یہ مناسب ہو گا کہ ایسے بچّوں کی کوتاہیوں اور جُرم پسندیوں کے اسباب معلوم کئے جائیں۔ کاوش تو کرنی پڑے گی۔ لیکن اس سے ہمیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ بعض بچّے ماحول کی وجہ سے بگڑتے ہیں۔ بعض کو طبیعت کا بگاڑ ورثے میں ملا ہوا ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو مہرِ مادری یا شدت پدری کا شکار ہوں گے۔ کئی بچّے ماں باپ کی بے توجہی کی بھینٹ چڑھے ہوں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بچّے فطرتاً خود غرض ہوتے ہیں۔ یہ ایک مفروضہ ہے۔ جو بڑی حد تک درست بھی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر خود غرضی کو ایک فطری امر سمجھ کر ہم خاموش ہو رہیں۔ تو یہ فطری چیز محدود ہونے کے بجائے اور زیادہ وسعت اختیار کرتی جائے گی۔ خود غرضی ہمیشہ ملکیت کے احساس سے پیدا ہوتی ہے بچّے کو کھلونا ملتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ کھلونا اس کا ہے اس خیال سے اسے راحت محسوس ہوتی ہے، دل ہی دل میں خوش ہوتا ہے۔ اس قسم کی خوشی کو اور زیادہ بڑھانے کے لئے وہ اور بھی اچھی اچھی چیزیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ دوسروں کی چیزوں پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی فکر کرتا ہے۔ اگر ہم ایسے وقت میں بچّے کے رویّے پر نکتہ چینی نہ کریں تو یہ خود غرضی اور زیادہ راسخ ہوتی جائے گی۔ خود غرضی کی وجہ ہمیں معلوم ہو گئی اب اس کا سہل سا علاج یہ ہے کہ بچّے کو احساس دلایا جائے کہ جو چیز تمہیں مل گئی ہے صرف وہی تمہاری ہے۔ تم اس سے کھیل سکتے ہو۔ اس کو جیسے چاہو استعمال کر سکتے ہو۔ بہتر طریقے سے استعمال کرو گے تو زیادہ دیر تک تمہیں کام دے گی۔ خراب طریقے سے استعمال

کروگے تو جلد بگڑ جائے گی۔ تم اس چیز کے مالک ہو کوئی دوسرا تم سے نہیں لے سکتا۔ بالکل اسی طرح سے جو چیز تمہارے کسی ساتھی کی ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ اس کو استعمال کرنے کا حق صرف اسی کو ہے۔ وہ بھی اسے جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے۔ تم دونو اگر چاہو۔ تو اجازت سے ایک دوسرے کی چیزوں کو استعمال کر سکتے ہو۔ لیکن بغیر اجازت نہیں کسی دوسرے کی چیز کو تم اگر ویسے ہی لینا چاہو گے تو وہ تمہاری چیز حاصل کرنے کی کوشش کریگا۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم اپنی چیز کی حفاظت کرو اور اس سے کھیلو۔ دوسروں کی چیزوں پہ نظر نہ رکھو۔ یہ بھی اسے سمجھایا جا سکتا ہے۔ کہ کسی دوسرے کی چیز خراب نہ کرو۔ تم کسی کے کھلونے کو خراب کروگے تو وہ تمہارے کھلونے کو خراب کرے گا۔ پھر تمہیں دُکھ ہوگا۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم دوسروں کی چیزوں کی حفاظت کرو۔ تاکہ وہ تمہاری چیز کی حفاظت کریں۔ بالکل سیدھی اور صحیح بات ہے کہ جیسا کروگے ویسا بھروگے۔ پھر یوں ہی باتوں باتوں میں ملکیت کے ساتھ ساتھ باہمی رواداری کا احساس پیدا کیا جا سکے گا۔ اور چیزوں کے باہمی لین دین میں بچے حفاظت، اور صفائی کا بھی خیال رکھیں گے۔ اور اس طرح سے خود غرضی کا جذبہ بھی کچھ دب جائے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ روزمرہ کے باہمی لین دین کی مثالیں پیش کرکے بچوں کی خودغرضی کے احساس سے بہتر کام بھی لیا جا سکے گا۔ کوئی کھیل کھلونا اگر چند بچوں کے لئے مشترکہ خرید لیا جائے اور مل کر استعمال کرنے کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے تو اس سے اچھے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔

بعض بچے بہت ہٹ دھرم اور ضدی ہوتے ہیں۔ اس بُرائی کا اگر کھوج لگایا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ شروع شروع میں والدین اپنی محبت کی خاطر اور بچے کے لاڈ پیار کا خیال کرتے ہوئے اس کی ہر جائز ناجائز بات کو مانتے رہے تھے جس کی وجہ سے بڑا ہو کر وہ ضدی اور ہٹ دھرم ہو گیا۔ بچے کی جائز خوشی کو جائز ہی سمجھنا چاہیئے۔ لیکن اگر وہ کبھی کسی ناجائز بات کا مطالبہ کرے تو اسے ہمیشہ ناجائز سمجھ کر ٹال دینا چاہیئے۔ خواہ بچے کی دل شکنی کیوں نہ ہو اور اپنا دل بھی کیوں نہ دُکھے۔ بچے کی جائز بات کو اگر ہو سکے تو ضرور ماننا چاہیئے۔ لیکن اس وجہ سے

نہیں کہ مادرانہ یا پدرانہ شفقت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ بچّے کی ہر جائز بات پر سرِ تسلیم خم کیا جا رہا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ضرورت وقت اس بات کی مقتضی ہے کہ اس کی خواہش پوری کر دی جائے مہرِ مادری یا شفقت پدری کتنی ہی مجبور کیوں نہ کرے بچّے کے ناجائز مطالبات کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ جب ایسی صورت ہو تو بچّے کو یقین دلانے کی کوشش کرنا چاہیئے کہ تمہاری یہ خواہش ناجائز ہے اور ناجائز خواہش قبول نہیں کی جا سکتی۔ شروع شروع ہی میں اگر اسے جائز اور ناجائز کی تمیز کا احساس دلا دیا جائے تو بچّہ کبھی ہٹ دھرم اور ضدی نہیں ہو گا۔

بعض بچّے ایسے ہوتے ہیں کہ گھر کی کوئی چیز ان سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اِدھر سے گذرے، شیشے کا برتن توڑ دیا؛ اُدھر سے آئے چینی کا برتن فرش پر آ رہا۔ گھر کی چیزیں ہی نہیں اپنے کھلونوں کے ساتھ بھی ان کا یہی سلوک ہوتا ہے۔ ان کے لئے قیمتی سے قیمتی، خوبصورت سے خوبصورت کھلونا لے آیئے۔ کچھ دیر اس سے کھیل کر جی بہلا لیں گے پھر اس کو توڑ کر یا ہیئت کذائی بگاڑ کر ہی دم لیں گے۔ بعض اوقات ماں باپ یہ سوچ کر چپ ہو جاتے ہیں اور برداشت سے کام لیتے ہیں۔ کہ گلاس بچّے سے اتفاقاً ٹوٹ گیا چینک بے احتیاطی سے پھوٹ گئی۔ آخر بچّہ ہی ہے۔ سمجھ جائے گا۔ بڑا ہو گا تو ایسے نقصان نہیں کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس قسم کا نقصان اگر محض بے احتیاطی کی وجہ سے ہو۔ تو رفتہ رفتہ احتیاط سکھانے سے اس قسم کے نقصان نہیں ہوں گے۔ ضرورت ہو تو تنبیہ کرنے سے بھی نقصان کے امکانات کم ہو جائیں گے لیکن یہ نقصان ہمیشہ بے احتیاطی اور لاپرواہی کی وجہ سے نہیں ہوتے بلکہ بچّوں کے شوقِ تخریب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مجھے اپنے گھرانے میں دو ایک ایسے بچّوں سے سابقہ پڑا تھا۔ جنہیں چیزوں کو بگاڑ کر لطف آتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میری کتاب میز پر پڑی تھی۔ ایک بچّہ دوڑتا بھاگتا آیا اور اس کا سرورق پھاڑ کر چلتا بنا۔ یہ ظالم اگر کتاب کی کوئی تصویر پھاڑتا تو میں یہ سمجھ لیتا کہ اپنے کسی جمالیاتی ذوق کی وجہ سے مجبور ہو کر وہ اس خفیف حرکت پر آمادہ ہوا۔ لیکن اس نے کتاب کا سرورق پھاڑا۔ اور فوراً ہی ہنستا ہوا اسے پھینک کر بھاگ نکلا۔ اس قسم کی حرکتیں

بے احتیاطی کی وجہ سے واقع نہیں ہوتیں بلکہ بالارادہ ہوتی ہیں، سوچی سمجھی ہوئی بات
ہ ہوتی ہیں۔ ایسے بچوں کو محض چیزیں بگاڑ کر لطف آتا ہے اور جوں جوں وہ بڑے ہوتے
ان کے اس لطف کی نوعیت بھی بدلتی جاتی ہے۔ اور اب تو انہیں دوسروں کو آزار
ر لطف آنے لگتا ہے۔ چنگیز نسلِ انسانی کی بربادی سے کوئی خاص کام نہیں لینا چاہتا
وہ انسانوں کا بہتا ہوا خون دیکھنے کا عادی تھا۔ اس سے اس کا شوقِ تخریب مطمئن ہوتا
۔ تو گویا تخریب کا شوق اگر شروع شروع میں روک نہ دیا جائے اور اس شوق کے بہاؤ کو
ی دوسری طرف موڑ کر اس سے کوئی مفید کام نہ لیا جائے تو یہ بہت مہلک صورت اختیار کر
ہے۔ اس قسم کے بچے ماں باپ کی فوری توجہ کے محتاج ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ
یا وجوہ ہیں جو اس کو خرابی پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کے وجوہ تو کئی ہوں گے۔ سرِدست
یں سے دو ایک یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

ساسِ اعجوبہ۔

بچہ چینی کی خوبصورت گول مول چیز دیکھتا ہے۔ اسے یہ چیز عجیب و غریب معلوم
تی ہے۔ اس لئے وہ اسے اور زیادہ قریب سے دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتا
، کہ کس کس چیز نے اس کو اتنا خوبصورت بنا رکھا ہے۔ جو چیز باہر سے اتنی حسین معلوم ہوتی
، اس کے اندر ضرور کوئی اس سے بھی زیادہ حسین چیز چھپی ہوئی ہوگی۔ وہ اس موہوم اور عجیب
ز کو دیکھنے کے لئے چینی کے برتن کو زمین پر دے مارتا ہے۔ برتن آن کی آن میں ٹوٹ پھوٹ
اتا ہے۔ اور خوبصورتی کا یہ دیوانہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

ساسِ قوت۔

بچہ جب یہ محسوس کرے کہ وہ پہلے سے زیادہ طاقتور ہو گیا ہے۔ تو عام طور سے ایسی
تیں کرتا رہتا ہے جس سے اسے طاقت کا احساس ہوتا رہے۔ چیزوں کو ادھر ادھر پھینک کر
ی اس کی طبیعت مطمئن ہوتی ہے۔ اس قسم کا اطمینان حاصل کرنے کے لئے کچھ نقصان بھی کرنا

پڑے تو وہ پرواہ نہیں کرتا۔ اس بات میں بھی اسے لطف آتا ہے کہ وہ بنی ہوئی چیزوں کو ہاتھ کی ایک جنبش سے بگاڑ سکتا ہے۔ بگڑی ہوئی چیز کو دیکھ کر اسے اپنی طاقت کا یقین ہوتا ہے۔ اس لئے وہ اکثر ایسی تخریبانہ حرکتیں کرتا ہے۔

احساس انتقام۔

بعض بچّے ایسے ہوتے ہیں کہ جب انہیں ماں باپ کے ہاتھوں سے کوئی تکلیف پہنچے یا گھر میں کوئی کام اُن کی مرضی کے موافق نہ انجام پائے یا وہ دیکھیں کہ ماں باپ کسی دوسرے سے امتیازی سلوک کرتے ہیں تو انہیں غصّہ آتا ہے۔ غصّہ اگر ظاہر کرنے کا موقع نہ بھی ہو تو اندر ہی اندر یہ جذبہ مشتعل ہوتا رہتا ہے اور وہ آپے سے باہر ہو کر انتقام پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ انتقام کی صورتیں کئی ہو سکتی ہیں۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ موقع ملے تو گھر کی چیزیں توڑی جائیں۔ چونکہ ایسی "بے قاعدگیاں" آخر گھر ہی میں تو ہوتی ہیں۔ ابّا نے اگر ایک بچّے کے سامنے اس کے دوسرے بھائی کے ساتھ امتیازی سلوک کیا ہے جس سے اسے رنج پہنچا ہے تو موقع ملنے پر یہ بچّہ اپنے ابّا کا قلم ضرور توڑے گا۔ بہن کے ساتھ اگر ایسا امتیازی سلوک ہوا تو اس کی گڑیا کو ضرور کہیں باہر پھینک آئے گا۔ امّی نے اگر اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کیا تو اس کی کوئی نہ کوئی چیز بگاڑ کر رہے گا۔ اور نہ سہی تو چولہے کی جلتی ہوئی لکڑی کو ہی باہر نکال پھینکے گا۔ بہر حال اپنے اطمینان کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرلے گا۔ اور یوں گویا اپنے انتقام کے جذبے کو ٹھنڈا کرے گا۔

بہر حال کوئی سی صورت ہو ماں باپ کو چاہیئے کہ بچّوں کو صبر اور ضبط کی عادت سکھائیں۔ کسی وجہ سے بچّے کو پیٹنا ضروری سمجھیں تو اسے سمجھا دیں کہ یہ جو مار پیٹ ہوئی اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے ہوئی۔ لیکن اگر وہ دیکھیں کہ بچّہ محض اپنی طاقت کا لطف اُٹھانے کے لئے چیزوں کو بگاڑتا ہے تو اس کے رجحان طبع کا اندازہ کرکے اس سے ایسی چیزیں بنوانی چاہئیں جن پر وہ اپنی دماغی اور ہاتھ کی قوت صرف کرکے اپنی فوقیت کا احساس کرسکے۔ بچّے کی خواہش اگر معقول ہو تو اسے مان لینا چاہیئے لیکن اگر یہ خواہش ان کے خیال کے مطابق معقول نہ ہو تو بچّے کو یہ ضرور بتا دینا

چاہیئے کہ اس کی خواہش کیوں نہیں مانی گئی۔ حتی الوسع بچّوں کے سامنے کسی دوسرے بچّے کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کرنا چاہیئے لیکن اگر ایسی ضرورت آن پڑے تو دوسرے بچّوں کو اس امتیازی سلوک کی وجہ بتا دینی چاہیئے۔ مثلاً ایک بچّہ بیمار تھا کچھ عرصے کے بعد وہ اچھا ہو گیا اس کی کمزوری اور خوشی کا خیال کرتے ہوئے قدرتی طور سے آپ اس کی طرف زیادہ توجہ کریں گے۔ اس کے لئے آپ پھل بھی الگ لائیں گے کھلونے بھی طرح طرح کے اسے مہیا کریں گے۔ تاکہ وہ خوش رہے اور اس کی صحت روز بروز اچھی ہو جائے ۔ دوسرے بچّے اس امتیازی سلوک کو بُرا محسوس کریں گے۔ لیکن اگر ساتھ ہی ساتھ اس سلوک کی وضاحت کر دی جائے تو وہ سمجھ جائیں گے اور اس کا کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا۔

اکثر بچّے چیزوں کو اس لئے بگاڑتے ہیں کہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرکے انہیں خوشی ہوتی ہے۔ ایسے بچّوں کو ان کھیلوں میں شریک ہونے کا موقع دینا چاہیئے۔ جن میں وہ اپنی قوت کا مظاہرہ کرکے خوش ہو سکیں۔ بہرحال تخریب کا شوق ڈنڈے کے خوف سے دُور نہیں ہوگا۔ اگر کسی چیز کو بلاوجہ توڑ دینے پر بچّے کو جسمانی سزا ملے گی تو آئندہ وہ ایسی چیز بڑی دیکھ بھال کے ساتھ توڑے گا۔ بالخصوص وہ ایسے وقت میں توڑے گا جب کہ کوئی اس کو دیکھتا نہ ہو۔ کوئی دیکھے گا نہیں۔ تو سزا بھی نہیں ملے گی۔ بچّے کی اصلاح اصل مرض کی طرف رجوع کرنے سے ہوگی۔

کبھی کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ گھر میں میاں بیوی کا سلوک ایک دوسرے کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا۔ بیوی ناراض، میاں بیزار۔ بات بات پر جھگڑا ہوتا ہے۔ قدم قدم پر گھر میں غدر ہونے کا ڈر رہتا ہے۔ اس قسم کا ماحول ہو تو بچّوں کا شوقِ تخریب اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اور گھر میں یوں بھی اپنی اپنی پریشانی کی وجہ سے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ اور وہ اپنی من مانی کرلیتا ہے۔ بچّے کی اصلاح و درستی کے لئے یہ ضروری ہے کہ گھر کا ماحول اچھا ہو۔ بچّے فطرةً ایک شفاف سلیٹ کی مانند ہوتے ہیں۔ ماحول جو جو نقشے پیش کرتا ہے۔ سلیٹ پر نقش ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہ نقش پھر مٹائے مٹتے نہیں۔

بے جا نازبرداری۔

بعض بچّے گستاخ اور ہٹ دھرم ہوتے ہیں۔ گستاخی اور ہٹ دھرمی کی ابتدا بچپنا ہی

میں ہوتی ہے۔ جب کہ بچّے کی ہر بُری سے بُری حرکت بھی دلربا معلوم ہوتی ہے۔ بچّہ کسی کو گالی
دے دے تو ماں باپ پھُولے نہیں سماتے۔ عام طور سے مہذب گھرانوں میں تو ایسا نہیں ہوتا۔
لیکن اکثر اَن پڑھ گھرانوں میں ایسی باتیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ بچّے کی بدزبانی کی ابتدا ماں باپ کی
والہانہ تحسین سے ہوتی ہے۔ گھر میں بڑے بوڑھے خود بچّے سے کہتے ہیں۔ خالہ کو گالی دو۔ وہ تمہارا
چچا ہے۔ اس کو بھی گالی دو۔ جب بچّہ گالی دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو سب چھوٹے بڑے توتلی
گالیوں پر واہ واہ کرتے ہیں۔ اور وہ یوں ہی گالیاں دے کر داد پاتا رہتا ہے۔ جوں جوں بڑا
ہوتا ہے۔ اس کو گالیاں دینے کی عادت ہی ہو جاتی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ایسا وقت بھی آتا ہے۔ کہ بچّے کی
گالیاں ماں باپ کو بُری لگتی ہیں۔ وہ بچّے کو گالیوں سے روکتے ہیں۔ اسے جھڑکتے ہیں، تنبیہ کرتے ہیں،
لیکن بچّے کو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں اس کے خلاف احتجاج کرتا ہے اور
گُستاخ ہوتا جاتا ہے۔ گستاخی بچّے فطرت میں ہرگز داخل نہیں۔ ماحول ہی بچّے کو گستاخ بنا دیتا ہے۔ بعض
گھروں میں میاں بیوی کا آپس میں سلوک اچھا نہیں ہوتا۔ نہ میاں کو بیوی کا پاس خاطر ہوتا ہے نہ بیوی
کے دل میں شوہر ہی کی عزّت ہوتی ہے۔ ہر وقت گالی گلوچ کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ بچّے بھی ان
باتوں کو سنتے ہیں۔ اور اثر قبول کرتے ہیں۔ اور گُستاخ ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں بچّوں سے اور
توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔ بعض اوقات گُستاخ بچّوں کی رفاقت اور صحبت بھی بچّوں کو گُستاخ
بنا دیتی ہے۔ بچّے بہت جلد دوسروں کا اثر قبول کر لیتے ہیں۔ اس لئے کوشش کرنی چاہیئے کہ گھر میں
گُستاخی کا کوئی کلمہ نہ بولا جائے۔ حتی الامکان یہ کوشش بھی کرنی چاہیئے کہ گستاخ بچّوں کی صحبت
سے بچّوں کو محفوظ رکھا جائے۔

احساسِ کمتری۔

بعض بچّے بالکل چُپ چاپ سے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بے دل سے ہیں وہ کسی
مشغلے میں حصّہ نہیں لینا چاہتے۔ دنیا سے کچھ گریزاں نظر آتے ہیں۔ ان کی اس عادت پر
عام طور سے توجہ نہیں دی جاتی اور جوں جوں وقت گذرتا ہے۔ وہ اور زیادہ الگ تھلگ رہنے

لگتے ہیں۔ روز بروز گوشہ نشینی اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اور دنیا کی ہما ہمی میں حصّہ نہیں لیتے
نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ افسردہ سے رہتے ہیں اور اچھی اور کامیاب زندگی نہیں بسر کر سکتے۔
والدین بچوّں کی اس نوع کی خاموشی کو قسمت کے سر تھونپ دیتے ہیں۔ اور اپنے لئے وجہ اطمینان
پیدا کر لیتے ہیں۔ چپ رہنے کی عادت کا اثر نہایت مہلک ہوتا ہے۔ اس کے اسباب وعلل پر
فی الفور توجہ دینی چاہیئے۔ اس کے بڑے وجوہ دو ہو سکتے ہیں۔ پوری خوراک کا نہ ملنا۔ اور کمتری
کا احساس ہونا۔ اب اگر غور کیا جائے تو آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ کون سی بات نے بچّے
کے جذبات کو سرد کیا ہے۔ اگر پوری خوراک نہ ملنے کی وجہ سے یہ عارضہ لاحق ہوُا تو پھر ماں باپ
کو کوشش کرنا چاہیئے۔ کہ حتیٰ الوسع بچّے کو بہتر اور پوری خوراک بہم پہنچائیں۔ صاحب استطاعت
لوگ اس کے لئے فوری تدابیر اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن جن کے حالات سازگار نہیں وہ مجبور تو
ہوتے ہیں لیکن بہرحال انہیں بھی اور زیادہ غور کرنا چاہیئے۔ کہ بچّے کی خوراک کو بہتر کیسے کیا
جا سکتا ہے۔ سوچنے اور غور کرنے سے بڑے بڑے مسائل حل ہو جاتے ہیں۔

اور اگر چُپ چاپ اور الگ تھلگ رہنے کا عارضہ کمتری کے احساس کی وجہ سے ہے
تو یہ قدرے پیچیدہ بات ہے۔ اس کے لئے کافی جدّ وجہد کی ضرورت ہے۔ انسانی جدّ وجہد
سے مشکل سے مشکل باتیں بھی سہل ہو جاتی ہیں۔ ماں باپ کو چاہیئے کہ بچّے کے لئے دلچسپ اور سہل
اسباب مہیا کریں جن کی مدد سے وہ اپنے چھوٹے چھوٹے کام خود انجام دیں۔ خود کام کرنے کا ذوق
پیدا ہو جائے تو کام کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہونے لگتی ہے۔ بچّے جب کوئی کام اپنی کوشش سے
کریں تو کامیابی سے انہیں کافی راحت حاصل ہوتی ہے۔ اب یہ کام ماں باپ کا ہے کہ وہ بچّے کے
لئے ایسی راحتیں پیدا کریں۔ بچّے میں رفتہ رفتہ جب خود کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔
تو وہ خود ہی بڑھ چڑھ کر قدم مارنے کی فکر کرے گا۔ چُپ چاپ رہنے کی عادت رفتہ رفتہ زائل
ہو جائے گی۔ یاد رکھیئے کہ چُپ چُپ رہنے والا بچّہ اس لئے کھیل سے ہٹا رہتا ہے۔ کہ وہ
دوسروں کی طرح کھیل حصّہ نہیں لے سکتا۔ سوسائٹی سے اس لئے گریزاں ہوتا ہے کہ دوسروں

کی مانند منہ سے بول نہیں سکتا۔ وہ آگے بڑھ کر کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ چونکہ اس کو اپنے آپ پر بھروسہ نہیں۔ اس کو کمتری کا احساس ہے۔ اگر شوق اور کام کرنے کا احساس پیدا کر دیا جائے تو یہ کمتری کا احساس دُور کیا جا سکتا ہے۔

خوفِ تعذیر۔

ایسے بچّے بھی ہوتے ہیں جو اکثر جھُوٹ بولتے ہیں۔ پیشتر اس کے کہ جھُوٹے بچّوں کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ جھُوٹ اور غلط گوئی میں جو نازک سا فرق ہے۔ اس کی وضاحت کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ بچّے جس دنیا میں رہتے ہیں وہ ہماری دنیا سے مختلف ہے۔ ہماری دنیا حقائق کی دنیا ہے۔ جہاں تخیلات کو دخل کم ہے۔ بچّوں کی دنیا سراسر تخیلات کی دنیا ہے اس میں وہ بالکل اسی طرح رہتے بستے ہیں جس طرح کوئی خواب و خیال کی دنیا میں پھرتا ہے۔ اس دنیا میں وہ عدالت بھی دیکھتے ہیں اور پابجولاں مجرم کو بھی۔ اپنے کھیل میں وہ خود کبھی منصف بنتے ہیں۔ اور کبھی چور بن کر عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔ وہ کوئی نقلی، مصنوعی اور جھُوٹا ڈرامہ نہیں کرتے۔ بلکہ سچ مچ کے منصف اور قیدی بنتے ہیں۔ وہ کبھی رستم بن کر ہنکارتے پھرتے ہیں۔ اور کبھی قائدِ اعظم بن کر علمِ آزادی بلند کرتے ہیں۔ ان کی یہ باتیں جھُوٹ اور تصنّع پر مبنی نہیں بلکہ مثالی اعتبار سے حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ اس لئے اگر ایسی باتوں کی نشو ونما کے لئے موقع پیدا کیا جائے تو جھُوٹ اور تصنّع کی نہیں بلکہ تخیل کی نشو ونما ہوگی۔

بچّہ فطرۃً جھُوٹ نہیں بولنا چاہتا۔ ماحول اُسے جھُوٹ بولنے پر مجبور کرتا ہے۔ بچّے کی شرارت یا اس کی کسی قابلِ اعتراض حرکت کو دیکھ کر ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ شرارت یا حرکت کس وجہ سے سرزد ہوئی۔ بلکہ اسے قابلِ تعذیر سمجھ کر سزا دینے لگتے ہیں۔ یہی سزا کا خوف اس کے دماغ پر مسلّط ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ خوف و ہراس ہوگا تو بچاؤ کے لئے پناہ ڈھونڈنی پڑے گی۔ اور ایسے موقع پر بہترین پناہ جھُوٹ ہی سمجھا جاتا ہے۔ ڈر نہ ہو تو بچنے کے لئے کسی پناہ کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ بچّہ جس کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہو۔ جہاں خوف و

س نہیں ہوتا۔ تو بچہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ اس کی یہ راست گفتاری کسی کوشش کا نتیجہ نہ ہوگی
اس لئے کہ اسے سچ بولنے کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔ لیکن وہ بدنصیب بچے جن کی تربیت شدتوں
ظر بندیوں کے ماحول میں ہوتی ہے انہیں ہر وقت تنبیہ، دھمکی، مارپیٹ کا خوف لگا رہتا ہے
بچہ اس سے بچنے کے لئے جھوٹ بول دیتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ بچے کو پہلے پہل جھوٹ
ے کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ جھوٹ تو ایجاد ہے ان بچوں کے دماغوں کی، جو خوف و دہشت کے
ل میں پرورش پاتے ہیں، جن کا بچپن سزا اور دھمکی کے سوا کسی دوسری چیز سے واقف نہیں
۔ جنہوں نے بزرگوں کی پیشانی پر تیوریوں اور گھرکیوں کے سوا کوئی دوسری علامت نہیں
ی ہوتی۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھر کے بڑے لوگ خود بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ بچے جب
ں جھوٹ بولتا دیکھتے ہیں۔ تو سمجھتے ہیں کہ اگر کبھی کوئی پہلو بچانا مقصود ہو تو جھوٹ بھی بولا
لتا ہے۔ ایسے ناموافق حالات پیدا نہ ہوں تو بچہ کبھی جھوٹ نہیں بولے گا۔

اگر کوئی بچہ جھوٹ بولے۔ تو اسے ابتدا میں ہرگز سزا نہیں دینی چاہیئے۔ بلکہ دیکھنا یہ
ئے کہ وہ اسباب کون سے ہیں جو بچے کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اور پھر ان اسباب کو
رنے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ والدین کو چاہیئے کہ وہ بچے کو پیار سے بتائیں اور دلیل کی روشنی
سمجھائیں۔ کہ سچ بولنا اچھا کیوں ہے اور جھوٹ بولنا برا کیوں۔ سزا دینے سے بچے کا خوف
ے گا۔ خوف سے جھوٹ بولنے کی وجہ کو اور زیادہ تقویت ہوگی۔

ی کی جستجو۔

بعض بچوں کی طبیعت میں آوارگی ہوتی ہے اور وہ گھر بھر کے لئے باعثِ زحمت بن
ے ہیں۔ بچے عام طور سے ان گھروں کے آوارہ ہوتے ہیں جو تعلیم و تہذیب کی روشنی سے
ور نہیں یا ان کی پرورش میں سوچ بچار سے کام نہیں لیتے۔ گھر کا ماحول ان کے لئے بالکل
بنت سا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ گھر میں ٹھہر کر خوش نہیں رہ سکتے۔ انہیں اپنی خوشی اور دلچسپی

ی چیزیں گھر سے باہر کی دنیا زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس لئے وہ گھر چھوڑ باہر کو بھاگتے ہیں۔ بچہ یہ سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ اچھی بات کیا ہے اور بُری کیا۔ وہ صرف یہی دیکھتا ہے کہ اس کے لئے رنگین اور دلچسپ بات کون سی ہے۔ چنانچہ اس کی طبیعت دلچسپی اور رنگینی ہی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس بیرونی دلچسپ ماحول میں وقت گذار کر تفریح پسند بچے عام طور سے آوارہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان میں قسم قسم کی بُرائیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کا ایک سہل سا علاج یہ ہے کہ ماں باپ گھر کے اندر خود سوچ سمجھ کر بچے کی تفریح کے سامان پیدا کریں۔ تاکہ گھر کی دنیا اسے دلچسپ معلوم ہو۔ زیادہ وقت گھر ہی میں گذاریں۔ اور آوارگی کی بُرائی سے بچ جائیں۔ گھر میں ماں سوتیلی ہو تو اس سے بھی بچے کی آوارگی کے لئے بہت سے موقعے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں باپ کی ذمے داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ اگر لگاتار محنت اور کوشش کر کے گھر میں خوشی اور تفریح کا ماحول پیدا کر سکے تو آوارگی کے موقعے دُور کئے جا سکتے ہیں۔

گھر میں ماں باپ کا ایک دوسرے کے ساتھ سلوک اچھا نہ ہو تو اس کا بھی اولاد پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ پریشانی اور بے اطمینانی کی وجہ سے نہ باپ ہی بچوں کی تربیت کو درخور اعتنا سمجھتا ہے۔ نہ ماں ہی اس مسئلے پر غور و فکر کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ بچوں کی آوارگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ گھر کے روزمرّہ میں کئی ایسے چھوٹے چھوٹے مسائل ہوتے ہیں۔ جو ذرا سی رواداری سے خوش اسلوبی کے ساتھ طے ہو سکتے ہیں۔ لیکن شوہر اگر ہمیشہ اپنی فوقیت کو پیشِ نظر رکھے۔ اور بیوی ہمیشہ اپنی برتری کا سکہ منوانے کی کوشش کرے تو چھوٹے چھوٹے اختلافی مسائل بھی اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے اختلافی مسائل کو باہمی مروّت اور رواداری ہی سے سلجھانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ گھریلو فضا پاکیزہ اور محبت بھری ہوتی ہے۔ بلکہ بچوں کو کئی بُرائیوں سے بچا لیتی ہے۔

معلم حساب کی مشکلات ۔ ۲

سید محمد صدیق ۔ ایم ۔ اے

معلم اپنے شاگردوں کو تقسیم کا طولانی قاعدہ سکھا چکا ہے۔ اب وہ اُنہیں تقسیم کے مختصر قاعدے سے بھی رُوشناس کرے گا۔ تاکہ آئندہ وہ حسب ضرورت اس قاعدے سے بھی استفادہ کرسکیں مختصر تقسیم کا قاعدہ سمجھانے کے لئے وہ تقسیم کے طولانی قاعدے کو بُنیاد قرار دے گا۔ اور آسان سے مُشکل سوالات کی طرف جائے گا۔ مثلاً وہ لڑکوں سے کہے گا۔ کہ ۵۸۴ کو ۴ پر تقسیم کرو۔ وہ طولانی قاعدے سے تقسیم کریں گے۔ اب معلم مختصر قاعدے سے یہی سوال طلبہ کی مدد سے تختہ سیاہ پر حل کرے گا۔

مقسوم

۵۸۴ (۴ مقسوم علیہ

باقی ۱ — ۱۲۱ خارج قسمت

اور طلبہ کو اس قاعدے میں مقسوم، مقسوم علیہ۔ خارج قسمت اور باقی لکھنے کی جگہوں سے آگاہ کرے گا۔ ایسے آسان سوالات کی مشق کرانے کے بعد وہ تقسیم کا ایک اور سوال طلبہ کو طولانی طریق سے حل کرنے کے لئے دے گا۔ مثلاً ۵۷۴۳ تیلیوں کو ساٹھ ساٹھ کے مٹھوں میں تقسیم کرو۔ جب لڑکے یہ سوال حل کر چکیں گے۔ تو مدرس بتائے گا۔ کہ ہم اسے مختصر طریق سے بھی حل کرسکتے ہیں۔ وہ طلبہ سے ۶۰ کے اجزائے ضربی دریافت کرکے تختہ سیاہ پر

لکھے گا۔ اور پھر سوال مندرجۂ ذیل طریق سے تختۂ سیاہ پر طلبہ کی مدد سے حل کرے گا :۔

۶۰ کے اجزائے ضربی = ۳ × ۴ × ۵

باقی نکالنے کا طریق :۔

۳) ۳ ۴ ۷ ۵

۴) ۱ ۱ ۵ ۸ — ۱ اکائی | اکائی = ۱

۵) ۲ ۸ ۹ — ۲ تین تین کے مٹھے | تین تین کے دو مٹھے = ۶

۵ ۷ — ۴ بارہ بارہ کے مٹھے | بارہ بارہ کے چار مٹھے = ۴۸

۵۵

ایسے سوالات کی معلم مشق کرائے گا۔ تاکہ لڑکے مختصر تقسیم کے قاعدے اور باقی نکالنے کے طریق سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ اب معلم اپنے شاگردوں کو مرکب قاعدے سکھانے کی فکر میں ہوگا۔ مرکب قاعدے اُنہیں اصولوں پر مبنی ہیں جن پر مفرد قاعدے۔ فرق صرف یہ ہے کہ گنتی میں تو ہر درجے کی دس اکائیوں سے اُس کے بعد کا درجہ بنتا ہے۔ لیکن مرکب مقداروں میں مختلف درجوں کی اکائیاں مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک روپے میں ۱۶ آنے اور ایک آنے میں ۱۲ پائیاں۔ اس لئے مرکب قاعدے سکھانے سے پیشتر ضروری ہے کہ طلبہ کو نقدی پیمانے اور ان کی صعودی اور نزولی تحویل سکھا دی جائے۔

تحویل کے قواعد سکھاتے وقت جن پیمانوں کی تحویل سکھانی ہو۔ طلبہ کو بذریعۂ مشاہدہ اُن سے مکمل واقفیت پیدا کرائی جائے۔ نقدی کے پیمانے مدرسے میں تمام قسم کے سکے دکھاکر طلبہ کو سکھائے جا سکتے ہیں۔ اوزان کے پیمانوں کا بھی مشاہدہ کرایا جائے۔ چھوٹے باٹ اور ترازو تو مدرسے میں لائے جا سکتے ہیں۔ البتہ بڑے باٹوں کے تصور کے لئے جماعت کو کسی ٹال پر لے جاکر اُن کا مشاہدہ کرانا پڑے گا۔

تحویل نزولی یا صعودی کا قاعدہ سکھاتے وقت مدرس عملی طور پر مختلف سکوں کا مبادلہ کرائے گا۔ تحویل نزولی کی صورت میں سکوں کے مبادلے سے مدرس طلبہ سے نکلوائے گا

کہ ہمیں جمع کا متواتر عمل کرنا پڑتا ہے۔ لڑکے جانتے ہیں کہ جمع متواتر کا دوسرا نام ضرب ہے۔ اس لئے مدرّس طلبہ کے ذہن نشین کرے گا۔ کہ تحویل نزولی میں ضرب سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثلاً چار روپوں کو آنوں میں تحویل کرنے کی صورت میں ہمیں سولہ سولہ آنوں کو چار دفعہ جمع کرنا پڑے گا۔ اِس لئے بہتر ہے کہ ۴ کو ۱۶ سے ضرب دے دی جائے۔ تحویلِ صعودی میں جب لڑکے سکّوں کا مبادلہ کریں گے۔ تو انہیں معلوم ہوگا۔ کہ اگر بہت سے آنوں کو روپوں میں تحویل کرنا ہو۔ تو تفریق کا متواتر عمل کرنا پڑتا ہے۔ اور تفریقِ متواتر کا دوسرا نام تقسیم ہے۔ اس لئے مدرّس بہ آسانی طلبہ کو سمجھا سکے گا۔ کہ تحویلِ صعودی میں تقسیم سے کام لینا پڑتا ہے۔

جب لڑکے چاروں ابتدائی مفرد قاعدے اور تحویلِ صعودی و نزولی سیکھ لیں۔ تو جمع و تفریق۔ ضرب اور تقسیم کے مرکب قاعدے سکھانے کے لئے زمین ہموار ہو جاتی ہے۔ اور مدرس معمولی سی کوشش سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ مگر تجارتی حسابات تو ایک طرف رہے۔ ہمارے معمولی کاروبار کے لئے بھی صحیح اعداد سے تعلق رکھنے والے یہ مفرد و مرکب قاعدے کفایت نہیں کر سکتے۔ اِس لئے معلّم کے لئے ضروری ہوگا۔ کہ وہ اپنے شاگردوں کو کسورِ عام اور کسورِ اعشاریہ کے اِن چاروں قاعدوں سے بھی رُوشناس کرے۔ کیونکہ یہی وہ قاعدے ہیں۔ جو تمام حساب کی جان ہیں۔ اور جن پر حساب کے باقی تمام قواعد کا دار و مدار ہے۔

کسورِ عام کا چونکہ عادِ اعظم اور ذو اضعاف اقل سے گہرا تعلق ہے۔ اور ان سے پوری واقفیت حاصل کئے بغیر لڑکے آگے نہیں چل سکتے۔ اس لئے لازم ہے کہ معلّم پہلے لڑکوں میں اِن قاعدوں کے سوالات حل کرنے کی مہارت پیدا کرے۔ اِن قواعد میں اگرچہ سادہ ضرب اور تقسیم ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔ تاہم چند باتیں بچّوں کے لئے نئی اور مشکل ہوتی ہیں جنہیں آسان صورت میں پیش کرنا مدرس کے اہم فرائض میں سے ہے۔

لڑکے اجزائے ضربی سے واقف ہیں۔ مدرس ۱۴، ۲۸، اور ۵۶ الگ الگ

تختہ سیاہ پر لکھے گا۔ اور طلبہ سے اُن کے اجزائے ضربی دریافت کرے گا۔ مثلاً

۱۴ = ۲) ۱۴ = ۲ × ۷
۷

۲۸ = ۲) ۲۸
۲) ۱۴ = ۲ × ۲ × ۷
۷

۵۶ = ۲) ۵۶
۲) ۲۸
۲) ۱۴ = ۲ × ۲ × ۲ × ۷
۷

مدرس طلبہ کو بتائے گا۔ کہ کسی عدد کا جزِ ضربی اس کا عاد بھی کہلاتا ہے۔ اب مدرس طلبہ سے پُوچھے گا۔ کہ تختہ سیاہ پر لکھے ہُوئے اجزائے ضربی میں سے کون کون سے عاد ایسے ہیں۔ جو تینوں اعداد کے اجزائے ضربی میں پائے جاتے ہیں۔ لڑکے جواب دیں گے "۲ اور ۷" مدرس بتائے گا۔ کہ انہیں عادِ مشترک کہتے ہیں اور کہے گا کہ ۲ اور ۷ ایسے عدد ہیں۔ جو ۱۴، ۲۸ اور ۵۶ کو پُورا پُورا تقسیم کرتے ہیں۔ اِس لئے ۲ × ۷ = ۱۴ بھی اِن اعداد کو پُورا پُورا تقسیم کرے گا۔ اور عادِ اعظم مشترک یا فقط عادِ اعظم کہلائے گا۔

تقسیم سے عادِ اعظم نکالنے کا قاعدہ مدرّس اس طرح سمجھائے گا۔ مدرس مثال کے طور پر ۳۰۹۴ اور ۱۳۶۵ کے اعداد تختہ سیاہ پر لکھے گا۔ اور طلبہ کی مدد سے اجزائے ضربی کے ذریعے اِن کا عادِ اعظم نکالے گا۔

۲) ۳۰۹۴ ۔۔۔ ۳) ۱۳۶۵ ۔۔۔ ۱۳ × ۷ × ۵ × ۳ = ۱۳۶۵

۷) ۱۵۴۷ ۔۔۔ ۵) ۴۵۵

۱۳) ۲۲۱ ۔۔۔ ۷) ۹۱ ۔۔۔ ۱۷ × ۱۳ × ۷ × ۲ = ۳۰۹۴

۱۷ ۔۔۔ ۱۳ ۔۔۔ عادِ اعظم = ۷ × ۱۳ = ۹۱

اب مدرّس کہے گا۔ کہ آج ہم اس سے بھی زیادہ آسان قاعدہ عادِ اعظم نکالنے کا تمہیں بتاتے ہیں۔ اس کے بعد مدرس جیساکہ سامنے دکھایا گیا ہے۔ ۳۰۹۴ کو ۱۳۶۵ پر تقسیم کرے گا۔ ۳۶۴ باقی بچیں گے۔ مدرّس

۱۳۶۵) ۳۰۹۴ (۲
۲۷۳۰
۳۶۴) ۱۳۶۵ (۳
۱۰۹۲
۲۷۳) ۳۶۴ (۱
۲۷۳
۹۱) ۲۷۳ (۳
۲۷۳
×

پُوچھے گا۔ کہ ۱۳۶۵ کی طرح ۳۶۴ بھی ۹۱ پر تقسیم ہو سکتا ہے یا نہیں۔ لڑکے مثبت میں جواب دیں گے۔ مدرّس بتائے گا کہ دو عددوں کا عادِ اعظم وہی ہوتا ہے ۔ جو چھوٹے عدد اور اُس باقی کا ہوتا ہے۔ جو بڑے عدد کو چھوٹے عدد پر تقسیم کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اب اگر ہم چھوٹے عدد یعنی مقسوم علیہ کو باقی پر تقسیم کر دیں۔ اور پھر اس باقی کو اگلی باقی پر تقسیم کریں۔ اور اس طرح کرتے جائیں۔ حتےٰ کہ کچھ باقی نہ بچے۔ تو آخری مقسوم علیہ مطلوبہ عادِ اعظم ہو گا۔ جیسا کہ عمل سے ظاہر ہے۔

ذو اضعاف اقل کا قاعدہ سکھاتے وقت مدرّس طلبہ کی سابقہ واقفیت سے یُوں کام لے گا۔ مدرّس پوچھے گا۔ عاد کسے کہتے ہیں ؟ لڑکے جواب دیں گے۔ کہ جب ایک عدد دوسرے عدد کو پُورا پُورا تقسیم کرے۔ تو وہ اُس کا عاد کہلاتا ہے۔ مدرّس پھر سوال کرے گا۔ کہ عاد جس عدد کو پُورا پُورا تقسیم کرتا ہے۔ اُسے کیا کہتے ہیں ؟ لڑکے چونکہ اس کے نام سے ناواقف ہیں۔ اِس لئے جواب نہیں دے سکیں گے۔ مدرس انہیں بتائے گا۔ کہ ایسے عدد کو ضعف کہتے ہیں۔ ضعف کا تصوّر دلانے کے بعد مدرّس طلبہ سے پُوچھے گا۔

کون کون سے عدد ۴ کا ضعف ہو سکتے ہیں۔ لڑکے بتائیں گے۔ ۴، ۸، ۱۲، ۱۶، ۲۰، ۲۴ وغیرہ۔ پھر مدرّس پُوچھے گا۔ کہ اِن میں سے ۶ کا ضعف کون کون سے عدد ہیں؟ لڑکے جواب دیں گے "۱۲ اور ۲۴" - اب مدرّس بتائے گا۔ کہ ایسے عددوں کو جو دو یا دو سے زیادہ عددوں کا ضعف ہو سکیں ضعفِ مشترک یا ذواضعاف مشترک کہتے ہیں۔ اور اِن میں سے جو سب سے چھوٹا عدد ہو۔ جیسے ۱۲ اُسے ذواضعاف اقل مشترک یا صرف ذواضعاف اقل کہتے ہیں۔

مدرّس پھر چند اعداد مثلاً ۴، ۶، ۸، ۱۲، ۱۵ تختہ سیاہ پر لکھے گا۔ اور طلبہ کی مدد سے اِن کے مفرد اجزائے ضربی یُوں تحریر کرے گا:-

۴ = ۲ × ۲ = ۲^۲

۶ = ۲ × ۳ = ۲ × ۳

۸ = ۲ × ۲ × ۲ = ۲^۳

۱۲ = ۲ × ۲ × ۳ = ۲^۲ × ۳

۱۵ = ۵ × ۳ = ۵ × ۳

مدرّس طلبہ سے پُوچھے گا۔ کہ ۴ کے اجزائے ضربی کے سامنے مَیں نے ۲^۲ اور ۸ کے اجزائے ضربی کے سامنے ۲^۳ کیوں لکھا ہے؟ لڑکے جواب دیں گے کہ پہلی صورت میں ۲ نے دو دفعہ اور دوسری صورت میں ۲ نے تین دفعہ ضرب کھائی ہے۔ اب مدرّس بتائے گا۔ کہ جن اعداد کا ذواضعاف اقل نکالنا ہو۔ اُن کے مفرد اجزائے ضربی دریافت کرو۔ پھر ہر قسم کے جُز کی بڑی سے بڑی طاقت لے کر اُن کو آپس میں ضرب دو۔ حاصل ضرب اُن اعداد کا ذواضعاف اقل ہوگا۔ اِس سوال میں تین قسم کے مفرد جُز ہیں۔ "۲، ۳، ۵" اِن تمام جُزوں میں ۲ کی بڑی سے بڑی طاقت ۳ ہے۔ اور ۳ اور ۵ کی ایک۔ اس لئے ذواضعاف اقل = ۲^۳ × ۳ × ۵ = ۱۲۰

پھر مدرّس بتائے گا۔ کہ اس سوال کو ہم چھوٹی تقسیم کے ذریعے بھی نکال سکتے ہیں ۔ طریقہ یہ ہے۔ کہ دئے ہُوئے اعداد کو ایک سطر میں لکھیں گے۔ پھر مفرد اعداد مثلاً ۲، ۳ وغیرہ پر جو کم از کم اُن دئے ہُوئے عددوں میں سے دو کو تقسیم کر دیں تقسیم کرتے جائیں گے حتےٰ کہ ایسے اعداد آخری سطر میں رہ جائیں ۔ جن میں کوئی جزو مشترک نہ ہو۔ اب جتنے مقسوم علیہ ہیں۔ اُن کا اور آخری سطر کے اعداد کا حاصل ضرب ذو اضعاف اقل مطلوب ہو گا۔ سوال یُوں حل کیا جائے گا :-

۲) ۴ - ۶ - ۸ - ۱۲ - ۱۵
۲) ۲ - ۳ - ۴ - ۶ - ۱۵
۳) ۱ - ۳ - ۲ - ۳ - ۱۵
۱ - ۱ - ۲ - ۱ - ۵

ذو اضعاف اقل = ۲×۲×۳×۲×۵ = ۱۲۰

عاد اعظم اور ذو اضعاف اقل سکھانے کے بعد مدرّس کسور عام کے چاروں قاعدے سکھانے کی طرف متوجہ ہو گا ۔ مدرّس طلبہ کو اٹھنّی ۔ چونّی ۔ دونّی ۔ آنہ دکھا کر پُوچھے گا۔ یہ سکّے کون سے سکّے کے حصّے ہیں ؟ لڑکے جواب دیں گے " روپے کے "

م (مدرّس) یہ کیونکر حاصل ہُوئے ؟ — ط (طلبہ) ۔ روپیہ بھنانے سے ۔
م " ۔ اٹھنّی روپے کا کون سا حصّہ ہے ؟ — ط " ۔ آدھا (دوسرا حصّہ)
م " ۔ چونّی روپے کا کون سا حصّہ ہے؟ — ط " ۔ چوتھا حصّہ ۔
م " ۔ دونّی روپے کا کون سا حصّہ ہے؟ — ط " ۔ آٹھواں حصّہ ۔
م " ۔ آنہ روپے کا کون سا حصّہ ہے ؟ — ط " ۔ سولھواں حصّہ ۔

اب مدرّس بتائے گا۔ کہ کسی چیز کے آدھے یا دوسرے حصّے کو $\frac{۱}{۲}$ چوتھے حصّے کو $\frac{۱}{۴}$ آٹھویں حصّے کو $\frac{۱}{۸}$ اور سولھویں حصّے کو $\frac{۱}{۱۶}$ بھی لکھتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم نے ایک چیز کے دو ۔ چار ۔ آٹھ یا سولہ حصّے کر کے اُن میں سے ایک ایک حصّہ لیا ہے ۔ نیز لڑکوں کو سمجھائے گا۔ کہ کسی سکّے کو بھنائیں ۔ یا کسی چیز کے ٹکڑے کریں ۔ اُس سکّے کا ہر ایک حصّہ یا اُس چیز کا ہر ایک ٹکڑا اس کی کسر کہلائے گا۔ اس لئے ہم $\frac{۱}{۲}$، $\frac{۱}{۴}$، $\frac{۱}{۸}$، $\frac{۱}{۱۶}$ کو کسور کہیں گے۔

اور چونکہ ایسی کسور میں ہمیں اختیار ہے۔ کہ ہم کسی چیز کے جتنے حصے چاہیں۔ بنا لیں - کوئی خصوصیت یا پابندی نہیں۔ اس لئے انہیں کسور عام کہتے ہیں۔

مدرس پھر مختلف اشکال اور امثال سے $\frac{3}{5}$ ، $\frac{2}{3}$ ، $\frac{4}{7}$ ، $\frac{3}{8}$ وغیرہ کا تصور دلائیگا مثلاً وہ $\frac{3}{8}$ کا تصور دلانے کے لئے یہ شکل تختہ سیاہ پر بنائے گا۔ اور کہے گا۔ کہ ایک قطعۂ زمین کے آٹھ ٹکڑے کئے گئے ہیں۔ ہم نے اُن میں سے تین ٹکڑے خریدے ہیں۔ گویا ہم نے تمام قطعۂ زمین کا $\frac{3}{8}$ حصہ خریدا ہے۔
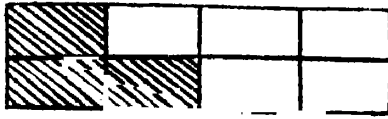
اب مدرس کسروں کے پڑھنے کا طریقہ طلبہ کو بتائے گا۔ اور سمجھائے گا کہ کسر کا نچلا ہندسہ چونکہ بتاتا ہے کہ ایک چیز کے کتنے حصے کئے گئے ہیں۔ اس لئے اسے مخرج (نکلنے کی جگہ۔ خرچ کی اصل) کہتے ہیں۔ اور لکیر کے اوپر کا ہندسہ جتنے حصے لئے جاتے ہیں۔ اُن کا شمار بتاتا ہے۔ اس لئے اسے شمارکنندہ کہتے ہیں۔ صحیح عدد کا تصور دلانے کے لئے مدرس لڑکوں سے پوچھے گا۔ کہ ۳ آنے کو ہم روپے کی کسر کی صورت میں لکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکر لکھیں؟ لڑکے کہیں گے "$\frac{3}{16}$" اب مدرس بتائے گا۔ کہ اگر ہمارے پاس ۳ آنے کے علاوہ دو روپے بھی ہوں۔ تو پھر کسر کو ۲ $\frac{3}{16}$ لکھتے ہیں۔ اور اسے دو صحیح تین بٹے سولہ پڑھتے ہیں۔ یعنی جس چیز کی ہمارے پاس کسر ہے۔ اگر ایسی چیزوں کی کچھ تعداد سالم صورت میں بھی ہمارے پاس موجود ہو۔ تو اُسے کسر کے بائیں پہلو پر لکھ دیا جاتا ہے۔

کسور عام کی جمع و تفریق کا طریق مدرس اس طرح بچّوں کے ذہن نشین کرے گا:-

مدرس بچّوں کو ایک اٹھنّی، ایک چونّی، ایک دونّی اور ایک آنہ دکھا کر پوچھے گا:-

م۔ ہمارے پاس کتنے سِکّے ہیں؟ ط۔ چار سِکّے۔

م۔ اِن کو جمع کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا پڑے گا؟ ط۔ اِن کے آنے لینے ہوں گے۔

م۔ اِن کے آنے ہم کیوں لیں گے؟ ط۔ کیوں کہ چھوٹا سکہ "آنہ" ہے

م۔ اِن سکّوں کو روپے کی کسر کی صورت میں کیوں کر لکھیں گے؟

ط۔ اٹھنّی = ۱/۲
چونّی = ۱/۴
دونّی = ۱/۸
آنہ = ۱/۱۶

مدرّس کہے گا۔ کہ اِن کسروں کو ہم جمع کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اِن کو جمع کرنے کے لئے بھی ہمیں اِن سب کو ہم جنس کرنا پڑے گا۔ پھر مدرّس طلبہ سے یوں گفتگو کرے گا:۔

م (مُدرّس) روپے کے کتنے آنے ہوتے ہیں؟ ط (طلبہ) سولہ آنے

م۔ سولہ میں سے آٹھ آنے لیں تو کسر کی صورت میں کیونکر لکھیں گے؟ ط۔ ۸/۱۶

م۔ سولہ میں سے چار آنے لیں تو کیونکر لکھیں گے؟ ط۔ ۴/۱۶

م۔ سولہ میں سے دو آنے لیں تو کیونکر لکھیں گے؟ ط۔ ۲/۱۶

م۔ سولہ میں سے ایک آنہ لیں تو کیونکر لکھیں گے؟ ط۔ ۱/۱۶

م۔ ہم نے سولہ آنوں میں سے کُل کتنے آنے لئے ہیں؟ ط۔ پندرہ آنے

م۔ اگر سولہ آنوں میں سے پندرہ آنے لے لیں تو کسر کی صورت میں کیسے لکھیں گے؟ ط۔ ۱۵/۱۶

م۔ تمام کسروں کے شمار کنندوں کا مجموعہ کیا ہے؟ ط۔ ۱۵

م۔ ہر ایک کسر کا مخرج کیا ہے؟ ط۔ ۱۶

اب مدرّس طلبہ کو کسروں کے مجموعے یعنی ۱۵/۱۶ کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہے گا۔ کہ تمام کسروں کے شمار کنندوں کو جمع کر کے مشترکہ مخرج کے اوپر لکھ دیا گیا ہے۔ پس کسور عام کی جمع کے لئے ضروری ہے کہ پہلے تمام کسور کو ہم مخرج کیا جائے۔ اب مدرّس بتائے گا۔ کہ اوپر

کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ کہ اٹھنّی روپے کا $\frac{۱}{۲}$ حِصّہ بھی ہے اور $\frac{۸}{۱۶}$ بھی۔ چونّی روپے کا $\frac{۱}{۴}$ حِصّہ بھی ہے اور $\frac{۴}{۱۶}$ بھی۔ دونّی روپے کا $\frac{۱}{۸}$ حِصّہ بھی ہے اور $\frac{۲}{۱۶}$ بھی۔ جب ہم اِن مثالوں پر غور کرتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے کہ اگر مخرج اور شمار کنندے کو ایک ہی عدد سے ضرب دیں۔ تو کسر کی قیمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پس کسور کو ہم مخرج کرنے کے لئے مخرج کو جس عدد سے ضرب دینی پڑے۔ اُسی عدد سے شمار کنندہ کو ضرب دے دیں۔ ہم مخرج کرنے کا آسان قاعدہ یہ ہے۔ کہ کسروں کے مخارج کا ذو اضعاف اقل نکال لیا جائے۔ وہ ذو اضعاف اقل تمام کسروں کا مخرج بن جائے گا۔ اب اُسے باری باری ایک ایک کسر کے مخرج پر تقسیم کرکے خارج قسمت کو اُس کسر کے شمار کنندہ سے ضرب دیتے جائیں۔ تاکہ مخرج کے مطابق ہر ایک عدد کا شمار کنندہ بھی معلوم ہو جائے۔ اب اِن شمار کنندوں کو جمع کریں۔ اور مشترکہ مخرج کو نیچے لکھ لیں۔ یہی اِن کسور کی جمع کا جواب ہوگا۔ مثلاً مندرجہ بالا سوال کو ہم یُوں حل کریں گے:۔

$$\frac{۱۵}{۱۶} = \frac{۱ + ۲ + ۴ + ۸}{۱۶} = \frac{۱}{۱۶} + \frac{۱}{۸} + \frac{۱}{۴} + \frac{۱}{۲}$$

مدرّس جمع کا قا ره ذہن نشین کرانے کے بعد مختلف قسم کے سوالات حل کرا کے قاعدے کی مشق کرائے گا اور پھر اسی قاعدے کی مدد سے تفریق کا قاعدہ نہایت آسانی سے لڑکوں کو سکھا سکے گا۔ حساب کے دوسرے ضروری قواعد کی تعلیم میں مدرس کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُن کے متعلق مضمون کی آئندہ قسط میں بحث کی جائے گی ؛

اُستاد کی ذمہ داریاں اور حقوق

رازق نور

اِس میں شک نہیں۔ کہ آج ہمارا ملک تعلیم میں بہت پسماندہ ہے۔ اور یہ بھی ایک فیصلہ شدہ امر ہے۔ کہ کسی قوم یا ملک کی ترقی کا دارو مدار تعلیم ہی پر ہے۔ لیکن یہ کہنا۔ کہ اِس کی تمام تر ذمہ داری اُستاد پر عائد ہوتی ہے۔ بالکل بعید از انصاف ہے۔ کیونکہ اگر ماحول گھناؤنا ہو۔ تو انسان فی نفسہٖ کچھ بھی نہیں کرسکتا۔ اور یہی ہماری تعلیمی پسماندگی کا واحد سبب ہے۔ جو ملک ہم سے تعلیم میں آگے ہیں۔ وہاں ماحول اُستاد اور شاگرد دونو کے لئے سازگار ہے۔ اِس لئے اُستاد پڑھا سکتا ہے اور شاگرد سیکھ سکتا ہے۔ وہاں قومی زندگی کے دوسرے عناصر تماشائی کی طرح الگ اور اُونچے کھڑے تماشہ نہیں دیکھتے۔ بلکہ ایک مونس و غمخوار دوست کی طرح ہر لحظہ اور ہر لمحہ تعلیم و تعلّم کی مدد پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ وہاں نہ اُستاد اس عظیم الشّان مہم کے طے کرنے میں تن تنہا مصروف کار ہوتا ہے۔ اور نہ متعلّم کو یاس و بیکسی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں تعلیمی ترّقی کا بوجھ تمام لوگ اپنے کندھوں پر یکساں محسوس کرتے ہیں۔ کوئی اس اہم اور مقدّس فریضہ کے بوجھ سے اپنے آپ کو بری الذّمہ نہیں گردانتا۔ اور نہ یہ تمام ذمہ داری اُستاد کے گلے ڈالتا ہے۔ بلکہ مہذب ممالک میں ہر شخص اُستاد ہے

در ہر فرد شاگرد۔ تعلیم پر وقت کی پابندی نہیں ہے۔ اور نہ مقام کی قید ہے۔ اِن ممالک
میں ہر وقت اور ہر مقام پر تعلیم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حتّٰی کہ وہاں کھانے کی میزوں
پر جو تعلیم ملتی ہے۔ وہ ہمارے کالجوں کی تعلیم سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ وہاں سینما میں
بچّے زیادہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بہ نسبت اُس تعلیم کے جو ہمارے یہاں دیہاتی مدارس
میں اَن ٹرینڈ (غیر تربیّت یافتہ) اور نیم تعلیم یافتہ اساتذہ دیتے ہیں۔

اِن سب باتوں کے علاوہ خود اُستاد کو بہت سی سہولتیں مہیا ہوتی ہیں۔ اُستاد کو
عزّت واحترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی وہی قدر ومنزلت ہوتی ہے۔ جو ایک
جج یا پولیس افسر کی ہوتی ہے۔ اس کی رائے سیاسی حلقوں میں کافی وقیع ہوتی ہے۔ رہنے
کو اچھا سا مکان مہیّا ہوتا ہے۔ تنخواہ معقول ہوتی ہے اور وہ خواب میں بھی ننگا یا بھوکا ہو جانے
کا خدشہ محسوس نہیں کرسکتا۔ وہ اچھے سے اچھے ڈاکٹر سے اپنا اور بچّوں کا علاج کرا سکتا ہے۔ اور
اس کے علاوہ وہ بڑھاپے کے لئے کافی کچھ بچا سکتا ہے۔ عام اساتذہ کی فارغ البالی کا اندازہ
اس امر سے لگایا جاسکتا ہے۔ کہ پبلک لائبریریوں کے باوجود ایک عام اُستاد ایک اچھی
سی لائبریری کا مالک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ مدرّس کا پیشہ اختیار کرنے سے گریز نہیں
کرتے۔ بلکہ کوشش کرتے ہیں۔ کہ اُستادی کے لئے منتخب ہونے میں کامیاب ہوسکیں۔ لہٰذا
برعکس ہمارے ملک کے ترقی یافتہ ممالک کے محکمۂ تعلیم میں صرف قابل ترین لوگ ہی کھپ
سکتے ہیں۔

طلبا کے لئے ترقی یافتہ ممالک میں ہوادار سکول ہیں۔ فراخ اقامت گاہیں ہیں۔
کھیلوں کے وسیع وعریض میدان ہیں۔ اُن کے لئے ہر قسم کے سامان سے آراستہ
ریاضت گاہیں ہیں۔ بیش بہا لائبریریاں ہیں۔ بڑی بڑی تجربہ گاہیں اور معمل ہیں سیکڑوں
میں اپنی طلسماتی لالٹینیں ہیں۔ اور بعض تعلیمی اداروں نے اب تعلیمی فلموں کا انتظام بھی کر لیا
ہے۔ اور جب چھٹیاں ہوتی ہیں۔ تو طلبا تعلیمی اداروں ہی کے خرچ پر اپنے اساتذہ کے ساتھ

جغرافیائی مناظر اور تاریخی عمارات وغیرہ کا مطالعہ کرنے کے لئے دُور دُور کے ملکوں کی سیر کراتے ہیں۔

مدرسے کے باہر بھی سارا ماحول تعلیمی ہوتا ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک میں طلبا کے والدین متعلقین اور دوست۔ ہمارے والدین اور رشتہ داروں کی طرح اَن پڑھ اور اُجڈ نہیں ہوتے۔ سکول میں اگر کوئی تعلیمی کمی باقی رہ جائے۔ تو وہ باہر آکر پُوری ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں معاملہ بالکل اِس کے برعکس ہے۔ طلبا جو کچھ سکول میں سیکھ لیتے ہیں وہ سکول ہی میں چھوڑ جاتے ہیں۔ سکول کے باہر گھر میں آکر لڑتے ہیں۔ یا گلی میں گُلّی ڈنڈا کھیلتے رہتے ہیں۔ سکول کے باہر وہ بالکل ایک نئی اور مختلف فضا سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور دوسری صبح سکول میں بالکل سفید کاغذ کی طرح کورا دماغ لے کر آتے ہیں۔ بعض کے پاس کتاب ندارد۔ بعض قلم سے محروم اور بعض پنسل سے بے نیاز۔ کوئی کاپی گھر میں بھول آیا ہے۔ اور کسی کی کتاب بکری کھا گئی۔ سُننے اور سمجھنے سے زیادہ تفریح کے گھنٹے کا خیال۔ اور ساری چھٹی ملنے پر تو آسمان سر پر اُٹھا لیا جاتا ہے۔ اور بعض طلبا تو اس سے بھی چند قدم آگے ہیں۔ وہ ہمیشہ دعا کرتے رہتے ہیں۔ کہ کوئی اُستاد مر جائے۔ تاکہ مہینوں سبق سے چُھٹی ملے۔ کیونکہ آج کل یہ حال ہے۔ کہ اگر کسی طرح مدرسے کا کوئی اُستاد کم ہوا۔ تو پھر اُس کی جگہ دو دو مہینے تک دوسرے اُستاد کے تقرر میں لگ جاتے ہیں۔ لڑکے تو نادان ہوتے ہیں۔ مگر اس صورت حال کا جلد تدارک نہ ہو۔ تو اس طرح کتنا عظیم قومی نقصان ہوتا ہے۔

اب ذرا اپنے ملک کے اُستاد کی حالت ملاحظہ ہو۔ خلق کا راندہ ہوا۔ ملت کا ٹھکرایا ہوا مایوس انسان ہے۔ دوسروں کو پار لے جاتا ہے اور خود اُسی کنارے پھر واپس آتا ہے زندگی میں اپنا کوئی ارمان پُورا ہوتے نہ دیکھا۔ بچّوں کا فکر اور انسپکٹر کا خوف ہر وقت سر پر سوار رہتا ہے۔ ذرا سی لغزش ہوئی اور "کالے پانی" کی سزا ملی۔ بہت قلیل تنخواہ ہے اور تیس۳۰ روپے من گندم کا بھاؤ ہے۔ بھوکا سوئے یا ننگا پھرے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اُس

سے تو تانگے والا اچھا جو پانچ روپے روز کما لیتا ہے۔ اور پھر اُس سے یہ توقع کہ سقراط کی طرح کیوں نہ پڑھایا۔ افلاطون کی طرح فصاحت کے دریا کیوں نہ بہائے۔ حالانکہ سقراط اور افلاطون کی تو وہ قدر و منزلت اپنی قوم میں تھی۔ کہ بڑے بڑے اولوالعزم حکام اُن کے سامنے خوف و رعب سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ اِس بیچارے سے تو گھسیارہ بھی اچھا ہے۔ جو صبح سویرے کھیتوں میں جا کر سبز سبز گھاس سے اپنی آنکھیں بھی شاداب کر لیتا ہے۔ اور شام کو بغیر سردردی کے بچوّں کے لئے چند ٹکے بھی کما ہی لاتا ہے۔

پس یہ امر حقیقت ہے۔ کہ ہماری قوم تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہے۔ اور یہ بھی امرِ واقعہ ہے۔ کہ تعلیم کے بغیر ترقّی ناممکن ہے۔ یہ بھی قابلِ تسلیم بات ہے۔ کہ تعلیم دینا دلانا مدرّس کا فرض ہے۔ لیکن کیا کبھی باتوں سے بھی پیٹ بھر سکتا ہے۔ کیا ننگا۔ بھوکا۔ بے وقار غیر مطمئن اور لاچار انسان بھی کوئی بڑا کام کر سکتا ہے۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوُا۔ جس قوم نے اُستاد کو ٹھکرایا۔ وہ خود گر گئی۔ جس ملک نے اُستاد کی پرواہ نہ کی۔ وہ جاہل ہی رہا۔ کیا متمدن اقوام کا ارتقا ان کے معلموں کے کارناموں کا نتیجہ نہیں؟ جس ملک نے اُستاد کو سہولتیں بہم نہ پہنچائیں۔ وہاں کے باشندے ترقی کے میدان میں زینہار آگے نہ بڑھ سکے۔ تاریخ شاہد ہے۔ لہٰذا کسی قوم یا ملک کی تعلیمی پسماندگی کی ذمہ داری اُستاد سے زیادہ اُس قوم یا ملک کے افراد اور اربابِ اقتدار پر ہے۔

خوش قسمت ہیں وہ قومیں اور وہ ملک جو اُستاد کا مرتبہ پہچانتے ہیں۔ مبارکباد کے قابل ہیں وہ حکومتیں جو اُستاد کو اپنے حقوق دلا کر اپنی رعایا پر تعلیم و ترقی کے دروازے کھول دیتی ہیں۔

عرب صحرائیوں کی زندگی

از:۔ انور قریشی

عرب کا صحرائی اس صحرا کی طرح غیر مبدل ہے جس میں وہ اپنی تمام زندگی بسر کرنے کے بعد دفن ہوجاتا ہے۔ وہ بیکسی کے عالم میں مگر کمال وفا داری کے ساتھ قدرت کی طاقتوں کے سامنے سرنگوں ہے۔ اس کی تمام زندگی بادیہ پیمائی اور صحرانوردی میں صرف ہوجاتی ہے سردیوں میں سخت سردی اور موسم گرما میں ریت کی آندھیوں اور بادِ سموم کا مقابلہ کرنا اسی کا حصّہ ہے۔

عرب صحرانشین اپنی تمام عمر خیمہ میں بسر کرتا ہے۔ جسے وہ اونٹ یا بکری کے بال سے بنے ہوئے کپڑوں سے تعمیر کرتا ہے۔ لہذا ان خیموں کو "خیمہ ہائے مو" کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ جب ایک چراگاہ خشک ہونے کو آتی ہے تو صحرانشین اپنا گھر دوسری چراگاہ میں لے جاتا ہے۔ خیمے مستطیل شکل کے ہوتے ہیں۔ اور ان کی ایک طرف صحرا کی جانب کھلی ہوئی ہوتی ہے۔ خیموں کا منہ بالعموم مشرق کی سمت ہوتا ہے۔ اور ان کی دیواریں سورج کی بلندی کے مطابق اونچی کرلی جاتی ہیں۔ رات کے وقت خیموں کی دیواروں کو ہٹا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ عرب چھت کے نیچے تو سو لیتے ہیں مگر دیواروں کے اندر نہیں۔

صحرائی کے پاس زادِ راہ بہت کم ہوتا ہے۔ وگرنہ آئے دن کی خانہ بدوشی دشوار

ہو جائے۔ ہر خیمہ میں ایک آدھ غالیچہ۔ دو ایک دیگچیاں چاول اور گوشت پکانے کے لئے۔ اور چند دوسرے برتن ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کا لباس بھی بہت مختصر اور سادہ ہوتا ہے۔ مرد ایک لمبا چغہ پہنتے ہیں۔ جو کمر پر ایک چمڑے کی پیٹی سے کسا ہوا ہوتا ہے۔ اور سردیوں میں بھی چغہ بجائے سوت کے اُون کا ہوتا ہے۔ جو اونٹ کے جسم سے حاصل کی جاتی ہے۔ سر کے اوپر ایک چورس شکل کا سوتی یا ریشمی رومال باندھ کر اسے ایک مضبوط رسّی سے کس لیا جاتا ہے۔ صحرائی عورت کا لباس بھی بہت سادہ ہوتا ہے۔ وہ مرد سے بھی زیادہ کھلی قسم کی چغہ نما قمیص پہنتی ہے۔ اور اسی قسم کا کپڑا سر ڈھانپنے کے لئے استعمال کرتی ہے۔ مگر اسے پگڑی کی طرح سنوار لیا جاتا ہے۔ بعض امیر عورتیں بجائے سوتی کپڑے کے ریشمی لباس پہنتی ہیں۔ مگر وہ ہوتا اسی وضع کا ہے۔ بعض عورتیں زیورات کا استعمال بھی کرتی ہیں جو مدینہ منورہ، دمشق یا بغداد سے خریدے جاتے ہیں۔ مگر ان میں کوئی خاص عمدگی نہیں ہوتی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ تمام اونی کپڑا عورتوں کا اپنا تیار کردہ ہوتا ہے۔ مگر ریشمی کپڑا شہری منڈیوں سے پنیر کھال اور اُون کے تبادلہ میں حاصل کیا جاتا ہے۔

ظاہری شکل وصورت میں بدو دُبلے پتلے ہوتے ہیں۔ اور ایسا ہونا قدرتی بھی ہے کیونکہ ان کی خوراک ہی کیا ہے۔ سوائے دودھ۔ بھُنے ہوئے اناج۔ آٹے اور کھجور کے انہیں نصیب ہی کیا ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غریب صحرائی پیٹ بھر کے پانی بھی نہیں پی سکتا۔ بعض اوقات اسے اپنی پیاس سے صبر کرکے اُونٹ کے لئے پانی رکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس کی بہبودی اسی میں ہے۔ کہ اس کا مویشی تنومند رہے۔ پانی کی بجائے وہ مویشی کے دودھ پر ہی اکتفا کرتا ہے۔ مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ پیاسے مرنے کی بجائے وہ اپنے جانور کے پیٹ کو پھاڑتا ہے۔ اور اسی جمع شدہ پانی سے اپنی حاجت روائی کرتا ہے۔ اندازہ تو کیجئے کہ اس غریب کی زندگی کن دشوار گذار راہوں کو طے کرتی ہے۔ واقعی ایک دراز قد۔ دھوپ سے جلا ہوا۔ پچکے ہوئے چہرے پر نوکیلی ناک رکھنے والا عرب صحرائی کیسی حسین وجمیل شخصیت

ل ہے۔ وہ خود پاک ہے اور اس کی صحرائی زندگی شہر کی گہما گہمی سے زیادہ اچھی دلچسپیاں
، ہوئے ہوتی ہے۔

بدو کی زندگی میں دو فطری رجحانات بلند تر نظر آتے ہیں۔ خود غرضی اور تحفظ
ش۔ ان کے بغیر وہ صحرا کے بے رحم ماحول میں پنپ بھی نہیں سکتا۔ صحرا جہاں اس کی
ست کا پیش خیمہ ہے وہیں اس کی نیکیوں کا سرچشمہ بھی ہے۔ جہاں اس کا ماحول
ے تند خو بناتا ہے وہیں اس کی طبیعت میں صبر و استقلال اور انتہائی انفرادیت کا جذبہ
ا بھر دیتا ہے۔ اپنی زندگی میں کوئی اجتماعی ضبط یا نظام قائم کرنے کے لئے اس کے پاس
ت نہیں ہوتا۔ اور وہ صرف قانونِ صحرا یا سردارِ قبیلہ کے احکام کا پابند ہے۔

یونکہ فرد اپنی انفرادی حیثیت سے صحرائی قوتوں کے خلاف نبرد آزما نہیں ہو سکتا۔
ا بدو مجبور ہے کہ وہ اپنی اجتماعی زندگی اختیار کرے۔ اس جمعیت کے لئے اس کے قریب
ن اس کا قبیلہ یا اپنے کنبے کے افراد ہیں۔ چنانچہ انہیں لوگوں کے ساتھ وہ تمام عمر منسلک
اہے۔ اور کچھ ایسی وفاداری کا ثبوت دیتا ہے۔ کہ کوئی دوسرا شخص اس خلوص کا اظہار
حکومت یا ریاست سے بھی نہیں کر سکتا۔ اس کا کنبہ اس کے لئے ایک خاص قسم کی
یس کا پیکر ہے۔ یہاں تک کہ اس کے کنبے کے خلاف کوئی حرکت سرزد کرنا اس کے
ڈ دشمنی خریدنا ہے۔ وہ اس حرکت کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ عرب
ئیوں میں قبیلوں کے جھگڑے پشتوں تک چلے جاتے ہیں۔

بدو کا عام پیشہ بھیڑ بکری اور اونٹ پالنا یا چھاپا مارنا ہے۔ مویشی اس کی سب
بڑی دولت ہے۔ کیونکہ اس کی خورد و نوش لباس حتٰے کہ خیموں تک کا انحصار انہی
ے۔ اور یہی اس کی روزانہ نقل و حرکت میں ممد ثابت ہوتے ہیں۔ اونٹ بالخصوص
حرائی کی محبت کا مرکز ہے۔ کیونکہ یہ جانور اپنے گدّے دار پاؤں اور پیاس کی برداشت
عث صحرا میں طویل سفر کے لئے موزوں ترین مویشی ہے۔ اور سردیوں میں تو اونٹ

پانی کے بغیر ۲۵ دِن تک سفر کر سکتا ہے۔ عمدہ گھوڑے عرب کا خاص تحفہ ہیں۔ مگر ان کی پرورش زیادہ تر امیر طبقے کا پیشہ ہے۔ کیونکہ گھوڑا صحرائی زندگی میں ایک عشرت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ طویل مسافت کے لئے جو موزونیت اُونٹ میں ہے وہ گھوڑے میں نہیں۔ مزید دلچسپی کا باعث یہ امر ہے کہ عرب اپنی دولت کا اندازہ روپے پیسے سے نہیں لگاتا بلکہ اونٹ بکری اور بھیڑ کی تعداد سے لگاتا ہے۔

عرب کے بدوؤں کا دوسرا بڑا مشغلہ چھاپا مارنا یا 'غزوہ' ہے۔ گو دنیا میں اس حرکت کو لُوٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر صحرا کے اقتصادی اور مجلسی حالات نے غزوہ کو ایک قومی رواج کی شکل دے دی ہے۔ اور عرب تو اسے ایک خاص مردانہ مشاغل میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ صحرائیوں کے دیگر مشاغل اور کھیلوں کی طرح اس کے بھی اصول ہیں۔ اور سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ انتہائی ضرورت کے علاوہ خون نہ بہایا جائے۔ ہر قبیلے کی یہ پیہم خواہش ہوتی ہے کہ دوسروں کے اُونٹ زبردستی چھین لئے جائیں۔ بشرطیکہ انہیں کم سے کم جسمانی نقصان پہنچے۔ اس عجیب کھیل کے مذموم پہلوؤں کے باوجود عربوں کی مہمان نوازی ضرب المثل ہے۔ وہ ایک دوسرے سے زبردستی اشیاءِ زندگی چھین لیتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود صحرائی زندگی کی بے بسی انہیں مہمان نوازی پر مجبور کرتی ہے یعنی تُند خوئی اور دیدہ دلیری کے باوجود ان کے دِلوں میں ایک دوسرے کے لئے رحم اور ترس کا مادہ کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایک شخص کو مہمان کہنے کے بعد ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس سے کسی قسم کی بدسلوکی روا رکھی جائے۔ ناروا سلوک بعض اوقات گناہِ عظیم بن جاتا ہے۔ جس کی ہرگز تلافی نہیں ہو سکتی۔ میزبان کے گھر میں جب دشمن بھی داخل ہو جائے تو وہ مہمان ہے اور اس سے اتنا بھی نہیں پوچھا جاتا۔ کہ وہ کس غرض سے آیا ہے۔ اور مہمان اگر چور بھی ہے تو مہمانی کی حالت میں چوری نہیں کرے گا۔ البتہ وہ بعد ازاں پلٹ کر اُسی گھر پہ ڈاکہ ڈال سکتا ہے۔

مسافر بالعموم سب سے بڑے خیمے کے پاس آکر ٹھہر جاتے ہیں خیمے کے بانس پر ہاتھ رکھ کر مسافر اندر آنے کی اجازت طلب کرتا ہے۔ اور دخیلک کا لفظ سنتے ہی اسے اجازت دے دی جاتی ہے۔ وہ خیمے کے مالکوں میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے۔ مختلف موضوعات پر سیر حاصل بحث ہوتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ کھانے کا وقت ہو جائے۔ کھانا زیادہ تر کھجور اور روٹی پر مشتمل ہوتا ہے۔ جسے سب ایک ہی دسترخوان پر اکٹھے مل کے کھاتے ہیں۔ اگر کوئی خاص دعوت ہو تو ایک بڑے تھال میں اُبلے ہوئے چاول جن کے اُوپر گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے رکھے ہوئے ہوتے ہیں لایا جاتا ہے۔ یہ کھانا عورتیں خیمے سے کچھ فاصلے پر تیار کرتی ہیں تاکہ اس کی بُو خیمۂ خاص تک پیشتر ہی نہ پہنچ جائے۔ کھانا ختم ہونے پر قہوہ پیش کیا جاتا ہے۔ پینے کے لئے دُودھ اور پانی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ شراب اور سؤر کے گوشت سے ان ان پڑھ صحرائیوں کو بے حد نفرت ہے۔ اس ماحول کے باوجود احکامِ خداوندی کی یہ پیروی کس قدر قابلِ قدر ہے۔

قبیلے کے سردار کو شیخ کہا جاتا ہے۔ جس کے انتخاب کا انحصار اس کی اخلاقی بلندی پر ہے۔ بالفرض اس کے چلن میں بعدازاں کوئی سقم پیدا ہو جائے تو اس کی جگہ اور آدمی منتخب کر لیا جاتا ہے۔ بالعموم وہی رہنما ہے وہی ناصح اور منصف ہے۔ مگر بوقتِ ضرورت وہ قبیلہ کے سرداروں کو جمع کر لیتا ہے۔ اور ان کے مشورے سے استفادہ کرتا ہے۔

عرب صحیح معنوں میں جمہوریت پسند ہے۔ وہ اپنے شیخ کے روبرو مساویانہ حقوق کا خواہاں ہے۔ وہ اس سے کسی صورت کم حیثیت نہیں رکھتا۔ نہ کھانے پینے میں اور نہ رہنے سہنے میں۔ جس طرح شیخ اپنے قبیلہ کے افراد کی اخوت سے زندہ ہے اسی طرح ہر صحرائی بھی ہے۔ اس تمام مساوات و اخوت کے باوجود ہر بدو اپنے آپ کو ایک سردار سے کم نہیں سمجھتا۔ کیونکہ نسلی برتری ان کی گھٹی میں اُتر چکی ہے۔ نسب کی بلندی ہی ایک چیز ہے۔ جس پر اہلِ عرب کو ہمیشہ فخر رہا ہے۔ انہیں اگر کہیں کمال نظر آتا ہے تو اپنی ہی نسل میں۔

ان کے نزدیک مویشیوں کی افراط یقیناً سرمایہ داری اور امارت کی علامتِ خاص

ہے۔ مگر قوت کا تمام تر دارومدار افرادِ قبیلہ کی تعداد پر ہے۔ چنانچہ ہر بدو ہمیشہ کوشاں رہتا ہے کہ اپنے کنبے کے افراد کی تعداد میں اضافہ کرے۔ بچوں کی تعداد ان کی عزت اور منزلت میں اضافہ کرتی ہے۔ چنانچہ اسی نسلی رجحان سے تعدّد ازدواج کا فلسفہ بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے

عرب عورت بیشک مرد کے تابع ہے۔ اور اکثر اوقات دوسری عورتوں کے ساتھ ایک ہی شوہر کی محبت میں شریک رہتی ہے۔ مگر وہ کسی صورت اس کی خواہشات کی غلام نہیں رہتی۔ صحرائی عورتیں برقعہ پوش نہیں ہوتیں اور روزمرّہ کاروبارِ زندگی میں مرد کے ساتھ برابر کی شریک ہوتی ہیں۔ اور مرد کی طرح ہر عمل میں آزادانہ حصّہ لیتی ہیں۔ اسے شوہر کے انتخاب میں پوری آزادی حاصل ہے۔ اور اگر طلاق کی نوبت آئے تو عورت مرد کو اتنی ہی آزادی سے طلاق دیتی ہے۔ جیسے مرد عورت کو۔ بشرطیکہ وجہِ طلاق مدلّل ہو۔ یہ آزادی کیوں نہ ہو۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کو اسی صورت میں چار شادیاں کرنے کی اجازت دی ہے۔ جب وہ چاروں کے برابر اخراجات کا کفیل ہو۔ ان سے مساویانہ سلوک کرسکے۔ اور ایک کو دوسری کی خاطر پسِ پُشت نہ ڈال رکھے۔

آج کل صحرا نشینانِ عرب موجودہ اندازِ زندگی سے بھی روشناس ہو رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں بڑے بڑے شہر آباد ہو گئے ہیں۔ یا لوگ ہوائی جہازوں۔ موٹر گاڑیوں اور ریلوے ٹرینوں پر سفر کرنے لگے ہیں۔ محض اتنا دیکھنے میں آتا ہے کہ بدوؤں کے پاس بندوق۔ پستول اور صحرائی چشمے عام ہیں۔ نقل و حرکت کا عام ذریعہ فی الحال اُونٹ ہی ہے۔ گو مدینہ سے دمشق تک۔ مدینہ سے معان تک اور عدن سے لحاج تک ریلوے لائین بچھا دی گئی ہے۔ جدہ سے مدینہ تک ٹیلیفون ہے۔ اور جدہ سے پورٹ سوڈان تک تار کا سسٹم جاری ہے۔ کبھی کبھی صحرا کے اوپر ہوائی جہاز بھی گرمِ پرواز نظر آتا ہے۔ مگر بہ اندازِ سفر بہت کم اختیار کیا جاتا ہے۔ موٹر کا سفر بھی رواج پکڑ رہا ہے۔ بالخصوص شہروں میں۔ مثلاً علاقۂ نجد جہاں سلطان ابنِ سعود موٹر کار ہی کا استعمال کرتے ہیں۔

آباد ساحلی علاقوں پر غیر ممالک سے باقاعدہ تجارت کا سلسلہ بھی قائم ہو چکا ہے۔ عرب زیادہ تر قہوہ۔ کھالیں۔ اُون۔ بھیڑیں اور کھجوریں دساور کو بھیجتے ہیں۔ مگر تجارت درآمد کے مقابلے میں برآمد بہت ہی حقیر ہے۔ بہت ممکن تھا۔ کہ اس کمی کے باعث ملک دیوالیہ ہو جاتا۔ مگر مدینہ منورہ کے سَو میل جنوب کی طرف سونے کی ایک کان کی دریافت نے معاملات کو سدھار دیا ہے۔ الخوبر کے علاقہ میں تیل کے چشموں نے بھی ملک کی مالی حالت کو بہت بہتر بنا دیا ہے۔

آج کل ملکِ عرب چھ ریاستوں پر مشتمل ہے۔ سعودی عرب۔ امامتِ یمن۔ سلطانِ عمان اور کویت۔ برطانوی شاہی نوآبادی اور جزرۃ ہائے بحرین کی برطانوی پریٹکٹوریٹ۔ اِن سب میں اہم ترین اولین ہے۔ جہاں سلطان ابنِ سعود حجاز اور نجد کو ملا کر ایک مستحکم حکومت قائم کئے ہوئے ہیں۔ وہ اسی تحریک کے علمبردار ہیں۔ جسے تاریخی کتابوں میں وہابی کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تحریک کے بانیوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ سرزمینِ عرب میں شرعِ محمدی کو رائج کر کے دم لیں گے۔ اس تحریک کے علمبردار اپنے آپ کو 'اخوان' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اور مذہبِ اسلام پر یقینِ محکم رکھتے ہیں۔

سلطان ابنِ سعود ایک قابل حکمران ہونے کے علاوہ ایک نگاہِ عمیق کے حامل ہیں۔ وہ عوامی بُرائیوں کا انسداد ہی نہیں کرتے بلکہ ملک کی اچھائیوں کو ہر نوع اُجاگر بھی کرتے ہیں۔ مثلاً بدوؤں کی روائیتی مار دھاڑ تقریباً بند ہو چکی ہے۔ لوگ اگرچہ بالعموم اَن پڑھ ہیں۔ اور مکتب صرف مساجد ہی میں پائے جاتے ہیں۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عرب عوام ناخواندہ ہونے کے باعث جاہل ہیں۔ بلکہ عرب عوام مغربی قسم کی تعلیم نہ ہونے کے باوجود ایک خاص تہذیب و تمدّن سے مالامال ہیں۔ نجد میں جو عرب نسل کا سرچشمہ ہے۔ یہ بات خاص طور پر مشاہدہ میں آتی ہے۔ کہ عوام نہائیت پاکیزہ زبان بولتے ہیں۔ یہ زبان خالص ترین عربی ہے۔ اور قرآنی زبان سے بہت

مشابہ ہے۔

عرب میں موجودہ قسم کی ادویہ نے بھی رواج پایا ہے۔ مگر زیادہ تر مستعمل جڑی بوٹیاں ہی ہیں۔ اسپرین اور کونین کے استعمال سے تو عوام خوب آشنا ہیں۔ مگر اس کے علاوہ وہ امراض کا علاج اپنی سدھ بدھ کے مطابق کرتے ہیں +

"اجتماعی زندگی"

از

عبدالحی علوی

شخصیت کے نشو و نما میں اجتماعی زندگی نمایاں حصہ لیتی ہے۔ دُنیا میں شائد ہی کوئی ایسا انسان ہوگا۔ جو دوسرے کا محتاج نہ ہو۔ ان ضروریات کے علاوہ محض رفاقت کے شوق ہی سے اجتماعی زندگی کا آغاز ہوا۔ اب یہ زندگی اس حد تک پہنچ چکی ہے۔ کہ اجتماعی تعلقات کے بغیر انسان کے اخلاق و اطوار پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ اور نہ ہی شخصیت اس کے بغیر مکمل ہو سکتی ہے۔ شخصیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام متعلقین کے حقوق درست طریقے سے ادا کرتا رہے۔ تنہائی کی زندگی حقیقت میں کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسے شخص کے متعلق جو جنگل میں تنہا رہے۔ اور اس کے وجود سے کسی کو بھی فائدے کی اُمید نہ ہو۔ ہم کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ شخص کیسا ہے۔ تعلیم کا ایک اہم مقصد اطفال کو اجتماعی زندگی کے لئے تیار کرنا اور ملک و قوم کے لئے مفید بنانا ہے۔

اگر تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی کوئی شخص سماج کی مطابقت اختیار کرنے سے قاصر ہے۔ تو اس کا یہ مطلب ہوگا۔ کہ تعلیم نے اس کے دل میں کوئی گھر نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نفسیات اجتماعی تعلیم کو انفرادی تعلیم پر ترجیح دیتی ہے۔

انسانوں کے علاوہ اس اجتماعی جبلت کو حیوانوں میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی

اجتماعی زندگی پر طائرانہ نظر ڈالنے سے ہمیں اپنی اجتماعی زندگی کے سمجھنے میں بہت کچھ مدد ملے گی
حیوانوں کی اس زندگی میں سب سے پہلی چیز جو ہمیں نظر آئے گی۔ وہ ان کی احتیاج ہے۔
کسی خاص احتیاج کے ماتحت حیوان اکٹھا رہنے پر مجبور ہیں۔ ایسی ضروریات جو ایک حیوان کو
دوسرے کا محتاج بناتی ہیں۔ تین قسم کی ہو سکتی ہیں۔

سب سے پہلی ضرورت جو حیوانوں کو اکٹھا رہنے اور اکٹھا چلنے پھرنے پر مجبور کرتی ہے
وہ بچاؤ کی ضرورت ہے۔ اکثر حیوان مثلاً گائے۔ بھیڑ۔ ہرن وغیرہ محض اپنے بچاؤ کی خاطر گلوں
میں پھرتے ہیں۔ کیونکہ اکٹھا رہنے سے وہ اپنی حفاظت بخوبی کر سکتے ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات
درندوں کو بھی مقابلے کی دعوت دے سکتے ہیں۔ خطرے کے موقع پر تمام حیوان اپنے سینگوں
ٹانگوں اور سموں کی مدد سے شیر اور چیتے کے مقابلے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ محض حفاظت
کے خیال سے یہ حیوان اپنے ہم جنسوں کے ہمراہ جنگل میں رہنے سہنے پر مجبور ہیں۔ اس قسم کی
اجتماعی زندگی میں خوف ایک ضروری حصہ لیتا ہے۔ کیونکہ یہ درندوں کا خوف ہی ہے۔ جو
انہیں اکٹھا رہنے پر مجبور کرتا ہے۔ اصل معاشرت پسندی یا اجتماعی زندگی کا عنصر مفقود ہوتا ہے
ان میں معاشرت کا احساس موجود نہیں ہوتا۔ محض قرب وجود کے باعث ان کا مطلب حل ہو جاتا
ہے۔ اس کے علاوہ اکٹھے رہنے کی انہیں چنداں پرواہ بھی نہیں ہوتی۔

دوسرے گروہ میں ایسے تمام درندے شامل ہیں۔ جو اپنی جارحانہ کاروائی کے لئے
غولوں میں پھرتے ہیں۔ بھیڑیوں کے غول کے غول شکار کی خاطر جنگلوں میں پھرتے ہیں۔ اور
اکے دکے انسان پر بھی حملہ کرنے سے نہیں چوکتے۔ گیدڑوں کے متعلق بھی یہی مشہور ہے۔ اکیلا
گیدڑ انسان کے سائے سے بھی ڈرتا ہے۔ لیکن جب یہ گروہ میں ہو۔ تو شیر سے کم نہیں ہوتا۔ اس
قسم کی گروہ بندی میں تلاش خوراک کی جبلت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس گروہ کی ایک
امتیازی خصوصیت یہ ہے۔ کہ حملے (یعنی شکار) کے دوران میں ان کا ایک لیڈر ہوتا ہے۔
جس کی قیادت میں سب درندے اپنی قوت کو استعمال کرتے ہیں۔ مدافعت یعنی بچاؤ کرنے والے

روہ میں یہ خاصیت موجود نہیں ہوتی۔

حیات، اجتماعی کی ان دونوں قسموں میں دوسروں کی موجودگی سے چنداں حظ نہیں ٹھایا جاتا۔ یہ دونوں گروہ چونکہ کسی خاص ضرورت کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اس لئے خوشی یا لطف مفقود ہوتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جب کوئی حیوان اپنے مخصوص گروہ سے کسی وجہ سے علیحدہ ہو جائے۔ تو وہ تنہائی کو ضرور محسوس کرے گا۔ اس کی تمام حرکات سے تنہائی کے احساس دیکھا جا سکتا ہے۔ اکثر اوقات تو اس کے چہرے سے صاف نمایاں ہوتا ہے۔ کہ وہ اُداس ہے۔ روہ میں شامل ہونے کے بعد یہ اُداسی تو جاتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے عوض مسرت کے آثار بھی ظر نہیں آتے۔ اور نہ ہی یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ اس رفاقت سے لطف اُٹھا رہا ہے۔ تحفظِ ات، اور تلاشِ خوراک کے علاوہ ان کے یکجا ہونے کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔

اِس قسم کی اجتماعی زندگی اِنسانوں میں بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ تنہائی انسان کو مجبور ر دیتی ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں میں رہے۔ اس قسم کی زندگی میں یہ ضروری نہیں۔ کہ معاشرت پسندی کا احساس بھی موجود ہو۔ اس احساس کے بغیر ہر شخص اپنے رفقا کی تلاش میں دوڑتا ہے۔ ور کسی ایسی جگہ جانے سے انکار کر دیتا ہے۔ جہاں اس کے ہم وطن اور ہم زبان موجود نہ ہوں۔ س شخص کی حالت کا اندازہ لگائیے۔ جو کسی ایسے مُلک میں ہے۔ جہاں اس کا ایک بھی ہم وطن موجود ہیں۔ اور وہ اپنا دردِ دل کسی کے آگے بھی بیان نہیں کر سکتا۔ تنہائی سے تنگ آ کر وہ بطورِ مجبوری اس جگہ کے آدمیوں سے دوستی پیدا کرے گا۔ لیکن کیا اس دوستی میں حقیقی احساس اور لطف موجود ہوگا؟

تیسری قسم میں حقیقی اجتماعی عناصر موجود ہوتے ہیں یعنی بغیر کسی ضرورت کے ایک جاندار دوسرے کی رفاقت کا محتاج ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک دوسرے کی رفاقت سے حظ اُٹھاتے نظر آتے ہیں۔ جب بھی وہ اکٹھے ہوں گے۔ کھیلنا شروع کر دیں گے۔ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں بھی اس مشترکہ زندگی کے تمام پہلو ہی نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کی اجتماعی زندگی کے بغور مطالعہ سے

معلوم ہوگا۔ کہ سماج کے ہر رُکن کے سپرد ایک خاص کام ہے۔ اور وہ شب و روز اپنے ہی کام میں محو ہے۔ اسے دوسروں کے کام میں کچھ دخل نہیں۔ تقسیم کار کی مدد سے وہ سب اپنی سوسائٹی کی بہبودی میں کوشاں رہتے ہیں۔ ہم انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں پائیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان جانداروں کے یکجا ہونے میں ایسی رُوح پائی جاتی ہے۔ جو بچاؤ کرنے والے اور حملہ کرنے والے گروہوں میں موجود نہیں ہوتی۔ اس تیسری جماعت کی کامیابی کا انحصار لیڈر پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر فرد کی محنت اور ہمت میں سماج کے فوائد مضمر ہیں۔

مندرجہ بالا بیان سے اجتماعی زندگی کے فوائد کا پتہ چلتا ہے۔ ذاتی بچاؤ۔ تلاشِ خوراک اور لذتِ رفاقت کے علاوہ سماج سے اس کے اراکین کو یہ فائدہ بھی پہنچتا ہے۔ کہ وہ بعض خاص اجتماعی کاموں کی ہر ممکن حد تک نشو و نما کرسکیں۔ خلوت پسند شخص عموماً خود غرض ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس معاشرت یا سماج میں رہنے والے ہر فرد کو دوسروں کی بہبودی سوچنے کے لئے خود غرضی کو قربان کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس کام کے بغیر نہ سماج کی رُوح موجود ہوتی ہے۔ اور نہ ہی تقسیم کار کے اصول کے ماتحت ہر رکن اپنے مقررّہ کاموں میں مشغول رہتا ہے۔ مثلاً شہد کے چھتے میں کام کرنے والی مکھیاں ملکہ اور اس کے بچّوں کے کھلانے پلانے اور خود ملکہ صرف انڈے دینے میں محو رہتی ہیں۔ صحیح انسانی اجتماعی زندگی میں یہ تمام چیزیں ہی موجود ہوتی ہیں۔ پہلی دو قسموں کو قدیم قبائل کی زندگی میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن متمدّن اقوام میں معاشرتی پہلو بہت زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ کیونکہ تقسیم کار اور احساس اجتماعی کے بغیر موجودہ سماج وجود میں نہیں آسکتی۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم انسان کے گروہ پسندی کے میلان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

انسانوں کے ہر جمگھٹے کو نفسیاتی گروہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ گروہ کی تشکیل کے لئے چند شرائط کا ہونا لازمی ہے۔ ہر اتوار شام کے وقت انارکلی میں ایک میلہ سا لگا رہتا ہے بعض اوقات اتنا ہجوم ہوتا ہے۔ کہ تانگے تو کجا۔ پیدل شخص بھی اپنا راستہ مشکل سے بناتا

لیکن اس ہجوم کا ہر فرد اپنے اپنے کام میں مشغول رہتا ہے۔ اور دوسروں کی طرف کم توجہ دیتا ہے۔ اسی طرح جو شخص محض سیر کی خاطر انارکلی میں آتا ہے۔ وہ بھی اپنے ذاتی مقصد میں مشغول ہوتا ہے۔ لوگوں کی چہل پہل۔ برقی روشنی۔ دوکانوں کی سجاوٹ وغیرہ یہ سب چیزیں سیر کے دوران میں جاذب توجہ ہوتی ہیں۔ اب یوں فرض کیجئے۔ کہ لوگوں کا یہ جمگھٹا اپنے کام کاج میں مصروف ہے۔ کہ اچانک کسی دوکان پر آگ لگ جاتی ہے۔ اور اس بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگ بجھانے والا انجن وہاں پہنچ جاتا ہے۔ تمام آدمی اپنا کام چھوڑ کر ایک ہجوم کی صورت میں وہاں جمع ہو جائیں گے۔ یا یوں فرض کیجئے کہ اسی بازار سے کسی مشہور لیڈر کی سواری گذرنی ہے۔ جوں ہی اس کی سواری نظر آئے گی۔ لوگوں کی نگاہیں اسی موٹر کی طرف گڑ جائیں گی۔ ان دونوں صورتوں میں اس ہجوم کی توجہ کا مرکز وہ دوکان یا انجن یا اس لیڈر کی شاہانہ سواری ہوگی۔ کچھ عرصہ کے لئے تمام مجمع پر ایک خاص قسم کی جذباتی کیفیت طاری ہوگی۔ اور تمام اشخاص ایک دوسرے کی ذہنی کیفیات سے متاثر ہوتے دکھائی دیں گے۔

گروہ کی تشکیل کے لئے ضروری شرط یہ ہے۔ کہ اس گروہ کے تمام افراد کے کام۔ احساسات اور خیالات مشترک ہوں یعنی یہ بھیڑ ایک مشترکہ مقصد کی خاطر وہاں جمع ہو۔ لیکن اس بیان سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ گروہ کے مشترکہ خیالات۔ احساسات اور کام اس گروہ کو تشکیل دینے والے افراد کی مانند ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی یہ کہ مشترکہ افعال انفرادی فعلوں کا مجموعہ یا اوسط ہوتے ہیں یعنی گروہ کو اس کے افراد کا مجموعہ کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر گروہ کے خیالات اور احساسات وغیرہ کا اس کے افراد کے خیالات سے مقابلہ کیا جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ بالعموم قبل الذکر کے خیالات وغیرہ کا معیار ادنیٰ قسم کا ہوتا ہے بالخصوص مجمع یا انبوہ کی صورت میں تو یہ معیار بہت ہی گر جاتا ہے۔ گروہ کی اس قسم میں تو اکثر اشخاص اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن معاشرت کی اعلیٰ قسموں میں یہ معیار بہت ہی بلند ہوتا ہے۔ بالخصوص اس گروہ میں جس میں ہر فرد کو رائے دینے کا حق حاصل ہو۔ اور اس سے

گروہی زندگی کے احساس کرنے کا موقع دیا جائے۔ اس معیار کے بلند ہونے یا گر جانے کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ جہاں بھی دو یا تین آدمی جمع ہوئے۔ ان کے افکار و افعال میں فوراً فرق پڑ جاتا ہے۔ اور ان میں ایک ایسی نئی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو ان کے انفرادی وجود کو سرے ہی سے بدل دیتی ہے۔ بلاشبہ یہ قوت افراد میں پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے۔ لیکن ان کو متحرک کرنے کے لئے دوسرے آدمیوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بغیر یہ قوت مغلوب اور مستور ہی رہتی ہے۔

قدرتاً یہاں یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ کہ ایسی قوتوں کی حقیقت کیا ہے۔ جو خاص حالات کے ماتحت افراد کو بعض لحاظ سے بالکل ہی تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس قسم کی دو خاص قوتوں کا ذکر تو پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ یعنی اجتماعی۔ خود نمائی اور انکسار کی جبلتیں مؤخرالذکر دونوں جبلتیں صحیح طریقے سے اپنا اظہار سماج ہی میں کر سکتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ اجتماعی جبلت کو ساتھ ملا کر ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھتی ہیں۔ جس طرح جسم کے مختلف اعضاء اپنے مخصوص کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ اسی طرح اس نئی زندگی میں ان دونوں جبلتوں کے ماتحت ہر شخص کے ذمے خاص خاص کام ہیں۔ جن میں خود نمائی کی جبلت زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ وہ لیڈر بن جاتے ہیں۔ اور دوسرے ان کے پیرو۔ ان تین جبلتوں کے علاوہ تین میلان یا رجحان اور بھی ہیں۔ جو اجتماعی زندگی کی تشکیل میں ضروری حصہ لیتے ہیں۔ یہ تین میلان ہمدردی۔ تقلید اور القا ہیں۔ اب ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر کیا جاتا ہے:۔

۱۔ ہمدردی۔ یہاں ہمدردی سے مراد دوسروں کے احساس کے مطابق محسوس کرنا ہے۔ مثال کے طور پر مرغوں کو لیجئے۔ ایک مرغی جب کسی ناگہانی خطرے سے آگاہ ہو کر اپنی گردن بلند کر کے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ تو تمام پر یہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ فرض کیجئے۔ کہ دوپہر کے وقت گاؤں کے آدمی درختوں کے سائے میں بیٹھے حقہ پینے

رگپیں ہانکنے میں محو ہیں۔ اچانک ایک شخص باہر سے آتا ہے۔ اور اس مجمع کے کسی ایک شخص
مخاطب ہوکر اسے کوئی بُری خبر سُناتا ہے۔ اس خبر سے متعلقہ شخص کا رنجیدہ ہونا تو ایک لازمی
ت ہے۔ لیکن دوسرے تمام اشخاص بھی فوراً خاموش ہوکر ہمدردی کے طور پر اظہارِ افسوس
رنے لگ جائیں گے۔ ہمدردی پیدا کرنے کے لئے اصل سبب سے آگاہ ہونا چنداں ضروری
ہیں محض ایک جذبے کا جسمانی اظہار ہی دوسروں میں وہی جذبہ پیدا کرنے کا محرک ہوسکتا
ہے۔ اس لئے اگر ایک دفعہ دہشت پھیل جائے۔ تو کافی عرصہ تک موجود رہتی ہے۔ انہیں
جوہ کی بنا پر پولیس کو کسی خلافِ قانون کے ہجوم کو تتر بتر کرنے میں بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے
ہوم میں صرف چند اشخاص ہی قانون کی نگاہ میں مجرم اور پولیس کی نظروں میں مشکوک ہوتے
ں۔ ہجوم کے باقی تمام افراد ہمدردی کے طور پر اُن کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اور ان کو سبب
ریافت کرنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

گروہ میں ہمدردی کے میلان کو اُبھارنے کے لئے چند شرطوں کا ہونا ضروری ہے۔
ب سے پہلی شرط یہ ہے۔ کہ اس خاص جذبے کا اظہار اس طریقے سے ہو۔ کہ ہر شخص اس
ے آگاہ ہوسکے۔ جیسا کہ کسی جنازے کے موقع پر افسوس کی علامات دوسروں کو اپنا
ریکِ غم بنا لیتی ہیں۔ اگر آدمی ایک جگہ موجود نہ ہوں۔ تو اس وقت جذبات کو برانگیختہ
نے کے لئے اخبار۔ اشتہار اور دوسرے وسائل استعمال کئے جاتے ہیں۔

دوسری ضروری شرط یہ ہے کہ ہم میں ایسا احساس پیدا ہو۔ کہ ہم اس ہمدردی حاصل
نے والے گروہ کو اپنا خیال کرسکیں۔ اگر ہم اس مجمع کو غیر خیال کریں گے۔ تو ہم میں ہمدردی
ے آثار بھی کم ہوں گے۔ یہ کیفیت اس وقت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ جب کہ ہیڈ ماسٹر کے تشدد
مرکز کوئی ایسی جماعت ہو۔ جس سے ہم تعلق نہ رکھتے ہوں۔ ہر شخص اس مجمع کی طرف قدرتاً
رع کرنے پر مجبور ہے۔ جو اس کا ہم خیال ہو۔ اسی حقیقت کی بنا پر مدرسوں اور دوسرے
اروں میں مختلف پارٹیاں بن جاتی ہیں۔

اوّل خویش بعدہ درویش کے مقولے کے مطابق ہمدردی کی ابتدا ہمیشہ اپنے گھر سے ہوتی ہے۔ اس طرح مشق کرتے رہنے سے بڑے بڑے گروہوں میں شریک ہوا جا سکتا ہے تہذیب و تمدّن کے اثر سے ہماری ہمدردی وسیع ہوتی جاتی ہے۔ انسانیت کا تقاضا بھی یہ ہے۔ کہ ہر بنی نوع و بشر کے رنج وغم میں ہم شریک ہو سکیں۔ اگر اس احساس کی خاص طور نشو ونما کی جائے۔ تو آئے دن کے جنگوں کی مصیبت سے نجات مل جاتی ہے۔ آج سے چند صد سال پہلے غلاموں کو انسان ہی نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ اور ان کے دُکھ سُکھ میں شریک ہونا ہتک قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن آج یہ خیال کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا۔ بلکہ آج کل ہر تعلیم یافتہ شخص کی ہمدردی پست اقوام کی بہبودی کے ساتھ مخصوص ہے۔ تعلیم کا ایک خاص مقصد یہ بھی ہونا چاہیئے کہ ہر شخص اپنے تئیں فرقہ پرستی سے بلند ظاہر کرے۔ اور ہر انسان کو خواہ وہ اُس ملک کا باشندہ ہو یا کسی غیر ملک کا۔ اسے اپنا بھائی خیال کرے۔ یہ اخوت اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے۔ جبکہ ہمدردی کے میلان کی خاص طور پر تربیّت کی جائے۔ تعلیم ہمیں سبق سکھلاتی ہے۔ کہ سیّد، پٹھان اور مُغل وغیرہ کی تقسیم کچھ معنے نہیں رکھتی۔ اسی طرح مختلف ممالک کی قومی تحریکیں کہ وہ اپنے تئیں عرب۔ افغان یا ترک خیال کریں۔ انسانوں کو اس عظیم الشّان برادری کے قائم کرنے کے راستوں سے دُور لے جا رہی ہیں۔ جس کی تبلیغ دینِ اسلام کرتا چلا آیا ہے۔ جو لوگ مذہب کی آڑ میں اس فرقہ پرستی کو روا رکھ رہے ہیں۔ وہ فی الحقیقت اپنے تئیں زوال کے گڑھے کی طرف کشاں کشاں لے جا رہے ہیں۔ تمدّن کا اثر تو یہ ہونا چاہیئے تھا۔ کہ بین الاقوامی ہمدردی حاصل کی جائے۔ پاکستان کے تمام مدارس میں اسی قسم کی ہمدردی کا احساس پیدا کرنا نہائیت ضروری ہے۔ تا ہمارے طلبہ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد تمام ممالک کے لئے امن کے پیغام بن سکیں ٭

(مسلسل)

فرانس میں تعلیم و تدریس کی روئیداد

سال ۱۹۴۷-۱۹۴۸ء

مدرسی تنظیم و تعلیم کی از سرِ نو تشکیل و تجدید کے لئے فرنساوی اربابِ تعلیم نے سال ۱۹۴۷-۱۹۴۸ء میں اپنا کام جاری رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ تعلیمی اصلاح کے منصوبے کے سلسلے میں مصروفِ کار رہے۔ جو پانچ جون ۴۷ء کو وزیر معارف کے پیش کر دیا گیا تھا۔ اور جو چند دنوں میں ایک مسودہ قانون کی صورت میں آ جائے گا۔

۱: انتظامی اقدامات

فرنساوی اربابِ تعلیم کے حالاتِ کار کو بہتر بنانے کی خاطر مختلف قسم کے اقدامات کئے گئے ہیں۔ ان میں بعض ایسے ہیں۔ جو "اجتماعی تحفظ" کے اقدامات سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔

ایک تو افسران کے مراتب کی از سرِ نو تدریج اور نئی تدریج میں معلمی کے پیشے کا اور خاص طور پر ابتدائی تعلیم کے اساتذہ کا سرکاری میزانِ مشاہرہ میں بلند درجہ۔

دوسرے قانون اختیار کرنے سے پہلے نمائندہ صنعتی مجلسوں کی تنظیم اور ان میں پیشۂ تعلیم کے منتخب نمائندے تعداد میں حکومت کے مقررہ نمائندوں کے برابر۔

۲: ابتدائی تعلیم

(۱) نئے مسائل:

ابتدائی تعلیم کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ وہ صرف جنگ کی تباہ کاریوں کا ہی نتیجہ نہیں - بلکہ طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد سے بھی پیدا ہوتے ہیں - پیدائش کی رفتار کی زیادتی معصوم گاہوں (Infant Schools) میں پہلے ہی سے محسوس کی جا چکی ہے۔ اور آنے والے سالوں میں زیادہ نمایاں ہوتی چلی جائے گی۔ ۱۹۳۸ء میں پیدائش کی تعداد ۵۵۰،۰۰۰ تھی۔ ۱۹۴۴ء میں ۶۰۱۰۰۰، ۱۹۴۵ء میں ۶۴۱۰۰۰، ۱۹۴۶ء میں ۸۲۶۰۰۰ اور ۱۹۴۷ء میں ۹۰۰۰۰۰۔ اس مشکل مسئلے کے حل کے لئے وزارتی محکمے کے زیر غور ایک عمارتی منصوبہ ہے۔ جس کے لئے قرضوں سے رقم مہیا کی جا سکتی ہے۔

(۲) اساتذہ کی بھرتی اور نارمل اسکولوں کا نصاب:

دوسری مشکل اساتذہ کی ناکافی تعداد ہے۔ اس کمی کی حد تو یہاں تک پہنچی کہ بعض محکموں میں اُستاد کے منصب کے لئے اُمیدواروں کی تعداد خالی اسامیوں کی تعداد سے کم تھی۔ اس صورت حال کو بہتر بنانے کے لئے تیسرے درجے کے بعد ۱۵ سال کی عمر کے جوانوں کو اور دوسرے درجے کے بعد ۱۶ سال کی عمر کے جوانوں کو نارمل اسکولوں میں داخل کر لیا گیا۔ جہاں ان کی اس قسم کی تعلیم جاری رہی جو اس عمر کے طلبہ ہائی اسکولوں اور کالجوں میں میٹریکولیشن تک حاصل کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ معلمی کی تربیت کے دوران میں متعلم اساتذہ کو تربیتی تنخواہیں بھی دی گئیں۔ ساتھ ہی داخلے کے لئے مدارس کے ناظرانِ عمومی کی طرف سے بھی کوششیں ہوئیں اور ان سب اقدامات کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ اس سال نارمل اسکولوں کے لئے اُمیدواروں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے۔ مثالاً اوران (Oran) میں طلبہ کی تعداد پچھلے سال ۸۵ تھی۔ اس سال ۱۷۰ ہو گئی۔ اور طالبات کی تعداد ۸۸ سے ۱۲۷ ہو گئی ہے۔ ہالائین (Haut-Rhin) میں ۲۰ سے ۳۵، دیساورے (Deux-Sèvres) میں ۱۲ سے ۳۶ اور ۳۶ سے ۵۷

علیٰ ہذا القیاس۔ اس لئے اُمید کی جاتی ہے کہ محکمہ خزانہ نے جو ۱۱۰۰ آسامیاں پیدا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ ان کا اہتمام ہو سکے گا۔ اور اُستاد مہیا کئے جا سکیں گے۔

(۳) نارمل اسکولوں میں تعلیمی تربیت کا انتظام:

اس سال اساتذہ کے لئے تجربے کے طور پر تعلیمی تربیت کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ میٹریکولیشن کے بعد تعلیمی تربیت کے دو سالوں میں متعلّم استادوں کو تہذیبِ عمومی کی بنیادی تعلیم اور تعلیمی نفسیات (جس میں بچّوں کی نفسیات بھی شامل ہے)، عام وخاص اصولِ تعلیم، اجتماعیات، مطالعہ ماحول، مشاہداتی وعملی علوم کی تعلیم سے متعلق عملی کام اور نگرانی میں انفرادی عمل کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ انہیں ملحقہ مدارس میں یا خاص طور پر منتخب جماعتوں میں پہلے سال تین تین ہفتوں کے تین دَوروں میں اور دوسرے سال چار چار ہفتوں کے تین دَوروں میں پڑھانے کا عملی تجربہ حاصل ہوتا ہے۔

(۴) مشق کرنے والے اور مہارتِ خصوصی رکھنے والے مدرّسین کی تربیت:

تحدید تعلیم کے زیر اثر مؤثر طریقوں کے استعمال کی اور مدرسی اسباق اور بچّے کے ماحول میں گہرا ربط پیدا کرنے کی باقاعدہ تبلیغ واشاعت ہو رہی ہے۔ فضائی مدرسوں میں تعلیم دینے یا پس ماندہ بچّوں کی مخصوص جماعتوں میں پڑھانے یا جسمانی تربیت کے معلّم بننے کی سند حاصل کرنے کے لئے مدرّسین کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد نے متعلقہ اسباق میں شمولیت اختیار کی ہے۔

(۵) ابتدائی مدارس میں نصاب کی تجدید

آئندہ صرف ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے بچّوں کو ابتدائی تعلیم کی سند ۱۴ سال کی عمر میں ملا کرے گی۔ لیکن شہری اور دیہاتی لڑکوں اور لڑکیوں کے مدرسوں کی ضروریات اور امکانات کے پیشِ نظر آخری درجوں کے نصاب میں مناسب ردّ و بدل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ ہر ایک کے لئے عملی سائنس کے متعلق مختلف نصاب، جن میں انسان اور اس کے ماحول اور مختلف انسانی مشاغل کے باہمی ربط پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ مقرر کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن

طلبہ کے لیے جو سولہ سال کی عمر تک تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں۔ فرصتی اسباق کا نصاب بھی ہائی سکول اور کالجوں کے تازہ شعبوں کے نصاب کے بالکل مطابق بنا دیا گیا ہے۔ ان کی جماعتیں بھی اب چھٹا، پانچواں چوتھا اور تیسرا درجہ کہلاتی ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان جماعتوں کے طلبہ ثانوی مدارس میں کسی وقت جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اصلاحی قانون کی تجویز کے مطابق گیارہ سے دس سال تک کا تعلیمی اتحاد تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔

۳ : ثانوی تعلیم

(۱) مدرسی منشور کی ترمیم :

مدارس میں باہمی ربط پیدا کرنے کی خاطر مدرسی منشور کے کمیشن نے جہاں کہیں ممکن دیکھا ہے۔ مدارس کی علیحدگی اور ان میں بے ضرورت مقابلے کو قدیم، جدید اور صنعتی عملوں کے اشتراک عمل اور اتحاد سے بدل دیا ہے۔ اور اس کے لئے تخفیف و آمیزش کا طریق استعمال کیا گیا ہے تمام نئے شعبوں کے قیام اور توسیع کے منصوبے انہی اصولوں کے مطابق عمل میں آنے چاہئیں۔

(۲) ثانوی مدارس میں داخلے کے متعلق اقدامات :

چھٹے درجے میں داخلے کے لئے مقابلی امتحان کا ہر ایک اسکول علیحدہ انتظام کیا کرتا تھا۔ اور اس طرح اکثر ان کے معیار مختلف ہوتے تھے۔ لیکن ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کے منشور سے ان تمام علیحدہ علیحدہ امتحانوں کی جگہ تمام طلبہ کے لئے ایک ہی قسم و معیار کا داخلے کا مقابلی امتحان مقرر کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں اس بات کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا کہ وہ طلبہ ہائی اسکولوں میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ یا کلاسیکی یا جدید کالجوں میں یا فرصتی نصاب کی جماعتوں میں شمولیت چاہتے ہیں۔ مُدرّسوں کو اس امتحان کے لئے بہترین طلبہ بھیجنے واجب ہیں مضامین کا انتخاب بجائے اس کے کہ طلبہ کے علم کی وسعت معلوم کرنے کی غرض سے ہو۔ امیدواروں کے ذہنی رجحانات اور صلاحیتیں معلوم کرنے کے نظریئے سے ہوا کرے گا۔ اس نقطۂ نگاہ سے اسکولوں

میں طلبہ کی کارکردگی کی بڑی اہمیت ہے۔

اس کے بعد داخلے کے لئے منتخب طلبہ کی تقسیم معیار، ہر ایک اسکول کے امکانات اور خاندانوں کی خواہشات کے مطابق ہوتی ہے۔

(۳) ثانوی تعلیم کے پہلے حصے کی سند:

اب تک صرف وہ طلبہ جنہوں نے تھوڑی سی اسکول کی تعلیم حاصل کی ہوتی (جسے دوسرے ممالک میں "مڈل" کہا جاتا ہے) پندرہ سال کی عمر میں مڈل اسکول سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتے تھے ان کے علاوہ دوسروں کو نصاب اور عمر کی شرائط ایسا نہیں کرنے دیتی تھیں۔ اتحاد قائم کرنے کی خاطر جو اصلاحی منصوبے کی اساس ہے۔ ایک منشور کے ذریعے اس سال پہلی دفعہ ثانوی تعلیم کے ابتدائی حصے کے لئے سرٹیفکیٹ مقرر ہوئی ہے۔ جو فرصتی جماعتوں کے طلبا اور ہائی اسکولوں اور کلاسیکی جدید، یا صنعتی کالجوں کے طلبہ بھی تیسرے درجے کے اختتام پر (۱۵ سال کی اوسط عمر میں) حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سرٹیفکیٹ کے امتحان میں انتخابی مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے اس میں ضروری تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ یہ ثانوی تعلیم کے پہلے چار سالوں پر مشتمل ہے (گیارہ سے ۱۵ سال کی عمر تک) اور یہ عموماً ان طلبہ کے لئے ہے جو تیسرے درجے کے بعد اپنی تعلیم چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ ان طلبہ کے لئے جو آگے تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ غیر ممکن الحصول نہیں۔ تاہم اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں داخلے کے لئے یہ ضروری بھی نہیں۔ امتحانوں کے انتخاب اور نمبر دینے کے قواعد کی نگرانی کے لئے ایک مخصوص کمیشن مقرر ہے۔ تاکہ تعجیل اور سختی کے خطرہ سے بچاؤ ہو سکے۔ یہ تدبیر اور اس کے ساتھ اس پہلے حصے کے نصابوں کا باہمی ربط اور پھر چھٹے درجے میں داخلے کا مقابلی امتحان جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہ سب اصلاحی منصوبے کے مطلوبہ اتحاد کی طرف اہم اقدام کا ثبوت ہیں۔

(۴) اعلیٰ ثانوی تعلیم میں شہریت کی تدریس:

ثانوی تعلیم میں صرف زیریں درجے کی جماعتیں ہی شہریت اور اخلاق کی تسلی بخش

تعلیم سے مستفید ہو رہی تھیں۔ ایک منشور میں اب اگلے اکتوبر سے ثانوی تعلیم کی اعلیٰ جماعتوں (یعنی ۱۵ سے ۱۸ سال کی عمر کے طلبہ) کے لئے بھی شہریت کی تعلیم جاری کرانے کا اہتمام ہے اور یہ تجویز ہے کہ نوجوان فرنساوی طلبہ کو کچھ اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی مسائل سے بھی واقف کرایا جائے۔ اور یہ کام کانفرنسوں، جلسوں، مناظروں، جمعیتوں، تحقیقاتوں، امداد باہمی کی مجلسوں، بنکوں اور سنڈیکیٹوں کے معائنے کی مدد سے، جہاں تک ممکن ہو سکے، ٹھوس اور مؤثر پیرائے میں کیا جائے مثلاً اب وہ گذشتہ پچاس سالوں میں فرانس کی ترقیوں اور بین الاقوامی زندگی کے متعلق جمعیت اقوام سے لے کر مجلس اتحاد اقوام تک کے تازہ ترین اداروں، ہیبس کارپس اور امریکی اعلانِ آزادی سے شہری اور انسانی حقوق کے فرنساوی اعلان تک آزادی کی مختلف منزلوں یا موجودہ معاشرے کی اقتصادی اور اجتماعی مشینریوں کا مطالعہ کریں گے۔ فرنساوی حصولِ تعلیم میں یہ خامیاں تھیں۔ جن کا دُور کرنا ضروری تھا۔

(۵) سکونتی مدارس کی اصلاح:

ان مدارس میں جہاں رہائشی طلبہ بھی ہیں۔ مدرسی نظام یکسر بدل رہا ہے۔ اسی لئے ان اسکولوں کے ہیڈ ماسٹروں کے لئے عملی اسباق کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اور سولہ سبقوں کے ایک سلسلے میں ہر مدرسہ کے اربابِ تعلیم کی مجلس کے زیر اہتمام رہائشی اسکولوں کے ذمہ دار اساتذہ کو یہ بتایا جائے گا۔ کہ وہ اپنا کام کس طرح سر انجام دیں۔

(۶) اساتذہ کی تربیت:

اس سال مقابلی امتحان کے اُمیدواروں کے لئے ایک مخصوص و متعدد عملی اسباق (agregation.) کا اہتمام کیا گیا۔ پیرس سے آنے والوں کو تدریس کے موجودہ مسائل اور ان تعلیمی تجربات سے متعارف کیا گیا جو جدید جماعتوں (Classes Nouvelles) میں کئے گئے تھے۔ صوبوں میں مثلاً مسٹراس برگ، طولوس وغیرہ میں طلبہ کو اسی طرح کے مخصوص معلوماتی لیکچر دئے گئے۔

بالآخر ثانوی مدارس میں تعلیم دینے کی قابلیتی سند قائم کرنے کے لئے ایک منصوبہ قومی
لیم کے اعلےٰ کونسل کے سامنے پیش کیا گیا اور اس کی عام حدود منظور کر لی گئیں۔ یہ سند اُن
ام اساتذہ کو حاصل کرنی پڑے گی۔ جنہوں نے agregation کا امتحان پاس نہیں
یا۔ اس کا ایک عملی حصہ ہے جو تربیت کے دوسرے سال سے پہلے نہیں بلکہ تدریسی سند اور
ستاد کے بحیثیت تربیت یاب داخل ہو جانے کے بعد اختیار کیا جا سکتا ہے علمی حصہ اس
ت تک اُمیدوار شروع نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ علمی امتحانوں میں تسلی بخش کامیابی حاصل
رلے۔ گویا اس پیشہ کی تربیت چاہنے والے اُمیدوار سے ایسی حقیقی تعلیمی تربیت کی اُمید کی
اتی ہے۔ جو ان تعلیمی مشیروں کے عملے کی جو نئے اساتذہ کی رہنمائی کے ذمہ دار ہیں ۔ اور
لاقہ جاتی تعلیمی مجالس کی تنظیم کی مصدقہ ہو۔

(۷) پڑھانے والے اُستادوں کی تربیت :

تعلیمی زندگی میں جوش پیدا کرنے کے لئے اور تربیت سے پہلے پڑھانے والے
ستادوں کی تربیت کو مکمل کرنے کے لئے ایک طرف مکمل تربیتی اسباق جاری کئے گئے ہیں
ن میں نئے طریقِ تعلیم بتائے جاتے ہیں۔ اور علمی مجالس بھی قائم کی گئی ہیں۔ جن میں مخصوص
سائل پر مناظرے اور خیالات کے تبادلے ہوتے ہیں۔ مثلاً اُم۔ جولیٹ کیوری کے زیر نگرانی
بی و علمی ذوق کی بنیادی جانچ کے لئے علم و ادب کے متعلق تربیتی اسباق، نامور مورخوں
ی اعانت سے تاریخ کی تعلیم و تدریس کے متعلق مجلسیں، طبیعیات کی تدریس کے متعلق
طالعی حلقے جن میں لوئی ڈی براگلی (Louis de Broglie) جیسے نامور
سائنسدان حصّہ لیتے رہے ہیں، جدید زبانوں کے استادوں کی کانفرنسیں، موسیقی اور
انا سکھانے میں دلچسپی لینے والے مطالعی حلقے، اور سینما کے تعلیمی مفاد کے متعلق مجلسیں۔
ن مجلسوں میں اُستادوں کا اپنی مرضی سے شریک ہونا، پڑھانے والے عملہ پر ان کا
بردست اثر اور رائے عامہ اس بات کی شاہد ہے۔ کہ ملک میں تعلیمی سرگرمیاں از سرِ نو

زندہ ہو رہی ہیں۔

(۸) جدید جماعتیں (The Classes Nouvelles)

اس سال چوتھے درجے پر جدید جماعتوں کا تجربہ کیا گیا۔ اکتوبر میں یہ سلسلہ تیسرے درجے تک بڑھا دیا جائے گا۔ اور اس طرح ثانوی تعلیم کے زیریں طبقے کی تقریباً ۷۵۰ جماعتیں اس میں آجائیں گی۔ اُن تربیتی اسباق کی بدولت جو ان جماعتوں کے ذمہ دار استادوں کے لئے جاری کئے گئے نیز علاقہ جاتی مجلسوں اور اِن جدید جماعتوں کے مخصوص تعلیمی مشیروں کی حوصلہ افزائیوں کی برکت سے ان جماعتوں کی سرگرمیاں موزونیت اور کارگزاری میں ترقی کرنے سے رُکی نہیں۔ گزشتہ سفید اتوار (Whitsun) کے موقعہ پر ساورز (Sèvres) کے مقام پر تعلیمی مطالعوں کے بین الاقوامی مرکز میں چوتھے درجے کی نئی جماعتوں کی ہدایت کے ذمہ دار استادوں کے لئے تربیتی اسباق منعقد ہوئے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ احیائے تعلیم کی اس تحریک نے، جین زے (Jean Zay) کی ان ہدایتی جماعتوں کے تجربے سے جو ۱۹۳۷ء میں جاری کی گئی تھیں۔ فائدہ اُٹھانے کے بعد اپنی تخلیقی ترقی خاص طور پر ربط تدریس، مطالعہ ماحول جمالیات اور مصوری یا موسیقی کی تربیت کی کارگزاری کے متعلق جاری رکھی۔ نئے اختیاری نصاب علی الخصوص اقتصادی اور اجتماعی آداب و اصول سے متعارف کرانے کے نصاب بہت کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ اور یہ میٹریکولیشن کے درجے تک جاری رکھے جائیں گے۔ تیسرے درجے کی نئی جماعتوں کا اوقات نامہ اور نصاب مقرر ہو چکا ہے۔ اور یہ تقریباً وہی ہوگا۔ جو چوتھے درجے کے لئے ہے۔ کیونکہ یہ دونو درجے ایک ہی کل کا جُز ہوں گے۔ ساتھ ہی جو حضرات اس کام کے ذمہ دار ہیں۔ ان کی کارگزاری کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ اُمید ہے کہ آخر کار اکتوبر میں زراعتی اصول کے متعلق اختیاری مضامین بھی شامل کر دئے جائیں گے۔ اس قسم کے اقدامات اور تجربات نے ساری ثانوی تعلیم میں تعلیمی نشو ونما اور ترقیوں کے لئے مفید فضا پیدا کر دی ہے۔

۴: صنعتی تعلیم

صنعتی تعلیم جو اپنی اہمیت کی بنا پر حکومت کے تحتی معتمد کی نگرانی میں ہے یکمل انسانی
بیت دینے کی کوشش میں تعلیم کے دوسرے شعبوں سے اپنا گہرا ربط قائم رکھتے ہوئے
قی بھی کر رہی ہے۔ اور منظم و مجتمع بھی ہوئی جا رہی ہے۔

(۱) عام نظم و نسق :

ایک مسودہ بل میں جو حال ہی میں پیش کیا گیا ہے اس میں اس قسم کی کار آموزی، سند یافتہ
رکنوں کی ترقیوں اور کار آموزی کے بڑھتے ہوئے نصابوں کے متعلق ایک مرکزی تنظیم مہیا
نے کا اہتمام ہے۔ جو اس وقت ملک کی اہم ضرورتوں میں سے ہے۔ سرِ دست مرکزی ہدایتی
لوں کی نئی تنظیم کی بنا پر ابتدائی تعلیم ختم کر لینے والے چودہ سے سترہ سال کی عمر کے بچوں
ے لئے صنعتی کار آموزی کے مراکز کا انتظام دوسرے صنعتی مدارس سے علیحدہ نہیں کیا گیا۔
مدارس کی جغرافیائی تقسیم کے متعلق ارادہ ہے کہ تبادلوں، نئی تقسیموں یا تخلیقوں سے
بارتی شعبوں میں مخلوط تعلیم کو عام کرنے سے اور دستکاری کے شعبوں میں لڑکیوں کو داخل
نے سے داخلی تجدید کی جائے۔ اور صنعتی، کلاسیکی یا جدید کالجوں کو جہاں کہیں ممکن ہو۔
ہم یکجا کر کے خارجی ترمیم کی جائے۔

(۲) نصاب :

میٹریکولیشن کے معیار کی صنعتی ڈگریوں کے لئے اور قومی صنعتی و حرفتی اداروں میں
اخلے کے مقابلی امتحان کے لئے نصاب تقریباً ایک سے ہیں۔ موخرالذکر نصاب ان
لوں کی اصلاح کے نظریئے سے اور سائنسی تربیت میں ترقی و زیادتی کی خاطر استعمال
ئے جا رہے ہیں۔ تجارتی مضامین بھی زیرِ غور ہیں۔ ان کے میدان بھی وسیع کئے جا رہے
یں۔ تاکہ ان میں اقتصادی اور اجتماعی علوم بھی آجائیں۔ (تجارتی تعلیم میں ایک اعلےٰ
سند کے اجرا کا خیال ہے)

(۳) اُستادوں کی تربیت :

تعلیمی طریقے اور علے الخصوص مؤثر عملی طریقے ہر جگہ رائج و مسلّم ہیں۔ اور ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تجارتی تعلیم و تدریس اور عملی صنعت و فن کاری کے متعلق تعلیمی مجلسیں منعقد ہوتی ہیں۔ اور کار آموزی کے مراکز کے عملے کی خاطر کار آموزی کے قومی نارمل اسکولوں میں ساڑھے چار ماہ کے تربیتی اسباق جاری کئے گئے ہیں۔ اعلےٰ صنعتی نارمل اسکول میں عنقریب تعلیم کا تیسرا سال بھی جاری ہو جائے گا۔ جو عملی کام اور اصول تعلیم کے لئے وقف ہوگا۔ یہ اسکول آئندہ ان استادوں کی تربیت کا ذمہ دار ہوگا۔ جو کارخانوں سے ڈرائینگ پڑھانے اور کام کی نگرانی کی خاطر تین ماہ کے تربیتی عرصے کے لئے بھرتی کئے جائیں گے۔ انجام کار تربیتی عرصوں کی ترقی و توسیع اساتذہ کو اس قابل بنا دے گی کہ وہ صنعتی اور تجارتی تنظیم سے تعلق قائم رکھیں۔ اور پیداوار و تقسیم کے طریقوں سے باخبر رہیں۔

(۴) پیشے سے تعلق :

اس سے مدعا یہ ہے کہ مختلف قسم کی کونسلوں اور کمشنوں کے قیام سے جن میں مختلف حرفتوں اور پیشوں کے نمائندے ہوں اور تجارت و صنعت کے طلبہ کے لئے عملی تربیتی نصاب ور کے اجرا سے اس پیشے کا تعلق استوار کر دیا جائے۔

(۵) ثانوی مدارس سے تعلق :

کالجوں کے باہمی اتحاد کے علاوہ جن کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ثانوی مدارس سے قریبی تعلق رکھنے کی ضرورت نے اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ قومی مدارس اور صنعتی کالجوں کی جماعتوں کے نام بھی وہی ہوں۔ جو قدیم و جدید قسم کے کالجوں میں مستعمل ہیں۔

ایک اور جگہ صنعتی تعلیم کے ناظم نے جدید جماعتوں میں تعلیمی دستکاری کے اہتمام کی پوری حمایت کی ہے۔ یہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان تمام کوششوں کا اصلاحی مسودہ کے مطابق مدعا یہ ہے۔ کہ کسی طرح فرانساوی مدرسی نظام میں اس تدریس کو جو کسی حد تک

مدرسوں سے باہر نشو و نما لے چکی ہے بکل منظم کیا جائے۔

۵ : اعلیٰ تعلیم

اصلاحی ضوابط کی تعمیل کی کوشش دو اہم چیزوں سے تعلق رکھتی ہے :

(۱) بی ایس سی کی ڈگری کی ترمیم (Licence es Sciences.) :

گیارہ اگست ۱۹۴۷ء کے فرمان کے مطابق بی ایس سی کی ڈگری کے امیدواروں کو ایک تو اعلیٰ تعلیم کا ایسا سرٹیفکیٹ حاصل کرنا پڑتا ہے جس سے ایک تو یہ ثابت ہو کہ اعلیٰ تعلیم کے طریقوں سے واقفیت ہے۔ اور دوسرے اس بنیادی علم کی تصدیق ہو۔ جو اعلیٰ تعلیم کی دوسری سندوں کے نصاب کی تعلیم کے لئے ضروری ہے۔ امیدوار عمومی حساب، ریاضی، طبیعیات و کیمیا، یا طبیعی، کیمیاوی یا طبعی علوم میں سے مضامین کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس وقت اس اصلاحی قانون کے مسودہ کے مطابق جو ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے درمیان وسطانی تعلیمی تربیت قرار دیتا ہے۔ ادبی قابلیت کی ابتدائی سند کے قیام کا سوال زیر غور ہے۔

(۲) انجنیئرنگ کی تربیت کی نئی تنظیم :

چند منشوروں کے ذریعے بعض وسطانی درسگاہوں کو جو عملی سائنس کے میدان میں تحقیق و صنعت کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بغیر کسی امداد کے نشو و نما لے چکی تھیں۔ انجنیئرنگ کے اعلیٰ قومی مدارس میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ان مدارس کے طلبہ داخلے کا مقابلی امتحان دیتے اور تین سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد بی ایس سی (Licence) کے معیار کی عام تعلیم اور مخصوص عملی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ سرِدست مذکورہ بالا تمہیدی تعلیم کے بعد بی ایس سی (Licence) کی ڈگری کے معیار کے برابر عملی مدارس کی نئی حدود کی تعیین کر دی گئی ہے۔

ان علوم کی موجودہ نشو و نما کے مطابق اور اقدامات بھی ہوئے ہیں۔ مثلاً معیار بلند کرنے کی خاطر انجینئرنگ کی دکتوریہ (Doctor of Engineering) کی سند کیلئے جدید قواعد اور اسکے علاوہ اعلےٰ تعلیم کے ایک ڈپلوما اور اقتصادی علوم کی دکتوریہ کا ایک ڈپلوما جو شعبہ قانون دیتا ہے۔ قائم کیا گیا ہے۔

۶ : نگران محکمے اور مختلف عملے

ہم نیچے ان عملوں کی فہرست درج کرتے ہیں۔ جو ہر قسم کی تعلیم کے ذمہ دار ہیں:

(۱) جوانوں اور کھیلوں کا نگران محکمہ:

یہ جسمانی تعلیم کا ذمہ دار ہے۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس کے اساتذہ کی بھرتی لگاتار بڑھتی رہتی ہے۔ (اس سال ثانوی مدارس کے اساتذہ کی اسامیوں کے لئے ۹۰۰ اُمیدوار تھے۔ اور ابتدائی مدارس کے اساتذہ کی اسامیوں کے لئے ۱۶۷۰ اُمیدوار تھے) اور اس نگران محکمے نے ۱۹۰۰ مدرسی کھیلوں کی مجلسوں کا اہتمام کیا۔ جن میں کوئی ۱۰۰۰۰۰ ممبر تھے۔ گذشتہ سال کے ۸۴ مرکزوں کے علاوہ جسمانی تعلیم کی تحدید کے لئے گیارہ نئے مرکز کھول دئے گئے ہیں۔ ابتدائی سکولوں میں پڑھانے کے لئے ایک مدرسی کھیلوں کی سند مقرر کی گئی ہے۔ جو ابتدائی تعلیم کی پرانی سند کے متعلقہ جسمانی امتحانات کی قائم مقام ہو گی۔ ۱۹۴۸ء میں جسمانی تعلیم کے امتحانوں میں میٹریکولیشن کے ۸۰۰۰۰ اُمیدوار بیٹھیں گے۔ اگرچہ یہ امتحان اختیاری ہیں۔

(۲) مدرسی حفظِ صحت:

حفظِ صحت اور مدرسی طبی نگرانی کے محکمے، جو دو سال سے قائم ہیں۔ مدرسی طبی نگرانی کو اور طبی تعلیم کے مراکز کو جو اس نگرانی کا کام سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ترقی اور نشو و نما دیتے رہے ہیں۔ انہوں نے تپ دق کے متعلق اساتذہ کا باقاعدہ امتحان، مدرسوں میں داخل

ہونے سے پیشتر طلبہ کا طبی معائنہ، مدرسوں کی عمارتوں کے لئے صفائی کے دستور العمل کا استعمال رائج کر دیا ہے۔

(۳) تعلیمی خدمات سرانجام دینے کے طریقوں کے متعلق تربیتی مراکز کا کام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ابتدا میں تو یہ اس لئے قائم کئے گئے تھے۔ کہ بچوں کی درسگاہوں اور رخصتی کیمپوں کے ڈائرکٹروں اور مانیٹروں کے فرائض سرانجام دینے کے لئے معلّموں کو تیار کرے۔ لیکن انہوں نے اپنے عمل کو توسیع و نشو و نما دینا روکا نہیں۔ چنانچہ اب وہ خاص تربیتی اسباق مثلاً مرغوب عام فن، موسیقی، غنا، رقص، تمثیل، کٹھ پتلیوں کے کھیل، جسمانی تعلیم، مطالعہ ماحول وغیرہ کے میدان میں عملی کام کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ رخصتی کیمپوں کے مینجروں اور ثانوی اسکولوں کے معیار کے مطابق رہائشی اسکولوں کے استادوں کی تربیت اور مزید و بعد از مدرسہ کام کے لئے نارمل اسکولوں کے طلبہ کی تیاری میں بھی حصّہ لیتے ہیں۔ اور سارے ملک میں اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایک سال میں انہوں نے ۲۶۳ تربیتی اسباق قائم کئے۔ جن میں تربیت لینے والوں، استادوں اور تعلیمی پیشے کے دوسرے رُکنوں اور عام تعلیم کے علمبرداروں وغیرہ کی تعداد ۱۰۴۷۶ تھی۔ تعلیمی طریقوں اور نصابوں میں آزادی، محنت اور مسرت سے بھرپور اجتماعی زندگی کے طور طریق، تعلیمی خدمت سرانجام دینے کا براہ راست تجربہ، اصولی تعلیم (بچّوں کی نفسیات) اور عملی کار آموزی مثلاً مانیٹر کے فرائض، دستکاری، مجلسیں وغیرہ شامل ہیں۔

(۴) تعلیمی عجائب خانہ اور تعلیمی دستاویزوں کا قومی مرکز بھی تعلیم کے تمام کاموں میں امداد دیتا ہے۔ اس کی تعلیمی لائبریری، اس کی نرسادی اور غیر ملکی دستاویزوں مثلاً تعلیم کے متعلق تصانیف اور درسی ذخیرہ۔ نیز اس کی فلم لائبریری وغیرہ سے تمام معلّم بلا روک ٹوک فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ مرکز نئی تعلیم، مطالعہ ماحول اور تعلیمِ النشا وغیرہ کے متعلق کتابوں کی فہرستیں شائع کرتا رہتا ہے۔ اس کا حال ہی میں جو سینما کمیشن مقرر ہوا ہے۔ وہ تعلیمی

فلموں کی تیاری کا معائنہ کرتا ہے اور کبھی کبھی خود بھی تیار کراتا ہے۔ اور اعلےٰ پیمانے
تصویروں اور فلموں کی منظوری دیتا ہے۔ یہ فرانسادی تعلیمی مجلسوں کا نگران و مربی ہے
اور بچوں کی نقشہ کشی اور مصوری وغیرہ کی سفری نمائشوں کا اہتمام کرتا ہے۔ اکتوبر میں
تعلیمی دستاویزوں کے چھ علاقہ جاتی مراکز کھولنے کے اہتمامات ہو رہے ہیں۔

(۵) قومی اور بین الاقوامی پیمانے پر ساورے (Sèvers) میں تعلیمی مطالعوں سے
بین الاقوامی مرکز نے ۱۹۴۷-۴۸ء میں اپنی تاریخی عمارت کے اندر فرانساوی معلّموں اور
خاص طور پر جدید جماعتوں کے استادوں کے لئے دس قومی تربیتی اسباق کا اہتمام کیا
اس نے تین سو سے زائد تمام قومیتوں کے غیر ملکی مہمانوں، استادوں، انسپکٹروں اور تحقیقی
کام کرنے والوں کو نوازا۔ اور انہیں مختلف پیریڈوں میں تعلیم و تربیت دی۔ اس نے
بین الاقوامی مجالس کے اہتمامات کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ مثلاً لندن کے تعلیمی ادا
کا پندرھواں اجلاس اور بین الاقوامی مفاہمت کی غرض سے یونیسکو کا پہلا اجلاس
اسی کے اہتمام سے ہوا۔

خلاصہ

ہم مدرسی نفسیات کی ترقیوں، نفسیات اور تعلیم کی سند فضیلت (icence
طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد اور ان کی زندگی کے مشکل حالات کے متعلق اقدامات،
وظیفوں میں اضافوں، اجتماعی اداروں، جامعی تغذیہ گاہوں اور نیا جامعی شہر
کرنے کی سکیم کا ذکر نہیں کریں گے۔ پچھلے سالوں کی طرح اس سال کے متعلق بھی کہا جا
ہے۔ کہ اس میں اِن وقتوں کی مشکلات اور قحطِ ذرائع کے باوجود علم کے لئے انتہ
شوق اور تعلیم کے سلسلے میں گہری سرگرمی جاری رہی ہے۔
کچھ تو موجودہ مجلس قانون ساز کے اقدامات کی برکت ہے اور کچھ مستقبل کے مت

منصوبوں کا جوش کہ ایسے مسلسل اصلاحی قوانین رائج ہوئے۔ جن میں انفرادی اور اجتماعی مفاد کو ملحوظ رکھا گیا۔ اور ملک فرانس اور اس کے جوانوں کے لئے مستقبل میں عدل وانصاف اور امن کے قیام اور مکمل تجدید کے مواقع میسر آئے *

ایک اہم اقدام کی ضرورت

سلیم فارانی

حصولِ آزادی کے بعد جہاں ہر چیز میں آزادانہ تنقید و تحقیق کے اقدامات ہو رہے ہیں۔ وہاں اشد ضروری ہے کہ ہم ایک اساسی چیز کے متعلق بھی اسی قسم کا اقدام کریں۔ یہ اساسی چیز فنِ تعلیم ہے۔ جس پر ہمارے قوم و ملک کے حال و مستقبل کی بہتری کی بنیاد ہے۔

اب تک جو کچھ اس سلسلے میں ہوتا رہا ہے۔ غلامی کی قید و بند میں ہوتا رہا ہے۔ ہر چیز میں مغرب کی کورانہ تقلید ہمارا شعار رہا ہے۔ اور خود ناشناسی و بے حسی ہمارا لائحۂ عمل۔

ہمارا فنِ تعلیم اپنے احساسِ ہستی سے مطلقاً عاری تھا۔ پڑھانے کے طریق وہی بھائے اور رائج رہے۔ جو مغرب نے یا قومِ غالب نے ہم پر عائد کئے یا ہمیں ورغلا ورغلا کر بتائے اور سکھائے۔ طالب علم اور اُستاد کے موقف و مقام میں بھی ہم یورپ کے ساتھ ساتھ رنگ بدلتے رہے۔ کبھی استاد کو اہم قرار دیتے رہے۔ کبھی طالب علم کو محورِ تعلیم

قرار دیا۔کبھی طلبہ کی بے حس و حرکت اطاعت کو بہتر سمجھتے رہے۔کبھی طلبہ کے انفرادی اور ذاتی عمل کو ترجیح دی۔کبھی مضمون زیادہ توجہ کے قابل رہا۔کبھی طالب علم۔کبھی طالب علم کو مضمون کے مطیع قرار دیا۔کبھی مضمون کو طلبہ کے تقاضا کے تابع کر دیا۔کبھی اجتماعی تعلیم کو سراہا۔ کبھی انفرادی تعلیم کی اہمیت و ضرورت محسوس کرتے ہوئے والہانہ اقدامات کئے۔ کبھی درسی نصاب کی ضرورت اہم خیال کی۔کبھی اسے کوئی اہمیت نہ دی۔کبھی امتحانات کو اچھا سمجھا۔اور کبھی ان سے متنفر ہوئے۔اور انہیں صحیح قابلیت کا اندازہ کرنے میں قاصر تصور کیا۔کبھی دشواریوں اور مشکلوں کو تعلیم کا ضروری جز خیال کیا۔کبھی طالب علم کی راہ سے یہ تمام روڑے ہٹا دینا بہتر سمجھا۔کبھی درسگاہ کو وعظ و نصیحت کا مقام بنایا۔کبھی اسے سراسر لہو و لعب کا میدان بنا دیا۔کبھی اسے علمی تقاریر کا گہوارہ بنایا۔کبھی اسے عملی تجربہ گاہ کی صورت دی۔غرض تقلید یورپ میں مختلف راہیں اختیار کرتے رہے۔اور اپنے متذبذب رہنماؤں کے ساتھ ساتھ رنگ بدلتے رہے۔ اس میں ہمارے اپنے فکر و غور کا کوئی دخل نہیں رہا۔جو کچھ آقا کا منشا تھا۔ہم نے پورا کیا۔مخلصانہ طور پر غلامی کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

اب خدا کے فضل و کرم سے وہ طلسم ٹوٹ چکا ہے۔غلامی کا طوق گردن سے اُتار کر پھینک دیا گیا ہے۔اب یہ لازم آتا ہے۔کہ ہم تقلید یورپ کا قلاوہ بھی اُتار پھینکیں اور ذہنی غلامی سے بھی نجات حاصل کریں۔

اب ہمیں فن تعلیم کے متعلق اس قسم کا شعور پیدا کرنا چاہیئے۔کہ خود فنِ تعلیم میں روح نظر آئے۔ہمارا فن تعلیم "ہمارا" فن تعلیم ہو۔"پیرایا" نہ ہو۔"نقالی" ہمارا اصول نہ ہو۔ بلکہ ہم خود اس کے بانی ہوں، موجد ہوں، مخترع ہوں۔ہم دوسروں کی لکیر کا فقیر بننا چھوڑیں۔اور حالات و ضروریات کے مطابق اپنا صحیح لائحۂ عمل خود سوچیں، تیار کریں اور اس کے مطابق عمل پیرا ہوں۔اس سلسلے میں ہماری ایجادات و اختراعات

خود فراموشی اور غیر ستائی پر مبنی نہ ہوں، بلکہ ہم اپنے مسائل اپنے ماحول میں خود سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کریں۔ اور انہی کوششوں میں ہمارے نتائج ہمارے لئے ہماری اپنی ایجادات و اختراعات کا باعث ہوں۔ اس سے یہ غرض ہرگز نہیں کہ ہم دوسروں کے اقدامات کا مطالعہ ہی نہ کریں، یا اُن سے قطعاً ناآشنا ہو جائیں۔ بلکہ ہم دوسروں کی تدابیر کا ضرور مطالعہ کریں۔ تاکہ مقابلے سے ہم اپنے حالات کو سمجھیں اور ان کے لئے مناسب تدابیر کر سکیں۔ ہمارا ہر تعلیمی مسئلہ کانفرنسوں اور مجلسوں، انفرادی اور اجتماعی کوششوں اور تجربوں، بحثوں اور مناظروں، تحقیقوں اور تفتیشوں سے طے ہو۔ ملک بھر میں ان چیزوں کا جال بچھ جائے۔ ان سے مراد گفتاری ہیہے، خورد و نوش، خیالی گلچھرے، اور بے مقصد و بے نتیجہ نشست و برخاست نہ ہو۔ بلکہ اخلاص و محنت کے ساتھ صحیح مقصد کے حصول کی مساعی ہوں۔ ہر درسگاہ تجربہ گاہ ہو۔ اور ہر مدرس مجرب، اور ہر کانفرنس و مجلس مجربوں کے تجربوں کی کسوٹی اور نشر و اشاعت کا ذریعہ ہو۔ غرض احیائے فن تعلیم کا ملک بھر میں چرچا ہو۔ اور ایسا معلوم ہو۔ کہ تعلیمی دنیا خوابِ گراں سے جاگ اُٹھی ہے۔

اب تک ہم نے بغیر اس کے کہ ہماری فضائیں ان کے لئے سازگار ہیں یا نہیں۔ یورپ کے مجوزہ طریقِ تعلیم کو سراہا۔ اور اختیار کئے رکھا۔ یورپ نے کہا۔ غیر زبانوں کی تدریس کے لئے طریق راست یا بلا واسطہ صحیح طریق ہے۔ ہم نے آمنا و صدّقنا کہہ دیا۔ اور لگی اجنبی زبان کی تعلیم اجنبی زبان میں ہونے بدوں اس خیال کے کہ وقت بھی ضائع ہو رہا ہے اور ماحصل بھی کچھ نہیں۔ یورپ نے کہہ دیا، پڑھانے میں سازوسامان کی نمائش زیادہ چاہیئے۔ ہم لگ گئے نمائش کرنے۔ یورپ نے کہہ دیا۔ کھیل کھیل سے پڑھانا بہتر ہے۔ ہم نے جھٹ لہو و لعب شروع کر دی، آواز آئی۔ کہ طریقِ تفویض بہتر ہے: ہم اندھا دھند تفویضات کی طرف مائل ہو گئے۔ دَورِ غلامی میں تو یہ تقلید راس بھی آتی تھی۔ لیکن عہدِ آزادی میں ایسا کرنا آزادی کو شرمانا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ نگاہِ تنقید ڈال کر دیکھیں۔ کہ ہماری فضائیں ہمارے حالات کے مطابق ہماری

ضروریات کے لئے ہمارے بچّوں کی طبائع اور میلانات، کے پیشِ نظر ہمارے مخصوص ماحول میں مانٹیسوری سسٹم، ڈالٹن پلان، پلے وے میتھڈ، ڈائریکٹ میتھڈ، ہیورسٹک میتھڈ، جرنی میتھڈ، فونک میتھڈ، فونیٹک میتھڈ، پراجیکٹ میتھڈ وغیرہ میں سے کوئی میتھڈ متعلقہ مضمون کے لئے موزون ہے بھی؟ ہے تو کہاں تک؟ اور نہیں تو پھر کیا میتھڈ ہمیں خود ایجاد کرنا چاہیئے۔ جو یہاں موزوں ہو؟ ہمیں اب ان طرق تعلیم کی مدح سرائی اور قصائد خوانی سے احتراز کرنا چاہیئے۔ بلکہ ان پر نگاہِ عدل و انصاف ڈال کر خذ ماصفا ودع ماکدر کے اصول کے مطابق ان کی اچھائی سے استفادہ اور بُرائی سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

طالب علم و استاد کے موقف و مقام کے سلسلے میں بھی تقلید مغرب میں، ہم نے کئی پلٹے کھائے جب تک وہاں کے محققوں کی نظر میں اُستاد کی "آمرانہ" حیثیت رہی۔ یہاں بھی اُستاد ہی سب کچھ سمجھا جانے لگا۔ لیکن جب وہاں کی نفسیاتی تحقیقات کے زیر اثر رنگ بدلے گئے۔ تو ہم بھی بدل گئے۔ محورِ تعلیم اُستاد سے ہٹ کر شاگرد کی طرف بڑھا۔ تو ہم بھی شاگرد کو اہمیت دینے لگے۔ ہمارا یہ تغیّر و تبدل اعمال میں کم سہی۔ لیکن افکار میں ضرور تھا۔ اُستاد کی علمیت کے فوارے بند ہو گئے۔ اور شاگرد نے اُستاد کی نکیل پکڑ لی۔ شاگرد کے میلانات و جذبات کی یہاں تک قدر ہونے لگی۔ کہ اس کی شرارتیں بھی متبرک معلوم ہونے لگیں۔ اُستاد کے لئے ڈانٹ دینا تک ممنوع قرار دے دیا گیا۔ معاشرتی ضرورت کے مطابق انفرادی تشکیل ہونے کی بجائے انفرادی رغبتوں کے مطابق معاشرتی تشکیل کا لائحۂ عمل پسند کیا جانے لگا۔ خدمتِ اُستاد کے عوض خدمتِ تلمیذ اہم قرار دی گئی اور ؂

وہ دن گئے کہ خدمتِ اُستاد کے عوض
جی چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

اُستاد کی ذاتی قابلیت کے آزادانہ طرزِ عمل کی بجائے قواعد وضوابط کی پابندی لگائی گئی۔ تو ہم ان کے اندھا دھند پابند ہو گئے۔ تدریس کو نیچرل رکھنے کی بجائے میکانکی سا بنا دیا گیا۔ اور ہم اسی کے دلدادہ ہو گئے۔ اُستاد کی دُور اندیشی اور خیر اندیشی کے مطابق مجوزہ نصاب تعلیم کی قدر و منزلت کم ہو گئی۔ اور شاگرد کے طبعی میلانات؛ اور طرزِ عمل کے سانچے میں نصاب ڈھلنے لگے۔ رفتہ رفتہ درسی کتاب کی اہمیت بھی جاتی رہی۔ پہلے اُستاد اور شاگرد درسی کتاب کے زیرنگیں تھے۔ مطیع تھے۔ لیکن جب مغرب نے اُستاد اور درسی کتاب کو شاگرد کے تابع کر دیا۔ تو ہم بھی اِس نفسیاتی اقدام کو اُن کی دیکھا دیکھی سراہنے لگے۔ دَورِ غلامی کے اُستاد اور شاگرد اب آزادی کی راہ پر گامزن ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا ہے۔ کہ کس قسم کے اقدام میں ہمارا بھلا ہے۔ متلون مزاج نفسیات کی تقلید مغرب کا لائحۂ عمل ہے۔ کیا ہمیں بھی اندھا دھند اس کی تقلید کرنی چاہیئے؟ کیا ہم بھی مغرب کی طرح جنسی خواہشات و جذبات کی سرِ محفل بحث کرنے میں اپنے معاشرے کی بہتری دیکھتے ہیں؟ کیا ہم بچے کو آزاد چھوڑ کر اس کی خواہشات کے مطابق اسے کھیل کود میں مصروف رکھ کر اپنی قوم و معاشرت کے لئے بہترین فرد بنا سکتے ہیں؟ کیا ہمارے ہاں شاگرد کے حق میں یا قوم کے حق میں اُستاد کا شاگرد کے میلانات کا مطیع ہونا مفید ہے؟ کیا ہمارے ہاں ڈانٹ ڈپٹ کے بغیر صحیح تعلیمی اقدامات ہو سکتے ہیں؟ ہمارے ہاں انفرادی رغبتوں پر معاشرتی تشکیل کا انحصار ہونا چاہیئے یا معاشرتی ضروریات کے مطابق انفرادی تشکیل ہونی چاہیئے؟ خدمتِ اُستاد اہم ہے یا خدمتِ تلمیذ؟ درسی کتاب کا ہماری تعلیمات میں کیا موقف ہونا چاہیئے؟ اس کی نوعیت کی بنا کس پر ہو؟ یہ مسائل ہیں۔ جن کی طرف ہماری جلد اور مخلصانہ توجہ کی ضرورت ہے۔

نصاب کی تعیین تعلیم میں بہت اہم چیز ہے۔ یورپ نے اس سلسلے میں ہزاروں رنگ بدلے اور نئے نئے نظریئے قائم کئے۔ نوشت و خواند اور حساب کی بنیادی چیزوں پر وہ پرتکلف و تصنع عمارتیں قائم کیں۔ کہ فنِ تعلیم میں ایک غیر متناہی مضامین کا سلسلہ

شروع ہوگیا۔ وقتی اور مقامی ضروریات کے مطابق ہر دور میں اُس نے اپنے لئے تو بہتر سے
بہتر لائحۂ عمل تجویز کیا۔ لیکن ہماری کیا حالت رہی؟ غلامی میں نقالی اور آقائے فرمان کی
اطاعت۔ مغرب نے مدرسی مضامین کے اختلاف کی بنا پر مختلف قسم کے مدارس ملک میں جاری
کئے۔ اور ہر مدرسے کی نوعیت کے مطابق اس کا نصاب قائم کیا۔ لیکن ہمارے ہاں مدارس کی
کثرت، تو ناممکن تھی۔ ہم نے ہر مدرسے میں ہر قسم کی چیزیں نصاب میں شامل کر دیں۔ اور
نتیجہ کیا رہا "ہر فن مولا ہر گن ادھورا"۔ مضامین کی تعداد بڑھ گئی، خوبی کم ہو گئی، ضروری
اور غیر ضروری کی اس قدر آمیزش ہوئی۔ کہ وقت ضائع ہوتا رہا۔ اچھے مضامین کا حصول
ثانوی رہا۔ بے سود مضامین کی تحصیل میں وقت کافی صرف ہوتا رہا۔ آزادی میں ہمیں
اچھی طرح جانچ کر فیصلہ کرنا ہے۔ کہ ہمارے نصاب میں کس قدر مضامین کی ضرورت ہے۔ اور
کن مضامین کی؟ غیر ضروری کو نصاب سے نکال دینے کی جرأت چاہیئے۔ اور ضروری پر
زیادہ توجہ دینے کے لئے کوشش۔ یہ بھی سوچنا ہے کہ کیا نصاب میں مضامین زیادہ ہونے ضروری
ہیں۔ اور بچے کا سارا دن اسی نصاب کی کشمکش میں مصروف رکھنا واجب۔ ہمارا نصاب
مضامین سے اٹا پڑا ہے۔ بچوں کے دماغوں اور ذہنوں پر اکثر حالات میں سراسر ظلم ہے۔ ان
کے وقت کا غیر ضروری استعمال کرا کر انہیں تھکا دینا ہے۔ ہمیں اپنی قومی، ملکی اور اخلاقی ضرورتوں
کو سمجھنا چاہیئے۔ اور اُن کے پورا کرنے کے لئے جس قسم کے مضامین بہت ضروری ہوں۔ انہیں
نصاب میں شامل کرنا چاہیئے۔ اور باقیوں کو نکال دینا چاہیئے۔ مضامین کی تدریسی اہمیت
اور نصاب میں موقف بھی تغیّر و تبدل کا محتاج ہے۔ کیا ضروری ہے۔ کہ ہم انہیں مضامین کو
اہمیت دیں۔ جنہیں یورپ اہمیت دیتا ہے۔ ہمیں اپنے ماحول اور معاشری معیار کے مطابق
انہیں ترتیب دینا ہے۔ یورپ رقص و سرود چاہے۔ تو کیا ضروری ہے کہ ہم بھی رقص و سرود
کو نصاب میں اہمیت دیں۔ یورپ صنفِ نازک کو مردانہ جوہروں کی تعلیم دے۔ تو کیا
ہم بھی اسی قسم کا نصاب ان کے لئے تجویز کریں یا بقول اقبال یہ اعتقاد رکھیں کہ ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

نصاب کی تعیین فن تعلیم کا اہم جز ہے۔ یورپ نے اس کے خاص اصول قائم کئے ہیں۔ جو ہر زمانے کی ہوا کے مطابق بدلتے رہے ہیں۔ کبھی نصاب کی تعیین بچّے کے نقطۂ نگاہ سے ہوئی۔ اور کبھی اُستاد یا معاشرے کے نقطۂ نگاہ سے۔ کبھی ربط ماحول کو اہمیت دی گئی۔ کبھی بچّے کے ذہنی و جسمانی قویٰ کی نشو و نما کو۔ کبھی اس کی اُفقی تدریج سراہی گئی۔ کبھی عمودی تقسیم صحیح سمجھی گئی۔ ہمیں اب تعیین نصاب کے لئے اپنے اصول قائم کرنے ہیں۔ اور صاف طور پر دیکھنا ہے۔ کہ ہمارے لئے بچّے کے نقطۂ نگاہ سے اسے مرتب کیا جائے یا اُستاد و معاشرے کے نقطۂ نگاہ سے۔ ربط ماحول کا اصول کہاں تک صحیح اور موزوں ہے؟ اس کی تدریج و تقسیم کس طرح ہو؟

اجتماعی یا طبقی تدریس اور انفرادی تدریس کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ ہمیں جب اجتماعی صورت کی اہمیت جتائی گئی۔ ہم اسی کے پابند رہے۔ بعد میں جب انفرادی توجہ کے حق میں ڈالٹن پلان وغیرہ کا چرچا ہوُا۔ تو ہم بھی تقلید کو دوڑے یا مجبور ہوئے۔ اب اس مسئلہ کے متعلق آزادانہ فیصلہ ہو جانا چاہیئے۔ کہ انفرادی اور اجتماعی طرز تعلیم میں سے ہر ایک ہمیں کہاں تک مفید ہو سکتا ہے۔ اور ان کا امکان کیا ہے؟

امتحانات کا پہلو بھی ہماری توجہ کا طالب ہے۔ جب تک ایک قسم کے طرز امتحان کا وقار مغرب میں قائم رہا۔ ہم بھی اسی طرز کے دلدادہ رہے۔ بعد میں وہاں جو تنقید ہونے لگی۔ تو ہمیں بھی نقص نظر آنے لگا۔ ہمیں تعلیمی ترقی اور دماغی نشو و نما کا صحیح جائزہ لینا چاہیئے۔ مغرب میں تھارنڈائیک سکیل اور بینٹ سکیل رائج ہوئے۔ تو ہمارا بھی جذبۂ تقلید تڑپ اُٹھا۔ انہی ہتھیاروں سے ہم نے بھی اپنے طلبہ کی ذہنی جانچ شروع کر دی۔ ہمیں اس پہلو کی بھی تحقیق کرنا ہے۔ اور صحیح قسم کے امتحانات آزادانہ فضا کے

طابق سوچ سمجھ کر رائج کرنا ہیں۔

غرض اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ فن تعلیم پر ہماری محققانہ نگاہ پڑے۔ اور
م غلامی کی مجبوریوں سے آزاد ہو کر اپنے لئے اپنا فن تعلیم خود قائم کریں۔ جو نقالی
تہمت سے آزاد اور غیر پسندی سے بالاتر ہو۔ جو ہمارا اپنا ہو۔ اور ہماری ملکی
قومی ضروریات کے مطابق ہو۔ ماہرین فن سے اس اہم اقدام کی بڑی
قع ہے *

(گذشتہ سے پیوستہ)

81. Proceedings

اس کے لئے جو ترجمے موصول ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل ہیں:
چارہ جوئی، طریق عمل، طریق کار، روئداد، اجرائے کار، کارروائی،
ان میں سے چارہ جوئی، طریق عمل، طریق کار اور اجرائے کار مطلوب مفہوم سے
دور ہیں۔ عدالتی فضا میں "چارہ جوئی" کسی حد تک مناسب ترجمہ ہو گا۔ لیکن
سب میں سے "کارروائی" زیادہ اچھا ہے۔ اور سہل و مستعمل بھی ہے۔

82. Incumbent

ناگزیر، لازمی، فرض، واجب، عہدہ دار وغیرہ ۔ لغوی لحاظ سے ناگزیر
فرض اور واجب صحیح ترجمے ہیں۔ لیکن ملازمتی اصطلاح میں جو یہاں اصل مقصود
یہ ترجمے مفہوم کے قریب نہیں۔ یہاں "عہدہ دار" قریب تر ہے۔ اور اس سے ز
"صاحبِ منصب" ہے۔

83. Relief

کمک، خیرات، اعانت، فوجی امداد، بدلی، دستگیری، باری، تفریح،

امداد وغیرہ - درحقیقت، یہ لفظ محلِ استعمال کے لحاظ سے مختلف معانی دیتا ہے مثلاً
فوجی نقطۂ نظر سے "کمک، اعانت، بدلی، باری، وغیرہ مناسب ترجمے ہوں گے"۔ عام لحاظ سے
جہاں آرام مقصود ہو۔ وہاں تفریح، تنوع، اور جہاں غریبوں کی اعانت مطلوب ہو۔ امداد اور
خیرات موزوں ترجمے ہیں۔ لیکن ملازمتی اصطلاح میں یہ لفظ اس ملازم کے لئے استعمال ہوتا ہے۔
جو کسی جانے والے ملازم کی جگہ آکر اس سے سارا کام سنبھالے - یہ ایک قسم کا نجات دہندہ ہے -
اور جانے والے کے لئے باعثِ آزادی و آرام۔ اگر اصطلاح کے ساتھ لفظی مفہوم بھی رکھنا مقصود
ہو تو "مُخلِّص" چاہیئے۔ لیکن یہ لفظ چند محدود معانی رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا عام استعمال شاید
دقّت پیدا کرے۔ اِس کے مقابلے میں سہل لفظ موجود ہے۔ اِس اصطلاحی مفہوم کو ادا کرنے کے
لئے "بدل" زیادہ اچھا ہے۔

84. Disciplinary action

قانونی اقدام، تعزیری کارروائی، تہدیدی کارروائی، تادیبی کارروائی، انضباطی کارروائی،
تنبیہی کارروائی، میں سے قانونی اقدام اگرچہ آسان ہے۔ لیکن Discipline کے مفہوم سے دُور
ہے۔ یہ عدالتی مقدمات کے سلسلے میں استعمال ہو سکتا ہے۔ تعزیر اور تہدید ڈانٹ ڈپٹ
کے معنی میں آتے ہیں۔ تنبیہہ warning کے لئے موزوں ہے۔ "تادیبی کارروائی اور انضباطی
کارروائی دونو Disciplinary action' کا مفہوم صحیح طور پر ادا کرتے ہیں۔ لیکن ان دو میں سے
"تادیبی کارروائی" زیادہ اچھا ہے اور مستعمل بھی ہے۔ اور یہی قابلِ ترجیح ہے۔

85. Enquiry Committee

اِس کے متعلق بہت سے ترجمے موصول ہوئے ہیں:

مجلس تحقیقات، مجلس دریافت حال، مجلس استفسار، جستجو کمیٹی، مجلس تجسس، پوچھ گچھ
کمیٹی، محفلِ تفتیش، چھان بین کمیٹی، محفل احتساب، محفل استعلام، تحقیقاتی کمیٹی، تحقیقاتی مجلس،
انجمن تحقیق، بزم جستجو، وغیرہ۔ مجلس، محفل، کمیٹی، انجمن اور بزم میں سے Committee

کے لئے مجلس اور کمیٹی بہتر ہیں۔ اوران دونوں میں سے کوئی ایک لفظ استعمال کیا
سکتا ہے۔ کمیٹی کا لفظ باوجود انگریزی ہونے کے اُردو میں عام استعمال میں آنے کے باعث
اُردو ہو چکا ہے۔ اور تاریخ کے لحاظ سے اس کے تلفظ میں بھی تصرف ہو چکا ہے۔ انگریز
تلفظ کی بجائے اُردو میں یہ کمیٹی یا کمیٹی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے اب یہ لفظ اپنا ہے
Enquiry کے مختلف ترجموں میں سے استفسار، تجسس، احتساب اور استعلا
تو بہت ثقیل اور غیر موزوں ہیں۔ پوچھ گچھ اور چھان بین نہ جلالی ہیں نہ جمالی۔ تحقیقا
کا لفظ عام استعمال ہونے کے باعث ثقیل نہیں رہا۔ مفہوم کے بھی بہت قریب ہے۔ اس
اصطلاح کے تمام مندرجہ بالا ترجموں میں سے تحقیقاتی مجلس یا تحقیقاتی کمیٹی زیادہ موزو
معلوم ہوتا ہے۔

86. Contingent

امدادی، فوری، معاونتی، وقتی، ناگہانی، اتفاقی، امدادی فوج

فوجی اصطلاح میں یہ امدادی اور معاونتی کے معنوں میں آتا ہے۔ وہاں امداد
فوج زیادہ اچھا ہے۔ دفتری اصطلاح کے لحاظ سے باقی تمام ترجمے مناسب ہیں۔ لیک
ان سب میں سے "فوری" مفہوم کے زیادہ قریب اور استعمال کے لحاظ سے زیادہ آ
ہے۔ اس لئے اسے اختیار کیا جائے۔ تو بہتر ہوگا۔ چنانچہ Contingent Expenses
لئے "فوری اخراجات" نہایت موزوں ترجمہ ہوگا۔

87. Emergency

ہنگامی ضرورت، فوری ضرورت، ناگہانی ضرورت، وقتی ضرورت، اتفاقی ضر
مشروط احتیاج، فوری تقاضا۔

ضرورت، احتیاج اور تقاضا میں سے ضرورت ہی زیادہ موزوں اور سہل
"مشروط احتیاج" تو یہاں بے ربط ہے۔ ناگہانی، ہنگامی، وقتی اور اتفاقی کے مقابلے

فوری زیادہ سہل اور مفہوم کے قریب ہے۔ چنانچہ "فوری ضرورت" قابل ترجیح ہے۔

88. Efficiency

اس اصطلاح کے بہت سے ترجمے موصول ہوئے ہیں:

قابلیت، کارکردگی، مستعدی، اہلیت، استعداد، معیاری کارگزاری، لیاقت، تاثیر بخشی، اثر آفرینی، خوبی، عمدگی، موزونیت، صلاحیت، مناسبت، صحت کار، کفایت، اقتدار، پختگی، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو ان سب میں سے کوئی بھی Efficiency کے صحیح مفہوم تک واضح طور پر نہیں پہنچتا۔ Efficiency کا اصل مفہوم کسی چیز کے صحیح معیار تکمیل تک پہنچنے اور اس معیار کو قائم رکھنے کی حالت کا اظہار ہے۔ اور اس کے لئے ہم "کمالیت" کو ترجیح دیں گے۔

89. Net Income

اصلی آمدنی، آمد بعد منہائی اخراجات وغیرہ، خالص آمدنی، نقد آمد، حقیقی آمدنی،

ان میں سے "آمد بعد منہائی اخراجات" Net Income کا صحیح ترجمہ ہے لیکن کچھ طویل سا ہے۔ اصلی آمدنی، خالص آمدنی، اور حقیقی آمدنی اصل مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ Net Income وہ ہے۔ جو اخراجات وغیرہ نکال کر باقی بچتی ہے۔ اس کے لئے "نقد آمد" بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ اس سے اخراجات کی منہائی کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ہمارے خیال میں "حاصل آمدنی" زیادہ اچھا اور موزوں رہے گا۔

90. Counter—signed

نشان تصدیق، خط تصدیق، مقابلی دستخط، تصدیقی دستخط،

نشان اور خط کے مقابلے میں دستخط اچھا ہے۔ مقابلی اگرچہ Counter کا لفظی ترجمہ ہے۔ لیکن چونکہ اس قسم کے دستخط کا اصل مقصود ایک قسم کی تصدیق ہے۔ اس لئے مقابلی دستخط کی جگہ "تصدیقی دستخط" قابل ترجیح ہے۔ اس سے مقصود بھی واضح ہے۔ اور لفظی مفہوم بھی

پُورا ہوجاتا ہے۔

91. Graduate

گریجوایٹ، طیلسانی، سندیافتہ، فاضل،

یہ چاروں ترجمے Graduate کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔لیکن دِقّت یہ ہے۔ کہ سندیافتہ اور فاضل کے الفاظ بی اے سے مخصوص نہیں۔ فاضل تو بہت وسیع ہے۔ "طیلسانی" اچھا ہے۔ اور قابلِ ترجیح اور اکثر جامعات میں مستعمل بھی ہے۔ اس لئے مفید ہوگا۔کہ یہ لفظ گریجوایٹ کے لئے رائج ہوجائے۔

92. Terms of reference.

حل طلب امور، تحقیقاتی امور، فیصلہ طلب امور، امورِ تنقیح، دریافت طلب مسائل، امورحوالی،

امورحوالی غیرموزوں ہے۔ اس ترجمہ کے مجوزنے شاید Reference کا ترجمہ حوالہ کرکے of reference کیلئے حوالی کو مناسب سمجھا ہے۔لیکن "امورحوالی" اپنے صحیح معانی کی بناپر Terms of reference کے مفہوم سے بہت دُور ہوجاتا ہے۔ باقی تمام ترجمے مفہوم کے قریب تریب ہیں۔لیکن "اُمورِ تنقیح" ان سب میں زیادہ مناسب اور مفہوم کے زیادہ قریب ہے۔ اور اسی کا رواج قابلِ ترجیح ہے۔

93. Vice-Chancller

قائم مقام امیرجامعہ، نائب امیرجامعہ،

"قائم مقام" Vice کا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ نائب اس کے لئے زیادہ موزوں ہے Chanceller کے لئے ہم پہلے بحث کرچکے ہیں۔ اور اس کے لئے مختلف ترجموں کے مقابلے میں "میرجامعہ" کو ہم ترجیح دے چکے ہیں۔ اس لئے Vice-Chanceller کے لئے "نائب میرجامعہ" ہی موزوں اور رائج ہونے کے قابل ہے۔

94. Declaration.

قانونی طریقے پر اعلان، محضر نامہ، محصولی مال کی تفصیل، عرضی دعویٰ، اقرار نامہ، قطعی اعلان، حتمی بیان۔

اس اصطلاح کے محل استعمال کے لحاظ سے مختلف ترجمے ہوں گے۔ چنانچہ عدالتی اصطلاح میں عرضی دعویٰ اور اقرار نامہ بہتر ہوگا۔ جب Declaration اس درخواست کے لئے مستعمل ہو۔ جو ابتدا میں پیش کر کے مقدمہ چلایا جاتا ہے۔ یا جس میں مدّعی حالات مقدمہ لکھ کر ابتدائی عدالت میں پیش کرتا ہے۔ تو پھر اس کا ترجمہ "عرضی دعویٰ" درست ہوگا۔ یا اگر اس سے مقصود کوئی معاہدے کا کاغذ یا اقرار کی دستاویز ہو۔ تو پھر "اقرارنامہ" اچھا ہوگا۔ شہادتوں اور مہروں سے تصدیق کیا ہوا کاغذ یا عرضداشت مراد ہو۔ تو پھر "محضرنامہ" موزوں ہوگا۔ اگر کوئی سرکاری اظہار و تنبیہ یا خبر مقصود ہو۔ تو پھر "اعلان" ہی مناسب ہوگا۔

95. Time-table

تنظیم اوقات، نظام نامہ اوقات، نقشہ انضباط اوقات، نقشہ اوقات، شجرہ اوقات، شجرہ تقسیم اوقات۔

Time-Table کے معنی کے لحاظ سے سارے تراجم مفہوم کے قریب قریب ہیں لیکن ان میں قدرے ثقالت اور طوالت کی وجہ سے مقابلتہً یہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کہ "وقت نامہ" یا "اوقات نامہ" اختیار کیا جائے۔ اگرچہ وقت نامہ کوئی بُرا نہیں۔ تاہم اس کے مقابلے میں "اوقات نامہ" زیادہ ترجیح کے قابل ہے۔ کیونکہ اس سے تقسیم اوقات کا مفہوم زیادہ وضاحت کے ساتھ ادا ہوتا ہے۔

96. Period.

وقت، وقفہ، زمانہ، دَور، مدت، عرصہ، گھنٹی۔

اوقات نامے کے مختلف اوقات کے لئے عام طور پر گھنٹی یا گھنٹے کا لفظ مستعمل ہے۔ اور جہاں تک اصطلاح کے رواج کا تعلق ہے۔ اس مروّجہ اصطلاح کو بدلنا مناسب نہ ہوگا۔ ورنہ " اوقات نامے" کی مناسبت سے تو یہی بہتر معلوم ہوتا ہے کہ Period کے لئے " وقت" استعمال ہو۔ وقفہ، زمانہ، دَور، مدت اور عرصہ Period کے غلط ترجمے نہیں۔ بلکہ Period کی مدت و نوعیت کے لحاظ سے اس کی مختلف صورتوں کو بیان کرتے ہیں۔ وقفہ کم مدت کے لئے اور مدت، عرصہ، دَور، زمانہ بتدریج زیادہ کے لئے۔

97. Curator

محافظ عجائب خانہ، مہتمم، رکن مجلس انتظامی جامعہ،

تینوں ترجمے محل استعمال کے لحاظ سے صحیح ہیں۔ عام طور پر Curator کا ترجمہ مہتمم کیا جائے۔ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ عجائب خانہ سے متعلق ہو۔ تو " محافظ" برا نہیں اور یونیورسٹی کی مجلسِ انتظامیہ سے علاقہ ہو۔ تو پھر " رکن انتظامیہ جامعہ" مناسب ہوگا۔

98. Bureau.

بیورلو، دفتر، سرکاری محکمہ،

اِن تینوں میں سے " محکمہ" زیادہ اچھا ہے۔ عام مستعمل بھی ہے۔ اور مفہوم کے قریب بھی۔ بعض حضرات " بیورلو" پر مصر ہیں۔ لیکن " محکمہ" کے استعمال سے ان کے انکار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

99. Constitution

سرشت، فطرت، فرمان، ضابطہ، دستورِ اساسی، آئین۔

طبیعت سے متعلق ہو۔ تو سرشت اچھا ہے۔ سرکاری قوانین کے سلسلے میں ہو۔

تو فرمان وضابطہ دونوں اچھے ہیں۔ حکومتی آئینی نظم ونسق کے لئے "دستور" اور "آئین" دونوں اچھے ہیں۔ اور ان دو میں سے "آئین" ذرا زیادہ جچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

100. Chairman.

چیئرمین ، صدر ، صدرجلسہ ، میرمجلس ،

ان سب میں سے "میرمجلس" زیادہ اچھا اور لطیف ہے۔

اصطلاحات زیرغور

101. Intermediate Examination. 102. Aggregate.

103. Diploma 104. Remuneration. 105. Testimonial.

106. Privilege Leave. 107. Syndicate.

108. Secretariat. 109. Plenipotentiary.

110. Status quo. 111. Calendar.

112. Matriculation Examination.

113. Middle School Examination.

114. S. L. C Examination.

115. Degree Examination 116. Schedule

117. Affiliation. 118. Extension. 119. Inspection.

120. Rector. 121. Convocation. 122. Substantive.

123. Initiative. 124. Mass - Drill. 125 Stamped.

126. Mandate. 127. Substantive. 128. Conference.

129. Balance - Sheet. 130. D. O.

سرکاری جریدہ کے اعلانات

سررشتہ تعلیم مغربی پنجاب

صیغہ رجال ——— شعبہ کالج

تاریخ وشمارہ احکام	نام	منصب	کس تاریخ سے	کیفیت
ر جنوری سنہ ۴۹ء ۹۴۲-	م- فضل حسین ایم ایس سی	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور-	۱۰ر اکتوبر سنہ ۴۸ء سے	اپنے منصب اور درجہ مشاہر میں مستقل قرار دئے گئے ہیں۔
"	م- س- د- فاروق ایم اے	لیکچرار ایمرسن کالج- ملتان	"	"
"	محمد طاہر حمید ایم اے	"	"	"
"	محمد شریف ایم ایس سی	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور	۲۷ر نومبر سنہ ۴۸ء سے	"

تاریخ وشمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
ر جنوری سنہ ۴۹ء ۱۳۹۴	م- محمد یار- ایم اے (جغرافیہ) II	لیکچرار جغرافیہ گورنمنٹ کالج منٹگمری (قائم مقام)	لیکچرار جغرافیہ گورنمنٹ کالج جھنگ قائم مقام بمشاہرہ سابقہ۔	تاریخ حاضری سے	احمد رضا بخاری کی جگہ جو فوجی خد سرانجام دے رہے ہیں اور جن کی عود اب ڈی مونٹ مورنسی کا سرگودھا کی طرف منتقل کیا جا رہا
ر جنوری سنہ ۴۹ء ۱۴۴۴-	م- قمرالدین صدیقی ایم اے	لیکچرار ایمرسن کالج ملتان		۱۵ر فروری سنہ ۴۹ء قبل از دوپہر سے	ملازمت سے استعفےٰ منظو کر لیا گیا ہے۔
ر جنوری سنہ ۴۹ء ۱۵۸۴	م- انیس الدین انصاری، بی ایس سی ڈپلوما ان ایجوکیشن لیڈز	لیکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور (۱۵۰-۱۰-۳۵۰ شعبہ کالج)		۱۴ر نومبر سنہ ۴۸ء سے	اپنے منصب اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں۔
ر جنوری سنہ ۴۹ء ۱۶۶۰-	عبدالقدیر علوی ایم اے بی ٹی	لیکچرار ڈی مونٹ مورنسی کالج سرگودھا	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م- محمد معین الدین صدیقی کی جگہ جو مستعفی ہو گئے ہیں۔

شمارہ م	نام	منصب	کس تاریخ سے	کیفیت
سنہ ۴۹ ۲۶	م - محمد صفت اللہ ایم ایس سی	لیکچرار ایمرسن کالج ملتان - (۱۵۰-۱۰-۳۵۰ شعبہ کالج)	۱۷ر جنوری سنہ ۱۹۴۹ء سے	اپنے منصب اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں۔
سنہ ۴۸ ۳۲۲	م - محمد انور - ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور (۱۵۰ - ۳۵۰)	۱۰ر اکتوبر سنہ ۴۸ء سے	"
	م - آفتاب احمد خان - ایم اے	"	"	"
	م - حمید الدین ایم اے	"	۲۷ر اکتوبر سنہ ۴۸ء سے	"
سنہ ۴۹ ۳۳	م - اشتیاق علی خان ایم اے	لیکچرار ایمرسن کالج ملتان (۱۵۰ - ۳۵۰)	۷ر جنوری سنہ ۴۹ء سے	مستقل قرار د۔ گئے ہیں۔
	م جمیل الدین احمد - ایم اے	"	۲۷ر جنوری سنہ ۴۹ء سے	"
سنہ ۴۹ ۳۳	لال محمد - ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج - لاہور (۱۵۰ - ۳۵۰)	۱۰ر اکتوبر سنہ ۴۸ء قبل از دوپہر سے	اپنے منصب اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں۔
	تاج علی قریشی - ایم اے	"	"	"

صیغہ رجال شعبہ اسکول

شمارہ کام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
سنہ ۴۸ ۲۲۸	م - خورشید عالم بخاری (۵۰-۳-۸۰/۴-۱۰۰)	معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی سکول فتح جنگ	معلم السنہ شرقیہ گورنمنٹ ہائی سکول پسرور - بمشاہرہ سابقہ -	تاریخ حاضری سے	م - نور حسین کی جگہ جو رخصت قبل از سبکدوشی پر ہیں - اور جن کا حق عود اب گورنمنٹ ہائی سکول فتح جنگ کی طرف منتقل کیا جا رہا ہے -
سنہ ۴۹ ۱۱۲	م نیاز احمد نمبر ۲۴ (۱۰۵ - ۱۴۰)	معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول کھرور پکا	معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول علی پور - بمشاہرہ سابقہ	"	م - محمد سلیمان کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے -
	م - محمد سلیمان نمبر ۲۲۶ (۵۰ — ۱۰۰)	معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول - علی پور	معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول کھرور پکا - بمشاہرہ سابقہ	"	م - نیاز احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے -
سنہ ۴۹ ۱۱۰	س - دبیر حسین بی اے بی ٹی نمبر ۱۲۲ (۲۳۰ - ۳۰۰)	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی گھیب	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول بھیرہ - بمشاہرہ سابقہ	"	م - ولی داد بی اے (نمبر ۱۱ : (۲۳۰-۳۰۰) کی جگہ جو ۲۷ر دسمبر سنہ ۴۸ء سے سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔
	م - مظفر الدین بی ایس سی بی ٹی - (نمبر ۲۱ : ۲۳۰-۳۰۰)	معاون ناظر مدارس ضلع گجرات	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی گھیب بمشاہرہ سابقہ	"	س - دبیر حسین بی اے بی ٹی کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء E-1191	م۔ عبدالخالق خان ایم اے بی ٹی نمبر ۹۴: (۱۵۰-۲۲۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول ملتان	معاون ناظر مدارس ضلع گجرات بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ مظفر الدین بی ایس سی بی ٹی (۲۳۰-۳۰۰) کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔ اور جو ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی گھیب مقرر ہوئے ہیں

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تعین ہوا	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۵ جنوری ۱۹۴۹ء E-1448	امانت اللہ ایم ایس سی ۱۵۰-۲۲۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول کہوٹہ	(۱۵۰-۱۰-۱۹۰/۱۰-۲۲۰) عملہ تحتانی شعبہ اینگلو ورنیکلر	(۱۵۰-۱۰-۱۹۰/۲۰-۱۰-۲۰۰/۲۵۰/۱۰-۳۰۰/۱۰-۳۵۰) عملہ تحتانی شعبہ کالج	لیکچرار کیمیا گورنمنٹ کالج لائل پور قائم مقام۔	تاریخ حاضری سے	م۔ محمد امین ایم ایس سی کی جو مستعفی ہوچکے ہیں
۲۶ جنوری ۱۹۴۹ء E-1575	چودھری عبدالمجید بی ایس سی ایس اے وی نمبر ۲۳: (۹۰-۱۵۰)	معلم زراعت گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ	عملہ تحتانی درجہ سوم (۹۰-۵-۱۵۰) شعبہ اینگلو ورنیکلر	عملہ تحتانی درجہ دوم (۱۵۰-۱۰-۱۹۰/۱۰-۲۲۰) قائم مقام		۲۷ دسمبر ۱۹۴۸ء سے	ایک خالی اسامی کی جگہ

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء E-1778	م۔ ثناء اللہ خان ایم اے پی ای ایس۔ درجہ دوم	نائب ناظر مدارس قسمت لاہور	نائب ناظر مدارس دیہاتی سائنس مغربی پنجاب لاہور		میاں اظہار الحسن کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
"	چودھری عبدالغنی بی اے پی ای ایس درجہ دوم	ناظر مدارس ضلع لاہور	نائب ناظر مدارس قسمت لاہور		م۔ ثناء اللہ خان کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
"	عنایت الرحمٰن بی اے پی ای ایس درجہ دوم	ناظر مدارس ضلع گوجرانوالہ	ناظر مدارس ضلع لاہور		چودھری عبدالغنی کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
"	مشتاق احمد بی اے بی ٹی	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول۔ چونیاں	ناظر مدارس ضلع گوجرانوالہ		م۔ عنایت الرحمٰن کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
۸ فروری ۱۹۴۹ء E-2712	م۔ نور محمد مولوی فاضل او ٹی	معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول پنڈی گھیب۔ درجہ سوم (۵۰-۳-۸۰/۴-۱۰۰) شعبہ کلاسیکل ورنیکلر		۱۵۔ اگست ۱۹۴۷ء سے	اپنے منصب اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں۔
۹ فروری ۱۹۴۹ء E-2842	س۔ نذر محمد بخاری ایم اے بی ٹی (نمبر ۲۵: ۱۵۰-۲۲۰)	معاون ناظر مدارس ضلع لاہور	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول مظفر گڑھ۔ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ بشیر احمد بی اے کی جگہ جو فوت ہوگئے ہیں۔ انا للہ
۱۰ فروری ۱۹۴۹ء E-2915	م۔ نیاز احمد منشی فاضل، مولوی فاضل، او ٹی نمبر ۲۴: ۱۰۵-۱۴۰	معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول۔ کہروڑ پکا۔	معلم عربی گورنمنٹ ہائی سکول علی پور بمشاہرہ سابقہ	"	م۔ عبدالمجید کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔
"	م۔ عبدالمجید ایس وی منشی فاضل نمبر ۳۵: (۵۰-۱۰۰)	معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول علی پور۔	معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول کہروڑ پکا بمشاہرہ سابقہ	"	م۔ نیاز احمد کی جگہ جن کا تبادلہ ہوچکا ہے۔

تاریخ وشمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۱ر فروری ۴۹ء ۲۹۷۷-E	م۔ شاہ احمد خان عرف شہ احمد خان بی اے بی ٹی نمبر ۲۶۲: (۹۰—۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی۔	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول سانگلہ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ محمد حفیظ بی اے بی ٹی (نمبر ۱۳۸: ۹۰–۱۵۰) کی جگہ جن کا تبادلہ گورنمنٹ نارمل سکول شاہ پور صدر کی طرف ہو چکا ہے۔
〃	س۔ مظہر حسن ایم اے بی ٹی	ایک اُمیدوار	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی درجہ سوم (۹۰-۵-۱۵۰) عملہ تحتانی شعبہ اینگلو ورنیکلر	تاریخ حاضری سے	م۔ شہ احمد خان جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
۱۱ر فروری ۱۹۴۹ء ۲۹۷۹-E	م۔ مستنصر باللہ ایم اے بی ٹی (۲۳۰—۳۰۰)	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازیخان		۲۰ر نومبر ۴۸ء سے	اپنے منصب اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں۔
۱۱ر فروری ۴۹ء ۲۹۹۱-E	س۔ افتخار حسین حیدر بی اے بی ٹی نمبر ۱۷۸: ۱۵۰ — ۲۲۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول مظفر گڑھ۔	معاون ناظم مدارس ضلع گجرات بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ مظفر الدین بی ایس سی بی ٹی (نمبر ۲۱: ۲۳۰–۳۰۰) کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔ اور جو صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول پنڈ دادنخان مقرر ہوئے ہیں۔
〃	م۔ مختار احمد بی اے بی ٹی نمبر ۱۹۹: ۱۵۰—۲۲۰	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول مظفر گڑھ بمشاہرہ سابقہ	〃	س۔ افتخار حسین حیدر کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔
〃	م۔ محمد فصیح اللہ خان ایم اے ایل ٹی	ایک اُمیدوار	قائم مقام معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی درجہ سوم (۹۰-۵-۱۵۰)	〃	م۔ مختار احمد بی اے بی ٹی (نمبر ۱۹۹: ۱۵۰ — ۲۲۰) کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

صیغہ رجال ——— شعبہ دفاتر

تاریخ وشمارہ احکام	نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تعین ہوا	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۵ر جنوری ۴۹ء ۱۵۱۰-E	س۔ حیدر	صدر معاون محرر دفتر ناظم تعلیمات مغربی پنجاب	درجہ مشاہرہ ۲۵۰—۱۰—۳۵۰ قائم مقام	درجہ مشاہرہ ۲۵۰-۱۰-۳۵۰ ایک سال کی آزمائش پر		۱۵ اپریل ۴۸ء سے	حکومت مغربی پنجاب کے اعلان نمبر ۲۳۰۶۰-Z مورخہ ۳ر دسمبر ۴۸ء کے مطابق نئی پیدا کردہ اسامی کی جگہ۔

تاریخ و نشانات احکام	نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر امین ہوا	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
[illegible] جنوری ۴۹ء ۱۵/۱۰۰	م۔ محمد اسحاق بی اے	صدر معاون محرر دفتر ناظم تعلیمات مغربی پنجاب درجہ مشاہرہ ۲۵۰-۱۰-۳۵۰ قائم مقام۔			صدر معاون محرر دفتر ناظم تعلیمات مغربی پنجاب درجہ مشاہرہ (۲۵۰-۱۰-۳۵۰) قائم مقام	۵ [illegible] سے	م۔ رحمت اللہ کی جگہ جو نگران محرر کی حیثیت سے قائم مقامی کر رہے ہیں۔ اور س۔ حیدر شاہ کی خالی کردہ اسامی ہیں۔
〃	م۔ منظور احمد صدیقی بی اے ایل ایل بی	معاون محرر دفتر ناظم تعلیمات مغربی پنجاب مستقل	۱۵۰-۱۰-۲۰۰/۲۰۰-۱۰-۳۰۰	۲۵۰-۱۰-۳۵۰ قائم مقام	صدر محرر دفتر ناظم تعلیمات مغربی پنجاب قائم مقام	〃	کپتان شفیق احمد خان کی جگہ جن کی خدمات سول محکمہ نے بحیثیت قائم مقام ای اے سی مستعار لی ہیں۔ اور م۔ محمد اسحاق کی خالی کردہ اسامی ہیں۔
〃	مرزا محمد حسین بی کام	معاون محرر دفتر ناظم تعلیمات مغربی پنجاب مستقل	〃	〃	〃	۱۵ اپریل ۴۸ء سے ۱۴ اگست ۴۸ء تک	م۔ علم الدین صدر معاون محرر کی جگہ جو م۔ زین العابدین کی رخصت کے سلسلے میں بطور نگران محرر قائم مقامی کر رہے ہیں۔
〃	〃	〃	〃	〃	〃	۲۷ ستمبر ۴۸ء سے ۲۱ نومبر ۴۸ء تک	م۔ علم الدین صدر معاون محرر کی جگہ جو م۔ محمد رفیق کی رخصت کے سلسلے میں بطور نگران محرر قائم مقامی کر رہے ہیں۔
〃	〃	〃	〃	〃	〃	۶ دسمبر ۴۸ء سے ۳۰ جنوری ۴۹ء تک	〃
〃	س۔ علی کاظمی	معاون محرر دفتر ناظم تعلیمات مغربی پنجاب	درجہ مشاہرہ ۱۵۰-۱۰-۲۰۰/۲۰۰-۱۰-۳۰۰ قائم مقام	درجہ مشاہرہ ۱۵۰-۱۰-۲۰۰/۲۰۰-۱۰-۳۰۰ ایک سال کی آزمائش پر	معاون محرر دفتر ناظم تعلیمات مغربی پنجاب	۵ [illegible]	س۔ حیدر شاہ کی جگہ جن کی ترقی ہو گئی ہے۔

پنجاب یونیورسٹی اور محکمۂ تعلیم مغربی پنجاب کی منظور شدہ جدید سکیم کے مطابق ٹیکسٹ بکس

ہائی سکول ٹیکسٹ بکس

پاک حساب پاک الجبرا پاک جیومیٹری

مصنفہ:-

ڈاکٹر ضیاءالدین احمد ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی (ویلز) ایف۔ آر۔ ایس۔ ایس (لندن)

و

محمد حسن راٹھور۔ بی۔ اے (آنرز)۔ بی۔ ٹی

یہ سلسلہ ہر حیثیت سے مکمل جامع اور مفید ہے میٹرکولیشن کے جدید سلیبس کو کماحقہٗ مدِنظر رکھا گیا ہے۔

چند خصوصیات ملاحظہ ہوں:- ① سلیس عبارت اور عام فہم الفاظ ② ہر قاعدہ کی زیادہ سے زیادہ ممکن مثالیں اور آسان تشریح ③ مشقی سوالات میں تسلسل اور تدریج ④ اعادہ کے لئے مناسب وقفوں کے بعد متفرق سوالات اور آزمائشی پرچہ جات ⑤ جیومیٹری کی کتاب میں ۶۰۰ سے زیادہ مشقوں کی شکلیں اور اشارات۔ ⑥ ہر کتاب کے آخر میں امتحان پنجاب یونیورسٹی کے پرچہ جات۔

ہر کتاب نہایت دیدہ زیب صورت میں عمدہ طباعت کاغذ سے آراستہ مجلد پیش کی گئی ہے قیمتیں نہایت ارزاں

پاک حساب	پاک جیومیٹری	پاک الجبرا
۳/۸/-	۳/-/-	۳/۸/-

ہائی سکول کیمیا
ہائی سکول طبیعیات

مصنفہ:-

چوہدری طفیل محمد بی۔ اے (آنرز) بی۔ ٹی۔

سائنس کی یہ ہر دو ٹیکسٹ بکس فاضل مصنف نے بڑی جانفشانی سے کئی ماہ کی لگاتار محنت کے بعد طلبہ کی ہر آسانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ترتیب دی ہیں۔ جدید اصطلاحات کو اردو کا لباس پہنانا آسان کام نہیں لیکن نقاد کی رائے میں مصنف بیحد کامیاب رہا ہے۔ اصطلاحات کی انگریزی سے اردو فہرست ہر دو کتب کے آخر میں شامل کر دی گئی ہے یقیناً آپ کتابیں ملاحظہ فرما کر انکو بیحد پسند فرمائینگے۔ ہائی سکول کیمیا (۲/۴) ہائی سکول طبیعیات (۳/ ہے)

قواعد عربی ۱۲/

مڈل کے لئے عربی کی بہترین گرامر

- مڈل کلاسز کے لئے جدید ترین سلیبس کے مطابق عربی قواعد کی کتاب۔
- جدید طریقہ تعلیم کے مطابق دروس الصرف و دروس النحو کو ترتیب دیا گیا ہے۔
- گردانیں چارٹوں کی صورت میں پیش کی گئی ہیں

ماڈرن پرشین گرامر ۸/

محکمہ تعلیم کی جدید سکیم کے مطابق نئے انداز میں فارسی قواعد کی مکمل کتاب۔ مڈل کے سلیبس کو کما حقہ پورا کرتی ہے

اسباق الاملا

(اول) پرائمری کے لئے ۶/
(دوم) مڈل کے لئے ۸/

اصلاح تلفظ۔ املا اور زباندانی۔

املا جیسا ضروری مضمون اور اس سے بے اعتنائی! ان کتابوں کی اشاعت کے بعد آپ کا گلہ کہ املا پر عمدہ کتابیں نہیں ہیں۔ بیجا ہوگا۔ ان ہر دو کتابوں میں ہر قسم کے الفاظ کا عمدہ ذخیرہ فراہم کرکے قواعد ضروریہ کے تحت خاص اسلوب سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اپنے موضوع پر اس سے اچھی کتابیں آپ کو نہ ملیں گی۔

اُردو خط و کتابت (جدید) ۱۰/

پرائمری جماعتوں کے لئے نہایت آسان زبان میں خطوط نویسی کے طریق و آداب کے متعلق اچھوتی کتاب۔ ۱۴۴ صفحات میں ایک بڑا ذخیرہ۔ کاغذ و طباعت عمدہ۔

منتخباتِ اُردو اوّل ۱۲/ دوم ۱۲/

مرتبہ: ظفر اقبال ایم۔اے۔بی۔ٹی۔پی۔ای۔ایس۔ منتخباتِ اُردو جے۔ وی اور ایس۔ اے۔ وی کلاسز کیلئے تیار کرایا گیا ہے۔ اسمیں قدیم و جدید اردو ادب کا انتخاب نہایت صحیح انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ نارمل سکولوں کے علاوہ لائبریریوں کیلئے ایک گرانقدر تحفہ ہے۔ آپ یقیناً ان کو پڑھ کر اردو ادب کے سارے دوروں سے واقف ہو جائینگے

زیور حساب

دوسرا حصہ ۷/۱ پائی
تیسرا (۸/۹ پائی)، چوتھا (۱۱/۹ پائی)، پانچواں (۱۲/۳ پائی)

"زیور حساب چھٹا، ساتواں اور آٹھواں حصہ بھی چھپ کر تیار ہے"

منظور کردہ محکمہ تعلیم مغربی پنجاب
مطابق سرکلر نمبر ۹۲۲۴ مورخہ ۱۰/ مئی ۱۹۴۸ء

- اپنی طرز کی پہلی کامیاب کوشش جسکو محکمہ تعلیم نے بھی سراہا ہے
- سوالات کا کافی ذخیرہ جو زمانہ سکیم کے عین مطابق خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے۔
- "آسان سے مشکل" کا مشہور اصول ترتیب کے وقت ملحوظ رکھا گیا ہے
- عبارتی سوالات عام فہم اور آسان اُردو میں طالبات کے مذاق کے مطابق لکھے گئے ہیں۔
- زبانی حساب کی خاص مشقیں شامل کتاب ہیں۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔

Domestic Arithmetic & House Hold Accounts.

2/8/-

میٹرکولیشن کی طالبات کیلئے جدید سکیم کے مطابق کامیاب ٹیکسٹ بک۔ حسابِ ڈاکخانہ، بینک، انشورنس، خانہ داری کا حساب غرضیکہ جملہ مضامین کو کما حقہ آسان اور عمدہ زبان میں ترتیب دیا ہے۔ یونیورسٹی کے سوالات سے مشقیں ترتیب دی گئی ہیں۔

لڑکیوں کے لئے اُردو کا نیا سیٹ

زنانہ اُردو ریڈر قاعدہ ۳ر ۳ پائی

اوّل ۸ر دوم ۱۱ر سوم ۱۳ر چہارم ۱۴ر

آج کی بچّی کل کی ماں ہے۔ اس لئے اس کو بہترین تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے کا موقع دینا چاہیئے۔ ہماری یہ زنانہ ریڈریں نہایت اچھوتے انداز میں جدید سکیم کے مطابق تیار کی گئی ہیں۔ جن کو ملک بھر میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ آپ بھی ان کو اپنی طالبات کے لئے پسند فرما کر رائج کریں ؂

جدید زنانہ اُردو خط و کتابت ۱۲ر
محاورات نسواں۔ ۱۲ر

یہ دو کتابیں اپنی مثال آپ ہیں۔ پہلی کتاب میں ۵۰ سے زائد آسان اور جلد سمجھ میں آجانے والے خطوط کے نمونے لڑکیوں کیلئے لکھے گئے ہیں۔ خط و کتابت کے صحیح طریقے' آداب' القاب' گھریلو اور معاشری خطوط' ڈاکخانہ کی معلومات' جملہ ضروریات درج ہیں۔ فاضل مصنّفہ نے دہلی اور لکھنؤ کی بیگمات کی بول چال ٹھولوں کے مزے دوسری کتاب میں جمع کر دئے گئے ہیں۔ عورتوں کے اپنے محاورات بہ ترتیب حروف تہجی معانی اور استعمال کے ساتھ درج ہیں ؂

سٹینڈرڈ اُردو ڈکشنری

مرتبہ: محمّد باقر ایم۔ اے۔
قیمت مجلّد بارہ روپے

اُردو زبان میں نئی طرز کی جامع و مکمّل لغت' جسے مصنّف نے دو سال کی مسلسل محنت و کوشش اور ممتاز اہل قلم اور افسران محکمہ تعلیم کے مفید مشورہ کے بعد ترتیب دیا ہے۔ اس ممتاز ترین لغت میں عربی' فارسی' انگریزی' ہندی کے تمام نئے مروّجہ الفاظ اور علوم و فنون' تہذیب و تمدّن' تجارت و سیاست کی تمام اصطلاحات جو اُردو زبان میں استعمال ہوتی ہیں۔ جو دیگر لغت میں نہیں ملتی۔ طلبہ' اساتذہ اور ادبا کی ضروریات کے پیشِ نظر ضروری اعراب کے ساتھ درج کر دی گئی ہیں ؂

شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ تاجران و ناشران کتب۔ کشمیری بازار۔ لاہور

ہم وعدہ کرتے ہیں

کہ

پاک پوشاک (رجسٹرڈ)

آپ کی زیبائش کے لئے نہایت مناسب قیمت پر سلے سلائے کپڑے یعنی قمیص۔ بش شرٹ۔ پتلون وغیرہ مہیّا کرے گی۔

سپیشل آرڈر پر کپڑے تیار کئے جا سکتے ہیں۔

ایجنسی کے لئے خط و کتابت کیجئے

منتظمین پاک پوشاک (رجسٹرڈ) ۴۴ نسبت روڈ۔ لاہور

محکمہ تعلیم مغربی پنجاب کی اپنی ٹیکسٹ بکس رائج کریں

اُردو کے قاعدے ابتدائی جماعت کے لئے

۱۔ اُردو کا قاعدہ ۱ر ۱۱ پائی
۱الف۔ اُردو کا قاعدہ ۔ حصہ اوّل ۱ر
۲۔ اُردو کا قاعدہ ۔ بطرزِ جدید ۱ر ۱۱ پائی
۲الف۔ اُردو کا قاعدہ ۔ بطرزِ جدید حصہ اوّل ۱ر
۳۔ اُردو کا قاعدہ ۔ بطرزِ جدید (جلی قلم) پہلا حصہ ۲ر ۱۱ پائی
۴۔ اُردو کا قاعدہ ۔ بطرزِ جدید (جلی قلم) دوسرا حصہ ۳ر ۹ پائی

نیا سلسلہ اُردو کتابیں

۵۔ نیا سلسلہ اُردو کی دوسری کتاب ۔ دوسری جماعت کیلئے عہ ر ۱ پائی
۶۔ " " تیسری " تیسری " " عہ ر ۲ پائی
۷۔ " " چوتھی " چوتھی " " عہ ر ۱ پائی
۸۔ " " پانچویں " پانچویں " " عہ ر ۷ پائی
۹۔ " " چھٹی " چھٹی " " عہ ر ۲ پائی
۱۰۔ " " ساتویں " ساتویں " " عہ ر ۷ پائی
۱۱۔ " " آٹھویں " آٹھویں " " عہ ر ۷ پائی

پرائمری و مڈل کے لئے سرکاری سلسلہ

۱۲۔ اُردو کی پہلی کتاب ۔ دوسری جماعت کے لئے ۹ر ۱ پائی
۱۳۔ " " دوسری " ۔ تیسری " " ۸ر ۷ پائی
۱۴۔ " " تیسری " ۔ چوتھی " " ۱۱ر ۲ پائی
۱۵۔ جدید اُردو کورس پہلا حصہ } پانچویں جماعت کیلئے عہ ر ۵ پائی
پانچویں کتاب نیا سلسلہ }
۱۶۔ جدید اُردو کورس دوسرا حصہ ۔ چھٹی " عہ ر ۴ پائی
۱۷۔ " " " تیسرا " ۔ ساتویں " عہ ر ۹ پائی
۱۸۔ " " " چوتھا " ۔ آٹھویں " عہ ر ۴ پائی

لڑکیوں کے لئے سلسلۂ کتب

۱۹۔ اُردو کی دوسری کتاب ۔ زنانہ مدارس کی دوسری جماعت کیلئے ۱۴ر ۲ پائی
۲۰۔ " " تیسری " " " تیسری " ۱۳ر ۲ پائی
۲۱۔ " " چوتھی " " " چوتھی " عہ ر ۲ پائی
۲۲۔ " " پانچویں " " " پانچویں " عہ ر ۳ پائی
۲۳۔ اُردو کورس (قصص ہند کا مجموعہ) " " چھٹی " عہ ر ۲ پائی
۱۰۔ اُردو کی ساتویں کتاب (نیا سلسلہ) " " ساتویں " عہ ر ۷ پائی
۱۱۔ اُردو کی آٹھویں کتاب (") " " آٹھویں " عہ ر ۷ پائی

پرائمری و مڈل کے لئے اُردو گرامر

۲۶۔ صرف و نحو اُردو ۔ چوتھی و پانچویں جماعتوں کے لئے ۷ر ۲ پائی
۲۷۔ قواعدِ اُردو ۔ مڈل کی جماعتوں کے لئے ۵ر ۹ پائی
۲۸۔ اُردو گرامر ریڈر (اوّل و دوم) مڈل کی جماعتوں کیلئے عہ ر ۴ پائی

عربی ریڈرز و گرامر

۲۹۔ عربی کی پہلی کتاب ۔ مڈل سکولوں کی چھٹی جماعت کے لئے ۵ر ۴ پائی
۳۰۔ " " دوسری " " " ساتویں " ۷ر ۹ پائی
۳۱۔ " " تیسری " " " آٹھویں " ۱۰ر ۱ پائی
۳۱الف۔ قواعدِ عربی ۔ مڈل کی جملہ جماعتوں کے لئے ۶ر ۳ پائی

فارسی ریڈرز و گرامر

۳۲۔ فارسی کورس حصہ اوّل مڈل سکولوں کی چھٹی جماعت کے لئے ۸ر
۳۳۔ فارسی کورس حصہ دوم مڈل سکولوں کی ساتویں آٹھویں جماعتوں کیلئے ۱۰ر ۳ پائی
۳۴۔ قواعدِ فارسی ۔ مڈل کے لئے فارسی قواعد ۹ر ۴ پائی
۳۵۔ نقش القرف ۔ مڈل کے لئے فارسی گرامر ۴ر ۴ پائی
۳۵الف۔ فارسی گرامر جدید (بطرزِ انگریزی) مڈل کیلئے فارسی گرامر ۱۰ر ۶ پائی

سلسلہ حفظانِ صحت

۳۶۔ درسی الصحت ۔ چوتھی و پانچویں جماعتوں کے طلبہ کیلئے ۷ر ۱ پائی
۳۷۔ شاہراہ تندرستی ۔ " " " " " " ۷ر ۹ پائی
۳۸۔ زندگی روشنی صفائی ۔ مڈل کی جماعتوں کے طلبہ کے لئے عہ ر ۴ پائی
۳۹۔ حفظانِ صحت (اپنی اور اپنے گھر کی)
مڈل کی جماعتوں کے طلبہ کے لئے ۱۱ر ۳ پائی

قصباتی اُردو ریڈرز

۵۔ اُردو کی دوسری کتاب (نیا سلسلہ) {قصباتی مدارس کی دوسری جماعت کیلئے} عہ ر ۱۰ پائی
۴۴۔ " " تیسری " (قصباتی) {قصباتی مدارس کی تیسری جماعت کیلئے} ۱۵ر ۲ پائی
۴۵۔ " " چوتھی " (") {قصباتی مدارس کی چوتھی جماعت کے لئے} عہ ر ۳ پائی
۴۶۔ " " پانچویں " (") {قصباتی مدارس کی پانچویں جماعت کیلئے} عہ ر ۲ پائی
۴۷۔ " " چھٹی " (") {قصباتی مدارس کی چھٹی جماعت کے لئے} ۱ر ۳ پائی
۴۸۔ " " ساتویں " (") {قصباتی مدارس کی ساتویں جماعت کیلئے} ۱۵ر ۱۰ پائی
۱۱۔ " " آٹھویں " (نیا سلسلہ) {قصباتی مدارس کی آٹھویں جماعت کیلئے} عہ ر ۷ پائی

دیہاتی اُردو ریڈرز

۴۹۔ اُردو کی دوسری کتاب (دیہاتی) دیہاتی مدارس کی دوسری جماعت کیلئے ۱۴ر ۳ پائی
۵۰۔ " " تیسری " (") {دیہاتی مدارس کی تیسری جماعت کیلئے} عہ ر ۸ پائی
۵۱۔ " " چوتھی " (") {دیہاتی مدارس کی چوتھی جماعت کے لئے} ۱۴ر ۷ پائی
۵۲۔ " " پانچویں " (") {دیہاتی مدارس کی پانچویں جماعت کے لئے} عہ ر ۷ پائی
۹۔ " " چھٹی " (نیا سلسلہ) {دیہاتی مدارس کی چھٹی جماعت کے لئے} ۱ر ۲ پائی
۱۰۔ " " ساتویں " (") {دیہاتی مدارس کی ساتویں جماعت کے لئے} عہ ر ۷ پائی
۱۱۔ " " آٹھویں " (") {دیہاتی مدارس کی آٹھویں جماعت کیلئے} عہ ر ۷ پائی

پبلشرز یونائیٹڈ ۔ ۱۷۶ ۔ انارکلی ۔ لاہور ۔

- "آموزش" ہر ماہ شائع ہوتا ہے، سالانہ چندہ چھ روپیہ ہے
زر چندہ مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور کے نام روانہ کریں۔
- مضامین ایڈیٹر "آموزش" سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور
کو ارسال کئے جائیں۔ اشاعت کے لئے منظور شدہ
مضامین کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔
- "آموزش" تمام تعلیمی حلقوں میں مقبول اور جملہ تعلیمی اداروں
میں رائج ہے۔
- "آموزش" میں اشتہار دیکر آپ تعلیم یافتہ جماعت
میں مشہور و مقبول ہو سکتے ہیں۔
- اشتہارات اور دوسرے کاروباری معاملات کے لئے
مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور سے مراسلت کریں۔

درسی کتب کا قدیم ادارہ
شیخ غلام علی اینڈ سنز کشمیری بازار لاہور

مینجر آموزش کشمیری بازار لاہور

اپریل ۱۹۴۹ء

نیو ایجوکیشن فیلوشپ کانفرنس نمبر

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

مدیر

محمدؐ ناظر

ناشر

اپریل سنہ ۱۹۴۹ء   کتاب منزل   سالانہ چندہ:-

جلد:- ۲   لاہور   پاکستان کیلئے:- ۶ روپے

شمارہ:- ۱   قیمت فی پرچہ:- دس آنے   غیر ممالک کیلئے:- ۸ روپے

رموز

آموزش کے اس نمبر میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ صوبہ مغربی پنجاب کی تعلیمی کانفرنس کی روداد پیش کی جا رہی ہے۔ اور چند ایک مقالات بھی شائع کئے جا رہے ہیں۔ جو اس کی مختلف نشستوں میں پڑھے گئے تھے۔

نیو ایجوکیشن فیلوشپ ایک عالمگیر تنظیم ہے۔ اور اس کی شاخیں تقریباً دنیا کے ہر حصے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس فیلوشپ کا اہم مقصد یہ ہے۔ کہ ماہرین تعلیم کے لئے ایسے مواقع مہیا کئے جائیں کہ وہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ تعلیم کے متعلق مختلف مسائل پر بحث کریں۔ ان کے حل تجویز کریں اور اس طرح جدید ترین طریق تعلیم، جدید تدابیر اور مناسب نصاب تعلیم تیار کرنے میں اساتذہ اور بچے کے والدین کی امداد کریں۔ نیو ایجوکیشن فیلوشپ تعلیم کے حرکی نظام میں اعتماد رکھتی ہے۔ اور سمجھتی ہے۔ کہ رواں دواں زندگی میں ساکن و جامد نظام کام نہیں دے سکتا۔ بلکہ بجائے مفید ثابت ہونے کے مضر ثابت ہوتا ہے۔ حالات زندگی بدلتے رہتے ہیں۔ اور بدلے ہوئے حالات میں پرانا نصاب غیر مفید ہے۔ حالات کے تغیرات کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کے مطابق نصاب تعلیم میں بھی تبدیلی آتی رہے اور نظام میں مناسب اصلاح ہوتی رہے۔ تو زندگی کے مسائل کامیابی کے ساتھ حل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کی ہمیشہ ضرورت ہے۔ کہ نظام تعلیم کو بجائے جامد و ساکن بنانے کے زندہ اور حرکی بنایا جائے۔ تعلیم کے مقاصد اور عملی طریقوں کا مسلسل جائزہ

لیتے رہنا چاہیئے۔ اور زندگی کے ارتقا کے ساتھ ساتھ نئی معلومات کی روشنی میں انہیں نئی تشکیل دیتے رہنا چاہیئے۔ یہ ضرورت اس بات کی متقاضی ہے کہ تعلیم سے تعلق رکھنے والے اصحاب اکثر ملیں اور تبادلہ خیالات کریں۔ اپنے اپنے تجربات کی بنا پر بحثوں، لیکچروں، مظاہروں اور نمائشوں کے ذریعے کامیاب ترین طُرق کار سوچیں اور انہیں رائج کریں۔

تقسیم ہند کے بعد کے جدید حالات بھی اس بات کی متقاضی تھے۔ کہ ارباب تعلیم اکٹھے ہو کر نئی نئی ضرورتوں کے مطابق تدابیر سوچیں۔ چنانچہ جہاں اور تعلیمی کانفرنسیں ہوئیں صوبہ مغربی پنجاب کی نیوایجوکیشن فیلوشپ نے بھی پاکستانی فضا میں پہلی بار اپنی عالیشان کانفرنس کا اہتمام کیا۔

نیوایجوکیشن فیلوشپ کی یہ کانفرنس ۲۸، ۲۹، ۳۰ جنوری ۱۹۴۹ء کو سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں بڑے اہتمام سے منعقد ہوئی۔ مختلف مقامات سے ایک ہزار سے زائد مندوب اس کانفرنس میں شرکت کے لئے تشریف لائے۔ تین دن خوب رونق رہی۔ تعلیمی مسائل پر ارباب فکر و اجتہاد نے بہت پُر لطف و فکر انگیز بحثیں کیں، مظاہرے ہوئے۔ اعلےٰ پیمانے پر تعلیمی نمائش قائم ہوئی، شعروسخن کی محفل بھی رچی، اور چند مفید تجاویز بھی پاس ہوئیں۔ اس کانفرنس نے وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ اقدام کیا۔ اور یہ اپنے اس اقدام میں بہت حد تک کامیاب ہوئی۔

پاکستان کے قیام سے ہمارے ماحول، ہمارے حالات، ہمارے اذہان اور ہماری ضروریات میں جس قسم کا تغیر آیا ہے کسی سے مخفی نہیں۔ یہ تغیرات متقاضی ہیں۔ کہ ہم اپنے معاشرے کو اپنے قومی و ملی مقاصد کے سانچے میں ڈھالیں۔ اور نئے حالات کے مطابق صحیح لائحۂ عمل تیار کریں۔ معاشرے کے متعلق اس قسم کے اقدام کی صرف ایک ہی صورت ہے "تعلیم"! یہی وہ پیمانہ ہے جس سے قومی قسمتیں ناپی جاتی ہیں۔ یہی وہ کارخانہ ہے جس میں قوموں کے عروج و زوال کی تشکیل ہوتی ہے۔ "تعلیم" ہی گویا قوموں کا حیات

آلہ اور محور ہے۔ چنانچہ کسی معاشرے کی تجدید میں اسی حیات پیما آلہ پر ہی سب کی نظر مرکوز ہوتی ہے۔ ہمیں بھی بحیثیت آزاد قوم اسی محور کی اصلاح و استحکام سے اپنی حیاتِ ملّی کی استواری اور پائداری کی اُمیدیں وابستہ کرنا ہیں۔ وقتی ضرورتوں نے ہمارے لئے ناگزیر کردیا ہے کہ ہم ایسے اقدامات کی تدابیر کریں جن سے ایک تو تعلیم عام ہو یعنی ہمارا ہر فرد پڑھا لکھا ہو جائے، دوسرے ہماری قوم کی اُمیدیں استوار ہوں۔ یعنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں ہمارے بچے قوم و ملک کے صحیح جذبات پیدا کریں۔ تیسرے ہماری تعلیم کے علم بردار وقتی ضرورتوں کے مطابق اپنے فرائض کو سمجھیں۔ اور نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیں۔ یعنی تربیت اساتذہ کا مناسب انتظام ہو۔ نیز یہ بھی کوشش ہو کہ ہمارے بچے تندرست و توانا ہوں، تاکہ قوم کا کوئی جز ماؤف نہ رہ جائے۔ یعنی تعلیم صحت جسمانی کا اہتمام ہو۔ چنانچہ تعلیم بالغان، تعلیم صحت جسمانی، ابتدائی و ثانوی تعلیم اور تربیت اساتذہ اس وقت کے اہم مسائل ہیں۔ جن کی طرف ہماری توجہات کے فوراً مبذول ہونے کی ضرورت ہے۔ این ای ایف کی کانفرنس میں بھی یہی امور زیرِ بحث تھے۔ اور اس کانفرنس کے اجلاس کی غرض بھی یہی تھی کہ تعلیم کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے س کے ان اہم پہلوؤں کے متعلق اربابِ تعلیم میں بحث و فکر کا موقعہ پیدا کیا جائے۔ تاکہ ایک طرف تو تعلیم کے اربابِ اہتمام ان اہم مسئلوں کے سلسلے میں صحیح اقدامات کی تدابیر سوچنے کی طرف مائل ہوں اور دوسری طرف اساتذہ کرام کو بھی وقتی ضرورت کے لحاظ سے اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس ہو چنانچہ جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے۔ کانفرنس نے اس فکر و غور اور احساس کے متعلق بیداری پیدا کرنے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب نے خطبہ استقبالیہ میں کانفرنس کے مقصدِ انعقاد کو واضح کرتے ہوئے فرمایا۔ ہمارا موجودہ نظام تعلیم خرابیوں سے مملو ہے۔ یہ دورِ غلامی کی یادگار ہے۔ اور جس مصلحت پر اس کا قیام ہے وہ وفادار غلاموں کی تخلیق ہے۔ اور ملّی و قومی احساس

کی موت ہے۔ ہم اس کی بدولت اپنے مفید نصب العین کے قائم کرنے کے قابل ہی نہ تھے۔ اب ہمیں آزادی کی فضا میں سانس لینا نصیب ہوا ہے۔ ہمیں اپنی منزلِ مقصود واضح طور پر سمجھنی ہے اور اس تک پہنچنے کے لئے صحیح شاہراہوں کا انتخاب کرنا ہے۔ اور جو تعمیر بھی کرنی ہے اُسے مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنا ہے۔ ہمارا نصب العین اور لائحۂ عمل اب ایسا ہونا چاہیئے۔ جو ہمیں پیہم متحرک، سرگرمِ عمل اور کوشاں رکھے۔ اس نصب العین کی تعیین اور اس لائحۂ عمل کی ترتیب انفرادی طور پر ہونی مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے اربابِ تعلیم سر جوڑ کر بیٹھیں اور محنت و خلوص سے اس نظام کی تشکیل کریں۔ علوم و فنون تو نظامِ تعلیم کا ضروری جزو ہیں۔ لیکن نظامِ تعلیم کی صحیح روح مذہب ہے۔ ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم اس روح سے مطلقاً عاری ہے۔ ہمارے قومی شعور اور ہمارے آئین و تہذیب کی خاطر ہمیں اپنے نظامِ تعلیم کو اسلامی نظریات کی روشنی میں تیار کرنا ہے۔ اور مذہب پر اپنی اخلاقی اور روحانی قدریں قائم کرنی ہیں۔ ہمیں اس بات کی بھی کوشش کرنی ہے کہ پُرانی مصلحتیں جو اب تک ہمارے عوام کی کثرت کو ناخواندہ رکھنے کے حق میں تھیں۔ اور غلامانہ ذہنیت کے قیام اور استواری کا باعث تھیں۔ ان کو محو کر کے ان کی جگہ تمام افراد تک تعلیم کی روشنی اس رنگ میں پہنچانا ہے کہ ہر فرد اس بصیرت کو حاصل کر کے اپنی ملت و ملک کے لئے بہترین اور مفید رکن بننے میں کوشاں ہو۔ اور صحیح جذبات سے سرشار ہو کر میدانِ عمل میں معاشرے کے لئے مفید خود مختارانہ اقدام کر سکے۔

بچے قومی مستقبل کی بنیاد ہیں۔ ان کی صحیح قدر کرنا قوم کا فرض ہے۔ ان سے تغافل قوموں کے لئے مہلک ثابت ہوتا ہے۔ ان کی صحیح نشو و نما جب ہی ہو سکتی ہے کہ ان کی طبیعتوں میں تربیت دینے والی چیز کے خلاف تنفر پیدا نہ ہو۔ تنفر پیدا ہو جائے تو پھر ہزار تدابیر کی جائیں، صحیح نشو و نما دشوار بلکہ ناممکن سی ہو جاتی ہے۔ ہمارے اکثر بچے جو مدرسوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ مدرسے کو ایک ہیبت ناک مقام سمجھتے ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں اس کے لئے ڈر سا

رہتا ہے۔ استاد انہیں ایک ہیبت ناک دیو معلوم ہوتا ہے۔ اور جبھی اس کا گزر آ ہنیں ننھی سی جان اور اس قدر خوف و ہراس، اس کے دماغ میں کون سی چیز اطمینان سے بیٹھے گی؟ اس کے ذہن نشین کیا ہوگا؟ اس کی تعلیمی ترقی کیا ہوگی؟ ڈر سے دماغ میں کچھ نہیں بیٹھتا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ صرف یہی کہ اساتذہ بچے کی شخصیت کی صحیح قدر نہ کرتے ہوئے اس کے میلانات اور اس کی حریت عمل کی اہمیت نہیں جانتے۔ اور زجر و توبیخ سے اس پر بے جا ظلم کرکے اس کی طبعی نشو و نما میں رکاوٹ ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تنفر نہ ہو تو اور کیا ہو۔ اُستاد اس چھوٹی شخصیت کا جائز احترام کریں۔ اس کے اعمال کے لئے مناسب اور آزادانہ فضا پیدا کریں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ بچہ مدرسے میں زیادہ دلچسپی نہ لے۔ اور اس طرف خود بخود کھچا نہ آئے ؎

درس ادیب اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پای را

یہ ایک اہم نکتہ ہے جس کو ہمیں اپنی قومی تعمیر میں مدِنظر رکھنا ہے۔ تعلیمی فضا سے تنفر کی قباحت کو دُور کرنا چاہیئے۔ این ای ایف کانفرنس میں اس اہم نکتے کی طرف پروفیسر بشیر احمد ہاشمی صاحب نے اپنے عالمانہ خطبہ صدارت میں توجہ دلائی۔ اور اس بات پر خاص زور دیا کہ استاد کو بچے کی شخصیت کی خاطر سرتاسر جذبۂ احترام و محبت سے سرشار ہونا چاہیئے۔ بچوں کی مناسب تکریم و تحریم ہو۔ اور استاد محبت و شفقت سے پیش آئے۔ تو بچوں کی نشو و نما آزادانہ طور پر ایسی صورت اختیار کرے گی۔ کہ ملک و ملت کے لئے قابل فخر ہوگی۔ بچے تعلیم میں صحیح دلچسپی لیں گے؛ ان کی دلچسپی، توجہ اور کوشش و محنت سے تعلیم کے مقاصد کی تکمیل میں بہت حد تک امداد ملے گی۔

تعلیم کو عام کرنے کے لئے اور معاشرے کے ہر فرد کو خواندہ بنانے کے لئے یہاں

ابتدائی تعلیم کے لازمی کرنے کی ضرورت ہے۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ جو افراد عمر یا کاروبار یا کسی مجبوری کی بنا پر اسکول نہیں جا سکتے۔ ان کو خواندہ بنانے کا اہتمام کیا جائے۔ مشرقی اقوام نے اس پہلو پر زیادہ زور دیا ہے۔ اور وہ بہت حد تک ناخواندگی کی لعنت دُور کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ تمدن و تہذیب کی بہتری اسی میں ہے۔ کہ ہر فرد اپنے بھلے بُرے کو خود سوچنے کے قابل ہو۔ اور دوسروں کے ساتھ سلوک کرنے کی صحیح قدر کو سمجھتا ہو۔ نیز امن و امان سے موجودہ دُور کی ضروریات کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔ یہ چیز تعلیم کے بغیر ناممکن ہے۔ ہر فرد کا خواندہ ہونا اس مقصد برآری کے لئے ضروری ہے۔ ہمارے ملک کے ناخواندوں کی کثرت محتاجِ بیان نہیں۔ ہمیں ابتدائی تعلیم کو توسیع دینے کے ساتھ ساتھ تعلیم بالغان کا اہتمام بھی کرنا ہے۔ کانفرنس میں یہ موضوع بھی زیر بحث آیا۔ اور بہت سے حضرات نے اس سلسلے میں مفید تجاویز پیش کیں۔

تعلیم کا دارومدار اُستاد پر ہے تعلیم کے لئے تمام قسم کے اہتمامات بے سود ہیں۔ اگر تعلیم کے کام سرانجام دینے والے کے اطمینان کا کوئی سامان ہو۔ بھوکا اُستاد کس طرح اپنے فرائض صحیح طور پر نباہ سکتا ہے۔ وقت کے اقتصادی انحطاط کا شکار زیادہ تر معلم ہی ہُوا ہے۔ اس کے دوش پر قوم کی اہم ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ لیکن اس کی اپنی حالت یہ ہے۔ کہ بس سانس لے رہا ہے۔ اسے پیٹ بھر کھانا دینے کی اہم ضرورت ہے۔ ورنہ اس سے قومی تعمیر کی اُمیدیں وابستہ کرنا بے سود ہے۔

یوں تو استادوں کی اقتصادی حالت بحیثیت عامہ قابلِ رحم ہے اور اس بات کی متقاضی ہے کہ جلد از جلد انہیں مناسب امداد پہنچے۔ لیکن لوکل باڈیز اور پرائیویٹ درسگاہوں میں تو حالات فوری توجہ کے محتاج ہیں۔ ان کے استادوں کو بجا شکایت ہے۔ کہ ان کی تنخواہوں کے گریڈ گورنمنٹ کی درسگاہوں کے ملازمین سے کم ہیں۔ اور ان کی تنخواہیں مہینوں تک انہیں نہیں ملتیں۔ غریب اُستادوں کو اس طرح بھوک اور قرض

کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنی آواز بلند کریں تو اربابِ اقتدار ناراض ہو کر ان کے برخلاف تادیبی کارروائی کرتے ہیں۔ اُستادوں کی یہ حالت بھی کانفرنس میں زیرِ بحث آئی۔ اور سب نے اس بات پر اتفاق کیا۔ کہ یا تو حکومت تمام اسکولوں کا انتظام خود سنبھال لے یا کچھ ایسا انتظام کرے کہ استادوں کو ماہ بماہ وقت پر تنخواہیں ملا کریں۔ نیز ملازمین کی تنخواہوں میں مناسب اضافہ کیا جائے۔ اِس کانفرنس نے آخر میں چند ریزولیوشنز پاس کئے۔ جو درج ذیل ہیں:۔

۱۔ چونکہ قوم کے زیرِ تعلیم بچوں کی صحت جسمانی روز بروز خطرناک حد تک تنزل پذیر حالت کی طرف جا رہی ہے۔ اس لئے کانفرنس کی رائے ہے کہ طلبہ کے طبی معائنے کا حکومت کو جلد کوئی معقول انتظام کرنا چاہیئے۔

۲۔ شعبہ تعلیمات کے جملہ ملازمین کی ادنےٰ اور اعلیٰ تعلیم کا مفت انتظام حکومت کو کرنا چاہیئے۔ اور اساتذہ کی اولاد کا پیشہ ورانہ درسگاہوں میں خواہ تربیت اساتذہ کی ہوں یا دوسری داخلہ میں خاص لحاظ رکھا جائے۔

۳۔ ڈرل ماسٹروں کی ٹریننگ کا معقول انتظام کیا جائے۔ اور جب تک حکومت یہ انتظام نہ کر سکے۔ غیر تربیت یافتہ ڈرل ماسٹروں کے لئے بھی غیر سرکاری مدارس میں حکومت مالی امداد دے۔

۴۔ شعبہ تعلیمات کے جملہ ملازمین کے نمائندے صوبائی و مرکزی مجلس قانون ساز میں منتخب کئے جانے کے لئے مدرسین کے حلقہ ہائے انتخاب قائم کرنا چاہئیں۔

۵۔ پرائمری اسکولوں کے اساتذہ کی تنخواہ ۱۰۰ روپیہ، مڈل سکول کے اساتذہ کی تنخواہ ۱۵۰ روپیہ اور ہائی اسکولوں کے استادوں کی تنخواہ ۲۰۰ روپیہ ماہوار ہونی چاہیئے۔

رُوداد تعلیمی کانفرنس

نیوایجوکیشن فیلوشپ صوبہ مغربی پنجاب۔ پاکستان

منعقدہ ۲۸-۲۹ اور ۳۰ جنوری ۱۹۴۹ء۔

سنٹرل ٹریننگ کالج۔ لاہور۔

نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے زیر اہتمام سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں تعلیمی کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو بوقت ۳ بجے دن منعقد ہوا۔ سب سے پہلے تلاوت قرآن مجید ہوئی۔ پھر جناب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی۔ بیرسٹرایٹ لاء صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ آپ نے ماہرینِ تعلیم کو متوجہ کیا کہ وہ پاکستان کے لئے نئے نظام تعلیم کی تشکیل کی طرف خاص جدو جہد کریں۔ کیونکہ تعمیر قوم میں تعلیم کی حیثیت خشتِ اوّل کی ہے۔ اور اس لئے اگر ہم صحیح تعلیمی نظام قائم کر سکے تو ہماری قومی عمارت مستحکم و شاندار ہو سکے گی۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ بدلتے ہوئے حالات کے لئے ایک نئے زندہ اور حرکی نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔ ہمیں عالمگیر تہذیب کی سمت مقرر کرکے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا رُخ اس طرف پھیرنا چاہئے۔ آپ نے نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے مقاصد کی تائید فرمائی۔ اور مذہبی تعلیم پر زور دیتے ہوئے فرمایا۔ کہ ہمارے نظامِ تعلیم

کا محور اسلام ہونا چاہیئے۔ آپ نے بچوں کو ممتاز، مقتدر اور با اخلاق شہری بنانے کی خاطر اساتذہ اور والدین کے مکمل تعاون کی اہمیت بھی بیان فرمائی۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب کے خطبہ کے بعد جناب بشیر احمد ہاشمی ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ مغربی پنجاب نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ خطبۂ صدارت پڑھنے سے پہلے آپ نے حضرت قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی رُوح پُرفتوح پر ایصال ثواب کے لئے حاضرین کو متوجہ کیا۔ چنانچہ تمام شرکائے کانفرنس نے فاتحہ خوانی کی۔ اس کے بعد سر عبدالقادر صاحب کا وہ مکتوب پڑھا گیا جو صاحب موصوف نے بوجہ علالت کانفرنس میں عدم شرکت سے معذوری کے اظہار کے لئے ارسال فرمایا تھا اور کانفرنس کی کامیابی کے لئے دلی تمنا ظاہر کی تھی۔ جناب بشیر ہاشمی صاحب کی تجویز پر تمام حاضرین نے سر عبدالقادر کے لئے دعائے صحت کی۔ ازاں بعد جناب بشیر ہاشمی صاحب نے اپنا خطبۂ صدارت پڑھا۔ صاحب موصوف نے نئی تعلیم کی خصوصیات نہایت دلچسپ انداز میں واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ نئی تعلیم کے نظام میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ بچوں سے انتہائی محبت کی جائے۔ ہر بچہ قابلِ احترام ہے۔ اُسے دنیا کے اہم سے اہم کام کو انجام دینے کے قابل تصور کیا جائے۔ اس کی جبلتوں، صلاحیتوں اور میلانوں کی قدر کی جائے۔ بچوں کے لئے ایسا ماحول ترتیب دیا جائے جس میں بچے اپنے جبلی رجحانات اور شوق کے مطابق مصروف رہ کر اپنی فطری بلندی تک نشو و نما پائیں۔ آپ نے فرمایا کہ

نئی تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ ہر بچہ کو مقررہ معاشرے کے واجبات سمجھنے کے قابل بنا دیا جائے۔ اُس کے لئے اپنے معاشرے کی عزت کرنے کے اسباب مہیا کر دیئے جائیں۔ اُسے اپنی تہذیب اور کلچر سے محبت کرنے کا عادی بنا دیا جائے۔ مگر ایسی محبت جس کا مقصد معاشرے کی اصلاح اور ارتقاء ہو۔ ڈیڑھ صدی کی غلامی کی وجہ سے جو اپنوں سے بیگانگی پیدا ہو گئی ہے اُس کا ازالہ ضروری ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز

نہیں کہ ہم خود پسند بن بیٹھیں۔ غیروں سے بیزار ہو جائیں۔ دنیا کے امن میں خلل انداز ہوں۔ اپنوں سے محبت کا تقاضا یہ نہیں کہ اوروں سے نفرت کرنا سیکھیں۔

"تخلیقی تعلیم" کی اہمیت بتاتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ نئی تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ بچوں میں تخلیقی قوتیں بیدار کرے۔ ہماری تعلیم تخلیقی تعلیم ہونی چاہیئے۔ دورِ جدید کے مدرسہ میں استاد اور طلبہ ہنسی خوشی سے وقت گذارتے ہیں۔ اُن کی ہر مصروفیت با معنی ہوتی ہے۔ اور ہر معنی کی مزید تشریح لفظ تخلیق سے ہو سکتی ہے۔ اُستادوں کو قومی تعمیر کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے آپ نے فرمایا:۔

"اس متناقص دنیا میں ہمیں بڑے شعور سے قدم اُٹھانا چاہیئے۔ ہماری ذمہ داریاں بہت اہم ہیں۔ آپ فرمائیں گے۔ آخر یہ کیوں؟ ہم مدرسین پر یہ بوجھ کیوں ڈالا جائے؟ اس لئے کہ آنے والی نسلیں ہم سے بہت کچھ سیکھنے والی ہیں۔ ہمارے عیوب اور ہماری خوبیاں آنے والی نسلوں کی بُرائیاں اور بھلائیاں بن جائیں گی۔ مَیں جب اپنے پیشہ کی ذمہ داریوں پر نگاہ ڈالتا ہوں تو معاً یہ خیال آتا ہے کہ اتنا بڑا بوجھ ہمارے ناتواں کاندھے کیونکر اُٹھا سکیں گے۔ سوائے اس کے کہ فضلِ ربی ہمارے شاملِ حال ہو اور ہم آج ہی سے یہ ارادہ کرلیں کہ ہماری زندگیاں نہایت یکسوئی کے ساتھ آنے والی نسلوں کے لئے وقف کردی گئی ہیں۔"

مذہبی تعلیم کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ

"میرے نزدیک مذہب کی اقدار صحیح اخلاقی اقدار ہیں۔ جن میں راستبازی۔ راست گوئی۔ رحم دلی۔ ہمدردی۔ تلاش وجستجو بہت اہم رتبہ رکھتی ہیں۔"

سماجی تعلیم کے متعلق آپ نے فرمایا کہ

"ہمارے بچوں میں اپنی ذات کے مفاد کو جماعت یا قوم کے مفاد کے مقابلہ میں قربان کرنے کا جذبہ ضرور پیدا کرنا چاہیئے۔ جس قوم کے افراد میں یہ ایثار

نہ ہو تو وہ قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ نئی تعلیم کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان چھوٹے چھوٹے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایسی محبت کی دنیا بسائے جس کی وسعتوں میں نوعِ انسانی سما جائے۔"

جناب بشیر ہاشمی صاحب کے خطبۂ صدارت کے بعد مسٹر انیس الدین انصاری جنرل سیکرٹری نیو ایجوکیشن فیلوشپ صوبۂ مغربی پنجاب نے نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی مختصر رپورٹ پیش کی۔ رپورٹ کے بعد سیکرٹری نے جناب ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب و جناب بشیر احمد صاحب ہاشمی اور تمام شرکائے کانفرنس کا شکریہ ادا کیا۔ ازاں بعد جلسہ برخاست ہوا۔ کانفرنس میں ممبران نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے علاوہ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے دیگر اصحاب کی کثیر تعداد شریک تھی۔

نمائش کا افتتاح

افتتاحی اجلاس کے بعد جناب بشیر احمد صاحب ہاشمی نے تعلیمی نمائش کا افتتاح فرمایا۔ رسمِ افتتاح کے بعد صرف ممبران نیو ایجوکیشن فیلوشپ جن کی تعداد تقریباً چار سو تھی عصرانہ پر جمع ہوئے تعلیمی کارکنان کا یہ مجمع نہایت دلچسپ تھا۔ اور کانفرنس کی کامیاب افتتاح پر ہر شخص مسرور تھا۔ چھ بجے شب سنٹرل ماڈل اسکول کے ڈریمیٹک کلب نے ایک ڈرامہ بعنوان "کوڑھی" نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے ممبران کے لئے اسٹیج کیا۔ ڈرامہ کا مقصد ناظرین پر یہ واضح کرنا تھا کہ بہترین نیکی خدمتِ خلق ہے۔

۲۹۔ جنوری

تعلیمی کانفرنس کا دوسرا اجلاس بروز شنبہ بتاریخ ۲۹ر جنوری ۱۹۴۹ء زیرِ صدارت جناب احمد دین صاحب اظہر سیکرٹری فنانس ڈیپارٹمنٹ حکومت مغربی

پنجاب منعقد ہوا۔ اس نشست میں تعلیم بالغان کا موضوع زیر بحث آیا۔ جلسہ کا افتتاح تلاوت قرآن مجید سے کیا گیا۔ شیخ ممتاز الدین صاحب پروفیسر انجنیئرنگ کالج مغلپورہ لاہور و سابق سیکرٹری انجمن تعلیم بالغان دہلی نے تعلیم بالغان پر تقریر کرتے ہوئے پاکستان میں تعلیم بالغان کو پھیلانے کے لئے تجاویز بیان فرمائیں۔ اُنہوں نے فرمایا حکومت کو تعلیم بالغان کے لئے اسکولوں اور کالجوں کی طرح کے ادارے قائم کرنا چاہئیں۔ غیر سرکاری و نیم سرکاری جماعتوں کو بھی یہ کام جاری کرنا چاہیئے۔ مثلاً میونسپلٹیاں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ۔ یونیورسٹی وغیرہ۔ کالج و اسکول کے اساتذہ و طلبہ بھی کچھ وقت تعلیم بالغان کے لئے دے کر مفید قومی خدمت کر سکتے ہیں۔ ہر صوبہ و ضلع میں تعلیم بالغان کے لئے ایک مرکزی جماعت کی ضرورت ہے جو تعلیم بالغان کی تنظیم و رہنمائی کرے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ تعلیم بالغان کے کارکنوں اور استادوں کے لئے ایک ٹریننگ کلاس کھولی جائے جس کے لئے بہترین جگہ سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور ہے۔ تعلیم بالغان کا مقصد بیان فرماتے ہوئے یہ واضح کیا کہ تعلیم بالغان کا مقصد صرف خواندہ بنانا نہیں ہے بلکہ اچھا شہری بنانا ہے۔ تاکہ ہر بالغ خواہ وہ خواندہ ہو یا ناخواندہ تعلیم حاصل کر کے اس قسم کی زندگی گزارے کہ وہ اپنی ذات اور معاشرے کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہو۔

بی۔ ایل۔ رلیا رام صاحب سیکرٹری وائی۔ ایم۔ سی۔ اے نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں یہ کوشش جاری ہے کہ لاہور میں تعلیم بالغان کو فروغ دیا جائے۔ اس سلسلہ میں وقتاً فوقتاً تقریروں اور مباحثوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ تعلیم بالغان کا مقصد بہتر روزی کمانے کے قابل بنانا۔ اچھا شہری بنانا اور اخلاق کو بلند کرنا ہے۔ بالغوں کو خواندہ بنانا تعلیم نہیں ہے۔ البتہ خواندگی ذریعہ تعلیم ضرور ہے۔ بالغان کی تعلیم کے لئے ایسی کتابیں تیار کی جائیں ؟

دلچسپ اور مفید ہوں - ریڈیو - فلم - تقاریر اور بالغان کی مخصوص اخبارات بالغان کی تعلیم کے لئے استعمال کئے جائیں -

خواجہ عبدالکریم صاحب سپرنٹنڈنٹ تعلیم کارپوریشن لاہور نے تعلیم بالغان پر اپنے مضمون میں فرمایا کہ ہماری سوسائٹی میں غلط قسم کی تعلیم مروج ہے ایسی تعلیم جس کا مقصد سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہے - تعلیم بالغان میں یہ نقص پیدا نہ ہونے دینا چاہیئے -

ثناء اللہ صاحب ڈپٹی انسپکٹر مدارس لاہور نے تعلیم بالغان میں اُستاد اور نصاب تعلیم کے مسائل پر ایک مضمون پڑھ کر سُنایا - انہوں نے فرمایا کہ تعلیم بالغان کے اساتذہ کی ٹریننگ اُسی طرح باقاعدگی سے ہو جس طرح نارمل اسکولوں میں پرائمری یا مڈل اسکولوں کے اساتذہ کی ٹریننگ ہوتی ہے - تعلیم بالغان کے طریق تدریس میں بالغوں کے ذہن اور ضروریاتِ زندگی کا خیال رکھا جانا ضروری ہے -

صاحب صدر جناب احمد دین اظہر صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ تعلیم بالغان میں خواندگی کو اہمیت اِس لئے حاصل ہے کہ گو صرف خواندگی تعلیم نہیں ہے لیکن تعلیم کا ایک اچھا ذریعہ ضرور ہے - کتابوں میں صدیوں کا جمع کردہ انسان کے تجربات کا بہترین ذخیرۂ معلومات محفوظ ہے - اِن معلومات سے استفادہ کا بہترین ذریعہ خواندگی ہے - تاکہ کتابوں سے مفید معلومات حاصل ہوسکیں - صاحب موصوف نے فرمایا کہ پاکستان میں تعلیم کو نہایت وسیع پیمانہ پر جاری ہونا چاہیئے - اب وقت آگیا کہ ہماری کُل آبادی اعلےٰ سے اعلےٰ تعلیم سے مستفید ہو - پاکستان کے قیام سے پہلے ہمارے نظامِ تعلیم میں زبان کا مسئلہ نہایت اہم تھا - انگریزی زبان ذریعہ تعلیم تھی - جس کی وجہ سے ہمارے بچوں کا بہت وقت ضائع ہوتا تھا - لہذا اب تعلیمی نظام کی اصلاح کی جائے - طریقۂ تعلیم اور نصاب تعلیم میں ترمیم کی جائے تاکہ نظامِ تعلیم کی تبدیلی سے ترقیِ تعلیم کی رفتار تیز ہو اور اچھے تعلیم یافتہ اصحاب اپنے غریب جاہل برادرانِ قوم

کی تعلیم کی طرف بھی متوجہ ہوں -

تیسرا اجلاس بوقت ۲ بجے بعد نماز ظہر بصدارت جناب ڈاکٹر صمد شاہ صاحب نائب ناظم شعبۂ صحتِ عامہ حکومت مغربی پنجاب شروع ہُوا - اس اجلاس کا موضوع بحث تعلیم صحت جسمانی تھا - تلاوتِ کلام مجید کے بعد ڈاکٹر محمد موسےٰ صاحب نے اپنا مقالہ بعنوان "اسکول کے بچوں کی غذا" پڑھا - آپ نے نہایت مؤثر طریق سے سامعین کو جن کی بڑی تعداد اساتذہ پر مشتمل تھی یہ بات بتائی کہ ہمارے بچوں کے لئے مدرسہ کے اوقات میں کھانا مہیا کرنا نہایت ضروری ہے - خصوصاً موسم سرما میں جب کہ بچے دس بجے سے چار بجے تک مدرسہ میں رہتے ہیں - اِس کے علاوہ بالغ کے مقابلہ میں بچے اپنی توانائی سرعت سے خرچ کرتے ہیں - اِس لئے اِس نقصان کی تلافی اِس طرح ہوسکتی ہے کہ بچہ کو بالغ کے مقابلہ میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد خوراک مہیا کی جائے - اور خصوصاً ایسی خوراک جس میں حیاتین کی بہتات ہو - اور اِس نقطۂ نگاہ سے دودھ بہترین غذا ہے - بشرطیکہ اُسے نصف گھنٹہ تک اُبال لیا گیا ہو - اِس ضمن میں انہوں نے سنٹرل ماڈل سکول لاہور کی مثال دی - جہاں اسکول کے اکثر بچے اپنے اپنے گھر سے ناشتہ اپنے ساتھ لاتے ہیں - اور تفریح کی وقفہ میں سب مل کر کھاتے ہیں - اِس کے بعد جناب ڈاکٹر ایوب احمد خاں صاحب پروفیسر میڈیکل کالج لاہور نے اپنا مقالہ بعنوان "طبّی تعلیم میں اصلاح کی ضرورت" بزبان انگریزی پڑھا - آپ نے فرمایا کہ ہمارے ملک میں ڈاکٹروں کی بے حد کمی ہے - موجودہ میڈیکل کالج اور اُس کے طلبہ قوم کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتے - اِس کے لئے نظامِ تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت ہے - آپ نے تجویز کیا کہ قوم کی صحتِ جسمانی بلند معیار کی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ اصول حفظانِ صحت کی تعلیم پہلے درجہ سے آٹھویں درجہ تک لازمی قرار دی جائے - نویں اور دسویں جماعت میں علم

حیاتیات کی تعلیم داخل نصاب کی جائے۔ اور طلبہ میٹرک کلاس سے ہی یہ تصفیہ کر لیں کہ انہیں میڈیکل کالج میں داخل ہونا ہے یا نہیں۔ میڈیکل کالج میں میٹرک کے بعد ہی طلبہ داخل کر لئے جائیں۔ اور اس کالج میں بھی دو اقسام کے طلبہ کی تعلیم ہو۔ درجہ اول کے طلبہ تو مخصوص شعبوں میں خاص مہارت حاصل کریں۔ اور درجہ دوم کے طلبہ کم مدت میں کورس ختم کر لیں تاکہ جلد اور کم مصارف میں ملک میں زیادہ ڈاکٹر پیدا ہو سکیں۔ میڈیکل کالج کے طلبہ کے لئے اخلاقی تعلیم اور انسانی ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کے لئے خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر ایوب احمد خاں صاحب کے مقالہ کے بعد جناب ڈاکٹر پیرزادہ محمد اسلم پروفیسر میڈیکل کالج لاہور نے اپنا مقالہ بعنوان "پاکستان میں طبی تعلیم کا مسئلہ" پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مغربی پنجاب میں صحت عامہ کے اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا کہ مغربی پنجاب کی موجودہ آبادی تقریباً دو کروڑ ہے۔ اور ڈاکٹروں کی تعداد محض دو ہزار ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ دس ہزار نفوس کے لئے صرف ایک ڈاکٹر ہے جو بھور کمیٹی کی سفارشات کے لحاظ سے بیس حصے کم ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً سب ڈاکٹر بڑے بڑے شہروں میں ہیں۔ اور گاؤں والوں کی صحت کی طرف کچھ توجہ نہیں دی جاتی۔ اس کے علاوہ مغربی پنجاب میں لیڈی ڈاکٹروں کی کل تعداد صرف ۱۲۰ ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ دو لاکھ نفوس کی آبادی کے لئے صرف ایک لیڈی ڈاکٹر ہے۔ پیرزادہ صاحب نے مزید فرمایا کہ اگر ہمارا مقصود قومی صحت کو برقرار رکھنا ہے تو ہمیں آئندہ پندرہ سال کے عرصہ میں کم از کم بیس ہزار ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ اور اس مقصد کے لئے ہمیں فی الفور بیس میڈیکل کالجوں کا اجرا کرنا چاہیئے۔ اس کے بعد جناب نذیر احمد صاحب ہیڈ ماسٹر نارمل سکول کمالیہ نے اپنا مقالہ بعنوان "تعلیم صحت جسمانی کی نئی تنظیم" پڑھا۔ جس میں تعلیم صحت جسمانی کے اُستادوں کی مزید ٹریننگ کی ضرورت کو ظاہر فرمایا۔ آپ نے

تجویز کیا کہ اُن کی ٹریننگ میں فوجی ڈرل - ہوائی حملہ سے تحفظ کی تدابیر اور بندوق سے صحیح نشانہ لگانا لازمی قرار دیا جائے - استادوں کی ٹریننگ کے بعد استادوں کے ذریعے دیہات اور شہر کے مختلف محلوں میں بھی عوام کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے - اور اِس طرح ملک کی پوری آبادی کو سول ڈیفنس کے لئے تیار کیا جا سکتا ہے - پولیس کے محکمہ اور فوجی عہدہ داران سے بھی اس اسکیم میں ضروری امداد لی جا سکتی ہے -

تعلیمی مشاعرہ ساڑھے چھ بجے شام شروع ہوا - مشاعرہ کی صدارت جناب عبدالمجید سالک صاحب نے فرمائی - مختلف کالج و اسکولوں کے طلبہ نے عنوان "تعلیم" پر نظمیں پڑھیں - لئیق احمد متعلم جماعت دہم سنٹرل ماڈل سکول لاہور اور مسٹر محمد رزّاق متعلم نارمل اسکول کمالیہ کو اسکول کے مقابلہ میں علی الترتیب اول و دوم انعام دیا گیا - کالج کے طلبہ میں مسٹر حبیب الرحمٰن متعلم بی - ٹی کلاس سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور اور مسٹر عبدالغنیٰ متعلم بی - ٹی کلاس سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو علی الترتیب اوّل و دوم انعام دیا گیا -

۳۰ - جنوری

کانفرنس کی سبجیکٹس کمیٹی (مجلس مباحث) کا اجلاس بروز یک شنبہ بتاریخ ۳۰ جنوری بوقت ۱۰ بجے دن زیر صدارت محترمہ ڈاکٹر مس کے - بی فیروزالدین ڈپٹی ڈائرکٹرس صوبہ مغربی پنجاب شروع ہوا - اور چند ریزولیوشن کھلے اجلاس میں پیش کئے جانے کے لئے منظور ہوئے - چوتھا اجلاس برائے ابتدائی و ثانوی تعلیم زیر صدارت جناب ہادی حسین صاحب پی - اے - ایس - کمشنر راولپنڈی ڈویژن گیارہ بجے منعقد ہوا - حسب معمول تلاوت قرآن مجید کے بعد مولوی محمد یعقوب خاں صاحب ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی اسکول لاہور نے "تعلیم میں آزادی" کے عنوان پر ایک فاضلانہ تقریر کی - آپ نے فرمایا کہ ہمیں جلد از جلد تدریس کے متعلق فرسودہ خیالات سے نجات حاصل کر لینی چاہیئے - اور یہ بے حد ضروری ہے کہ ہم آزادی کے عنصر کو تعلیم کے ضمن میں اہم خیال

کریں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ تعلیم میں آزادی و پابندی کس تناسب سے ہونا چاہیئے۔ آپ نے اس قسم کی آزادی سے اختلاف فرمایا جیسی کہ میڈم مانٹےسری بچوں کو دینا چاہتی ہیں۔ اور جس میں استاد پس پردہ چھپ کر بچوں کے ردِّ عمل اور حرکات وسکنات کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ آپ نے کہا کہ اس قسم کی افراط آزادی ہمارے منتہائے تعلیم کے منافی ہے۔ انہوں نے مزید فرمایا کہ تعلیم میں آزادی ہو۔ لیکن اس قدر نہیں کہ تعلیم بے معنی ہو کر رہ جائے۔ مفرط آزادی سے فائدہ کی بجائے نقصان کا زیادہ احتمال ہوتا ہے۔ صاحب موصوف پُرانی طرزِ تعلیم کے بھی خلاف ہیں۔ وہ پُرانی تعلیم جس میں جسمانی ایذا اور تشدد کو بہت دخل ہے بے معنی اور لغو ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ بچوں میں فطرت نے بڑے اہم جوہر پوشیدہ کئے ہوئے ہیں۔ اور اصلی تعلیم کا مقصد ان جواہر اور صلاحیت کو اجاگر کرنا ہے لیکن وہ تب ہی نمایاں ہو سکتے ہیں۔ جبکہ بچے کے رجحانات اور میلانات کا نفسیاتی مطالعہ کیا جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ امتحان سرے سے ہی اُڑا دیا جائے۔ کیونکہ آپ کے نزدیک امتحان ہی ہیں جو کہ بچے کی صلاحیتوں کو برباد کرنے کی ذمہ دار ہے۔ اسی طرح کتابوں کا وجود بھی اُن کے نزدیک ناقابلِ برداشت ہے۔ بچوں کی تعلیم کتابوں کے ذریعے خصوصاً مجوزہ کتابوں سے جن کا جماعتوں میں جبراً دخل ہے بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ تعلیم کے ذرائع ایسے ہونا چاہئیں جن سے بچہ تعلیم میں دلچسپی لے۔

انیس الدین صاحب انصاری نے اپنے مضمون بعنوان "بچوں کے کلب" میں بتایا کہ اسکول کے بعد بچوں کو تفریحی مشاغل میں مصروف رکھنے کے لئے محلوں میں کسی ذمہ دار صاحب یا اُستاد کی نگرانی میں کلب کھولے جائیں۔ ان کلبوں میں صنعتی مشاغل۔ تفریحی دستی مشاغل کھیلوں اور علمی مباحث وغیرہ کا انتظام ہو سکتا ہے۔ کلب میں دلچسپ لائبریری۔ ریڈنگ روم۔ نقشے۔ چارٹ ماڈل وغیرہ کا انتظام بھی ضروری ہے۔ اگر کلبوں کو دلچسپ اور تعلیمی بنایا جائے۔ تو وہ بہت مفید

ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کلبوں کو کامیاب بنانے میں والدین کا اشتراک ضروری ہے ۔

زاں بعد جناب عبدالحئی صاحب علوی نے اپنا مقالہ بعنوان " نوزائیدوں کے کردار کا مطالعہ" جس میں انہوں نے امریکہ کے مشہور ماہر نفسیات پروفیسر واٹسن کے تجربات کی روشنی میں بچے کی زندگی کا گہرا مطالعہ پیش کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ حالات اور ماحول کا ردِّ عمل بچے کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہے ۔ جو بہت اہم ہے ۔

آخر میں محمود مرزا صاحب نے اپنا مقالہ بعنوان " اسکول میں تجارت وصنعت سے عام دلچسپی کیونکر پیدا کی جاسکتی ہے" پڑھا ۔ اور انہوں نے ظاہر فرمایا کہ طلبہ میں تجارت وصنعت سے دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ہمیں حضور اکرم صلعم اور ان بزرگانِ دین کی سیرت کا علم بچوں کو دینا چاہیئے ۔ جنہوں نے تجارت کو بہتر ذریعہ معاش قرار دیا۔ آپ نے مدارس میں صنعتی مشاغل کے اجرا پر زور دیا اور بتایا کہ طلبہ کی مصنوعات کی نمائش بچوں کی تیار کردہ اشیاء کی فروخت مدارس میں اصولِ امداد باہمی پر کتابوں اور اسٹیشنری کی دوکان جس میں طلبہ کام کریں اور جہاں ان کو تجارتی تجربہ حاصل ہو۔ اس سلسلے میں بہت مفید ہونگے ۔ اِس کے بعد صاحب صدر نے مقالہ نویسوں اور سامعین کا شکریہ ادا کرکے جلسہ برخاست کیا ۔

پانچواں اجلاس متعلقہ تربیت اساتذہ وعام تعلیمی مسائل بعد نماز ظہر بوقت ۲ بجے دن زیر صدارت جناب پروفیسر محمدؐ ناظر صاحب پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور منعقد ہؤا ۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد محترمہ بیگم شاہ نواز صاحبہ نے ایک تقریر فرمائی جس میں ہر ذمہ دار شخص کے لئے ایجوکیشنل کانفرنسوں میں دلچسپی لینا فرض ظاہر کیا اور فرمایا کہ ایسے طلبہ وطالبات کی فوج ملک میں انتشار پیدا کرنے کا باعث ہوگی ۔ جو صرف یونیورسٹی کی ڈگریاں لینے ہی کو اپنا نصب العین قرار دیں۔ آپ نے فرمایا۔ مزید تعلیمی رپورٹیں تیار کرنے میں وقت برباد نہ کرنا چاہیئے ۔ بلکہ اصل کام میں مصروف ہوجانا چاہیئے ۔ ہمارے ملک کے لئے نرسری اور پرائمری اسکولوں کی ضرورت ہے ۔ مدرسہ سے ملحق زراعتی مراکز بھی چاہیئں ۔ تیسری جماعت کے بعد ہی طلبہ کی توجہ زراعت کی طرف مبذول کرادینی

ارہ سال کی عمر میں طلبہ کو ثانوی تعلیم کے لئے منتخب کرنا چاہیئے۔ زراعتی تعلیم
ت دی جائے کہ وہ زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کریں۔ لڑکیوں کو یہ
ئے کہ وہ کس طرح دستکاری میں ترقی کر سکتی ہیں یا کس طرح وہ زراعت میں
مدد کر سکتی ہیں۔ شہری حلقوں کے لئے آٹھویں جماعت کے بعد صنعتی تعلیم
ے۔ تاکہ بچے صنعتی کاموں میں تربیت یافتہ مزدوروں کی حیثیت سے کام
اس طرح کارخانوں کی قوت کارکردگی میں اضافہ ہو۔ قوم کی اکثریت تو انڈسٹریل
ں داخل ہو۔ البتہ گیارہ سال کی عمر پہ چیدہ طلبہ و طالبات کو میٹرکیولیشن کی
ئے داخل کیا جائے۔ میٹرکیولیشن کے بعد تین سال کا ڈگری کورس
۔ اس طرح ملک کے لئے ایک نیا تعلیمی نظام تیار ہونا چاہیئے۔ جو تمام طبقوں
روں ثابت ہو۔ تاکہ ہماری قوم میں ایسی آبادی نہ رہے جو سوسائیٹی کے لئے محض
ہوتی ہے۔ محترمہ بیگم صاحبہ نے تین اقسام کی تعلیم پر خاص طور پر زور دیا۔
سکری اور بین الاقوامی اتحاد کی تعلیم۔

ں کے بعد جناب سید شبیر محمد صاحب ترمذی ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات صوبہ مغربی
، زیرِ عنوان " ادارہ تعلیمی تجربات کے قیام کی ضرورت" تقریر کی۔ آپ نے
کا ہیں ایسے کارخانے ہیں جہاں ہر قسم کی سیرتیں بنتی ہیں۔ معلمین ! ان کارخانوں
الی ممتاز ہستیاں ہیں۔ معاشرے اور حکومت کو قوم کے معماروں کے لئے
تیں مہیا کرنی چاہیئں۔ تاکہ وہ تندہی سے اپنے فرائض منصبی میں مشغول رہ
ں میں سب سے پہلے معلمین کی تنخواہ کا مسئلہ ہے۔ جب تک تنخواہ معقول نہ ہوگی
ے سے مصروف کار نہیں رہ سکتے۔ ہمارے ملک میں انسانی تعلیم و تربیت کی
کے لئے کوئی ادارہ نہیں۔ یہاں اعلیٰ پیمانہ پر فطری رجحانات کا اندازہ کرنے
یں مدد و معاون ہونے والے طریقوں کو جانچنے۔ اور اساتذہ کی رہنمائی کے

لئے تجربہ گاہیں قائم ہونا چاہئیں۔ یہ تجربہ گاہیں ہماری قوم کی ضروریات اور ہمارے ماحول کے تقاضے پورے کریں۔ مغربی نظام تعلیم کی کورانہ تقلید کی ضرورت نہیں۔ جسم۔ دماغ۔ دل روح جب تک سب کا لحاظ ہماری تعلیم میں نہ ہو اچھے نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ تجربہ گاہوں میں ان تمام پہلوؤں کی طرف توجہ دینا ضروری ہوگا۔ اس طرح جو نظام تعلیم ہم جاری کریں گے وہ رسول کریم صلعم کی مکمل پیروی پر مشتمل ہونا لازمی ہوگا۔

اس تقریر کے بعد جناب میاں بشیر احمد صاحب مدیر "ہمایوں" نے تقریر فرمائی آپ کی تقریر کا عنوان "اردو میں تعلیم کی اہمیت" تھا۔ آپ نے فرمایا کہ تقسیم ہندوستان کے بعد اردو زبان کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ ہندو اپنی تہذیب کو قائم رکھنے کے خواہش مند تھے مسلمان اپنی تہذیب برقرار رکھنا چاہتے تھے کشمکش میں اردو ہندی کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اسی قسم کے مسائل کی پیچیدگی کو دیکھتے ہوئے آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ ہم مسلمانوں کے لئے اپنی زبان کا قائم رکھنا ضروری تھا تاکہ ہماری اپنی تہذیب قائم رہ سکے۔ اردو کی اہمیت کا یہی پس منظر ہے۔ ہماری قومی زبان اردو ہے اور پنجاب اس کی ترقی میں سب سے زیادہ حصہ لے رہا ہے۔ پنجاب کو مہذب صوبہ بنانے میں سب سے زیادہ حصہ اردو کا ہے۔ اس لئے اس زبان کی خدمت کرنا ہم پر فرض ہے پاکستان کی وحدت مذہب اور مشترک قومی زبان پر مبنی ہے۔ اردو تمام مختلف صوبوں کے باشندوں کو ایک مرکز اور ایک خیال پر جمع کر سکتی ہے۔ اُردو کی صحیح تعلیم کی ضرورت ہے۔ تاکہ سارے پاکستان کی زبان کا مسئلہ حل ہو سکے۔ اس میں پنجاب کو سب سے زیادہ حصہ لینا ہے اور لے بھی رہا ہے۔ کوشش یہ ہونا چاہیئے کہ تمام مضامین کی تعلیم اُردو میں ہو۔ اس سلسلہ میں حکومت۔ یونیورسٹی اور پبلک اداروں سب ہی کو کام کرنا ہے اردو کی ابتدا لاہور ہی سے ہوئی ہے۔ اس لئے اُردو کو اپنانا پنجابیوں کے لئے بہت آسان ہے۔ معلمین کی قابلیت کو بھی بڑھانا چاہیئے۔ تاکہ اردو کی صحیح تعلیم دی جا سکے۔" اُردو بو

کی تحریک اسکولوں میں شروع ہونا چاہیئے ۔ اس کے بعد مسٹر ایم ۔ عرفان ہیڈماسٹر رنگ محل مشن اسکول نے "امریکہ میں تعلیم" کے عنوان سے اپنے ذاتی مشاہدات کو بیان فرمایا کسی ملک کے تہذیب و تمدن کا اندازہ اُس کے طرزِ تعلیم سے بخوبی کیا جا سکتا ہے ۔ امریکہ کا نظامِ تعلیم بہت ترقی یافتہ ہے ۔ امریکی طلبا ماضی کے ذریعے حال اور مستقبل کے لئے سبق سیکھتے ہیں ۔ وہاں کے معلمین اپنے شاگردوں میں مناسب تنقید کا مادہ پیدا کرتے ہیں ۔ پرائمری اسکول کے طلبہ بھی تنقید کر سکتے ہیں ۔ امریکہ میں اٹھارہ سال کی عمر تک تعلیم جبری اور مفت ہے ۔ امریکہ کے بعض حصوں میں اٹھارہ سال کی بجائے ۲۲ سال تک جبری تعلیم کی کوشش جاری ہے ۔ طلبہ کے لئے طبی معائنہ اور علاج بھی مفت ہے ۔ مفت تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ تعلیمی فیس ۔ کرایہ آمدورفت ۔ کھانا وغیرہ سب مفت ہوتا ہے ۔ یہ بھی کوشش کی جارہی ہے ۔ کہ کالج تک کی تعلیم مفت ہو جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں تعلیم پر حکومت بہت خرچ کر رہی ہے ۔ ہمیں اپنی تعلیم کا معیار بہت بلند کرنا چاہیئے ۔ کیونکہ تعلیم کے ذریعے ہی ہمارا معیارِ زندگی بلند ہو سکتا ہے ۔ اس کے بعد جلسہ برخاست ہُوا ۔ کانفرنس کی کُل کارروائی اُردو میں ہوئی ۔ جس کو شرکائے کانفرنس نے بہت پسند فرمایا ۔

خطبۂ اِستقبالیہ

ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب

میرا خوش گوار فرض ہے کہ اس کانفرنس کے مہتممین کی طرف سے مندوبوں اور مہمانوں کا خیر مقدم کروں۔ مَیں اربابِ علم وفضل کے اِس منتخب مجمع کو دِل سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ یہاں ہم اُن تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ جن کا صحیح حل دریافت کئے بغیر ہماری آنے والی نسلوں کی فلاح وبہبود ممکن نہیں۔ اِس قسم کے اہم اِجلاس کا انعقاد ایک مبارک فال ہے۔ بلکہ اِس سے بڑھ کر یہ کہنا چاہیئے کہ ماہرانِ تعلیم اور دوسرے اہلِ بصیرت اصحاب کا یہ اجتماع ایک شدید قومی ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اس کانفرنس کی تدبیر وحکمت کی روشنی میں ہم ایسے فیصلوں تک پہنچیں گے جن سے مفید اور دُور رس نتائج مترتب ہوں گے۔ اور ہم اُس مستقبل کی تعمیر میں مناسب حصہ لے سکیں گے۔ جس کی طرف اس وقت قوم کی نگاہیں اُٹھی ہوئی ہیں۔

خواتین اور حضرات! رائج الوقت نظامِ تعلیم کی خرابیوں کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے۔ اِس وقت مَیں اس پُرانے قصّے کو نہیں چھیڑوں گا۔ مرض کی علامات سب پر واضح ہو چکی ہیں۔ ضرورت اگر ہے تو تشخیص کی۔ اور اِس سے زیادہ علاج کی۔ یہ نظامِ تعلیم

ہمارے دورِ غلامی میں پیدا ہوُا۔ اور اِسی دَور کی مصلحتوں اور ضرورتوں نے اسے زندہ رکھا۔ انگریزی عہد میں جب ہمیں صوبائی خود اختیاری حاصل ہوئی تو محکمۂ تعلیم کا انصرام بظاہر ہمارے اپنے وزرا کے ہاتھوں میں دے دیا گیا لیکن اِس کے باوجود ہماری تعلیمی زندگی کے ادنےٰ پہلوؤں میں بھی کسی قومی نصب العین کی جھلک پیدا نہ ہوسکی۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ حالاتِ گردوپیش کے کڑے سانچے میں سرے سے یہ گنجائش ہی نہ تھی۔ کہ اس کے ذریعے سے کوئی زندہ رہنے والی، یا زندہ کرنے والی جدّت پیدا ہوسکتی۔ اس سانچے میں صرف وہ دِل و دماغ ڈھل سکتے تھے۔ جو غالب قوم کی ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔ لیکن خیر، جو ہوچکا سو ہوچکا۔ اِس وقت ہمارا سروکار ماضی سے نہیں، حال اور مستقبل سے ہے۔ اب قدرت نے ہماری زمامِ حیات خود ہمارے ہاتھ میں دے دی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اب ہم اپنی زندگی کو کن نئی شاہراہوں پر ڈالتے ہیں۔ اور بالآخر کس منزل کو منزلِ مقصود بناتے ہیں۔ یہ وہ موقع ہے۔ جب ہمارا قومی شعور فکر و عمل کی دنیا میں اپنی حدود متعیّن کرنے کے لئے مضطرب ہے۔ آج ہم خود اپنی تقدیر کے معمار ہیں۔ اِس تعمیری کوشش میں خشتِ اول کی حیثیت تعلیم کو حاصل ہے۔ ہم یہ پہلی اینٹ اگر سیدھی رکھ سکے تو اپنی قومی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرسکیں گے۔ آپ سب خواتین و حضرات کا یہاں جمع ہونا فی الحقیقت تعلیم کی اِسی بنیادی اہمیت کا اعتراف ہے۔

سیاسی مسائل کے موضوع پر بے شک اختلافِ رائے کی گنجائش ہے۔ لیکن جس مسئلے میں کسی اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ وہ یہ ہے کہ ہماری موجودہ دنیا کے فاصلوں اور مسافتوں کو سائنس کی ایجادات جس سرعت سے نابود کررہی ہیں، اُس کے پیشِ نظر انسانی سرگرمی و ترقی کے کسی پہلو سے (خواہ اس کا ظہور کہیں بھی ہوتا ہو) آنکھیں بند کئے بیٹھے رہنا ناممکن ہوگیا ہے۔ یہ کرۂ ارض اپنی وسعتوں کے باوجود بڑی تیزی سے ایک ننھا سا گھروندا بنتا جارہا ہے۔ یہیں سے عالمگیر شہریت کا وہ تصور پیدا ہوتا ہے۔

جس کی ضرورت کا احساس تمام اہل الرائے طبقوں کو ہو چکا ہے۔ لیکن جس کو عملی صورت دینے کے لئے ابھی تک صحیح ذرائع ہمیں میسر نہیں ہو سکے۔ .U.N.O کی تنظیم اور اس کی مختلف کمیٹیوں کا قیام اِسی عالمگیر ضرورت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس عالمگیر ضرورت کے احساس کے باوجود .U.N.O اور اس کی کمیٹیوں کو اُس قوت اور کامیابی کا عشرِ عشیر بھی نصیب نہیں ہوا جس کی بظاہر توقع کی جا سکتی تھی۔ اِس ناکامی کے اسباب کیا ہیں ؟

میرے نزدیک اِس ناکامی کی کم از کم ایک وجہ یہ ہے کہ ہماری تعلیم' یہاں اور ہر کہیں' وقت کے تقاضوں کے ساتھ اپنے اندر مناسب تبدیلیاں پیدا نہیں کر سکی۔ آج جب ہماری نام نہاد تہذیب کے اصول و بنیاد تنقید کا موضوع بن گئے ہیں' ہمارے نظریۂ تعلیم کا حالاتِ وقت کے مطابق ڈھلنا اشد ضروری ہو گیا ہے۔ اگر اس کا خیال نہ کیا گیا تو آپ یہ عجیب و غریب نظارہ دیکھیں گے کہ زندگی اپنی تیزیٔ رفتار میں تعلیم کو بہت پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ مگر تعلیم تو زندگی کی رہنما ہے' پیرو نہیں ہے۔ اِس لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی دنیا میں گذشتہ صدی کے جامد اور فرسودہ تعلیمی خیالات کا بار و رہونا روز بروز ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ اب ہمیں تعلیم کے ایک نئے' زندہ اور تحرکی (dynamic) تصوّر کی ضرورت ہے کیونکہ کسی ایسے زندہ تصوّر کے علاوہ تعلیم کا ہر نظریہ قطعاً ناکارہ ثابت ہوگا اُن مسائل کی روز افزوں پیچیدگی کا خیال فرمائیے جن سے آج بدلے ہوئے حالات نے افراد و اقوام کو دوچار کر دیا ہے۔ اِس گتھی کے سلجھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں رہی کہ ہم تعلیم کے اغراض و مقاصد کا از سرِ نو جائزہ لیں اور عالمگیر تہذیب کی سمت مقرر کر کے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا رُخ اُسی طرف پھیر دیں۔

آج زمانے کے حالات کا صریح تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے اربابِ تعلیم سر جوڑ کر بیٹھیں اور ایک ایسا نظامِ تربیت ہمارے سامنے رکھ دیں جس کے بغیر تعلیم اپنے صحیح نصب العین

سے دور ہے، جس کے بغیر ہماری آئندہ نسلیں انسانیت کے صحیح مقام پر نہیں پہنچ سکتیں۔ میں خوش ہوں کہ آج مجھے ماہرانِ تعلیم کے ایک ایسے اجتماع سے خطاب کرنے کا فخر حاصل ہے جسے تاریخ انسانی کے اِس دَور کی اہمیت اور موقع کی نزاکت کا کما حقہٗ احساس ہے۔

میں نے جب اُس رسالے کے مضمون پر نگاہ دوڑائی جو نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے مرکزی دفتر کی طرف سے شائع ہُوا ہے تو یہ نکتہ میرے لئے خصوصیت سے دلچسپی کا باعث ہُوا۔ کہ اِس فیلوشپ کو "ایک عالمگیر تحریک" کی حیثیت دی گئی ہے۔ جس کا مطمحِ نظر یہ ہے۔ کہ لوگوں کو ایک ایسی تعلیم کی تلاش پر جمع کیا جائے جو موجودہ دَور کے حالات و مقتضیات سے زیادہ مناسبت رکھتی ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لئے حسب ذیل ذرائع تجویز کئے گئے ہیں :۔

(ا) خیالات کے مبادلہ و تشریح کی غرض سے مختلف ملکوں کے اربابِ تعلیم کو یک جا کرنا۔

(ب) ایک ایسے مرکز کا قیام جو اُن کے تجربات کی تدوین اور تبلیغ کا کام کر سکے۔

(ج) تجرباتی طور پر وہ جن نتائج تک پہنچیں، اُن کی خبر رسانی۔

اِس سلسلے میں جو بڑا مقصد بیان کیا گیا ہے، وہ یہ ہے: "ہر انسان میں جو قوتیں پوشیدہ ہیں اُن کو تعمیری کام میں لگانے کے لئے ذرائع کا اکتشاف" یہ بہت بڑا مقصد ہے جس کے لئے انسانی فطرت سے گہری واقفیت اور علوم و فنون پر وسیع دسترس کی ضرورت ہے اس موضوع پر ماہرین کے اس اجتماع کے سامنے مجھ جیسے عامی کا مشورہ بمنزلہ ایک جسارت کے ہوگا، میں نظریۂ تعلیم میں مین میخ نکالنے کا اہل نہیں ہوں۔ البتہ اس سوال کو بے حد اہم سمجھتا ہوں۔ کہ آج ہم تعلیم اور زندگی میں کس قسم کا ربط قائم کرتے ہیں۔ پس ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جسے تعلیم کے مسئلے سے دلچسپی ہے۔ میں اگر اس موقع پر کچھ عرض کرنے کی جراُت کروں تو شائد آپ میری گذارشات کو "چھوٹا منہ بڑی بات" کا مصداق نہیں

ٹھہرائیں گے۔

اس ضمن میں جو نکتہ سب سے زیادہ قابل غور ہے مذہب سے ہمارے نظام تعلیم کی بے نیازی ہے۔ اگر اس سے پہلے تعلیم اور مذہب کی علیحدگی کے کوئی وجوہ موجود بھی تھے تو کم از کم اب اس علیحدگی کے لئے قطعاً کوئی جواز نہیں رہا۔ یہ صورت حال اس ملک میں نظام اس لئے نافذ کی گئی تھی۔ کہ گذشتہ ہندوستان کی آبادی میں جو عناصر ملے جلے تھے اُن کے درمیان برطانوی راج غیر جانبدارانہ توازن قائم رکھ سکے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ یہ توازن فی الواقع قائم رہ سکا یا نہیں لیکن اتنا یقینی ہے کہ اس نظامِ تعلیم کے نفاذ سے کچھ کھلے ہوئے نتائج پیدا ہوئے۔ ان نتائج کو انگریزوں کے نافذ کردہ نظامِ تعلیم سے منطقی طور پر ظاہر ہونا ہی چاہیئے تھا اور حکمران طبقہ ان کے تدریجی ظہور سے کچھ ایسا بے خبر بھی نہ تھا۔ یہ نتائج کیا تھے؟ جس حد تک مسلمانوں کا تعلق ہے یہ نتائج ہمارے افکار دینیہ سے، ہماری تہذیب سے، بلکہ ہر اُس چیز سے جو ہمارے قومی شعور کو عزیز تھی، ہماری نوجوان نسل کی بیگانگت، اور کبھی کبھی بیزاری، کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ برطانوی اقتدار کے رخصت ہو جانے کے بعد اس اقتدار کے نافذ کئے ہوئے نظامِ تعلیم کو برقرار رکھنے کے حق میں کسی قسم کے جواز کا شائبہ تک نہیں رہا۔ اور اب وقت آگیا ہے کہ ہم بلا تاخیر مزید اسلامی نظریات کی روشنی میں اپنے نظامِ تعلیم کی تشکیلِ جدید کریں۔ زندگی کی وہ اخلاقی اور روحانی قدریں جن کے بغیر انسانی زندگی اپنے صحیح مفہوم سے بیگانہ رہتی ہے سب سے پہلے ہماری توجہ کی مستحق ہیں۔ ہماری آئندہ نسلیں جن پر ہماری قومی، بلکہ انسانی عظمت کا انحصار ہے، اب منتظر ہیں کہ ہم تعلیم کے ذریعے سے اُن میں یہ نئی روح پھونکیں۔ اس غرض سے ہمیں یہ صورت اختیار کرنی چاہیئے کہ دینی تعلیم کو نظامِ تعلیم کی مجموعی تصویر میں ایک واضح اور متعین جگہ دیں۔ میرا مطلب صرف یہی نہیں کہ دینیات کی حیثیت بطور ایک علیحدہ مضمون کے تسلیم کی جائے۔ میرے نزدیک اتنی ہی اہم یہ چیز ہے کہ ہمارے پورے

نظامِ تعلیم میں پاکیزگی اور خلوص اور احترام کی وہ رُوح کارفرما رہے جس کا پہلا اور آخری سرچشمہ مذہب ہے۔ جب تک یہ رُوح تاریخ و سائنس و فلسفہ و فنون کے پس منظر پہ سرگرمِ عمل نہ ہوگی، ہم ایک زندہ قوم، انسانی برادری کے معزز رُکن، نہیں بن سکیں گے۔

کبھی کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ تعلیم اور مذہب کے اس طرح یکجا ہونے سے نظامِ تعلیم بوجھل ہو جائے گا اور نصاب اس طوالت کا متحمل نہیں ہو سکے گا۔ مَیں یہ گذارش کروں گا کہ انسان اتنا ہی بوجھ اُٹھاتا ہے جتنا اس سے اُٹھ سکتا ہے۔ اور یہ بوجھ تو اُٹھانے کے قابل ہے۔ جو چیز ہمیں معیارِ انسانیت کے قریب لاتی ہے اُس سے طوالتِ نصاب کے بہانے منہ پھیرنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ بچے کا ذہن بہت زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ اگر اُس کو ابتدائی منزل میں مناسب طریقے پر نہیں ڈھالا جائے گا، تو وہ ہر قسم کے مناسب و نامناسب اثرات از خود قبول کرلے گا۔

میرا ایمان یہ ہے کہ اگر نیک نیتی اور خلوص سے کوشش کی جائے تو اصلاح احوال کے لئے بہت بڑا میدان موجود ہے؛ بشرطیکہ اُس طبقے کو سیرت و کردار کی تشکیل کا احساس پوری ذمہ داری سے ہو جائے۔ جس سے ہمارے طالب علموں کی تقدیر وابستہ ہے۔ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ یہ نہیں کہ اسکولوں اور کالجوں کے درسی نصاب میں اِس مضمون کے لیکچر اور کتابیں شامل کی جائیں۔ اس کے لئے صرف ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ درس گاہوں کے اندر اور باہر ایسی سرگرمیاں منظم طور پہ جاری کی جائیں جن سے بچوں اور نوجوانوں کے دلوں میں نیکی کی محبت اور بدی کی نفرت کا جذبہ پیدا ہو۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ "Activity School" کا یہ بنیادی تصور کہ "کرو اور سیکھو!" سیرت و کردار کے معاملے میں سب سے زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر "نیکی ایک عادت ہے" تو پھر یہ عادت پیدا کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہمارے پاس ہے: "عمل اور مکرّر عمل!" یہاں اس صدیوں پرانے مقولے کا دہرانا شاید برمحل ہو کہ "واعظ کے قول

میں وہ تاثیر نہیں ہوتی جو اُس کے عمل میں"

میرے اِن معروضات کے سلسلے میں ایک غلط فہمی کے پیدا ہو جانے کا احتمال ہے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ دورِ حاضر کے نوجوان کی تمام خامیاں نظامِ تعلیم سے او معلّمین کی جماعت ہی سے منسوب کی جا سکتی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس خرابی کے لئے اچھی خاصی ذمہ داری والدین پر بھی عائد ہوتی ہے۔ بچوں کی تعلیم سے والدین کی بے تعلقی کی ایک وجہ شائد یہ ہو کہ ہماری تعلیم آج کل جس ڈگر پر چل رہی ہے اس میں کسی نے کبھی یہ خیال ہی نہیں کیا کہ بچوں کی تعلیم و تربیت میں والدین کا تعاون نہ صرف حاصل کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کا حاصل کیا جانا اشد ضروری ہے۔ بہرحال اس کوتاہی کی وجہ کچھ بھی ہو۔ مَیں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی اِس کوشش کو قابل سمجھتا ہوں۔ اس کے پیشِ نظر محض ماہرینِ تعلیم کی باہمی شرکت کا رہی نہیں ہے بلکہ اِس کے مطمحِ نظر میں معلّمین اور والدین کا اشتراکِ عمل بھی شامل ہے۔ روشن خیال والدین اور اساتذہ کا یہ باہمد گر ربط بچوں کو فرسودہ اور ناکارہ رسوم کی زنجیروں سے رہائی دے کر اس قابل بنا دے گا۔ کہ وہ ملک کے ممتاز اور مقتدر شہریوں میں اپنا موزوں مقام حاصل کریں۔

خاتمۂ کلام پر مَیں دُعا کرتا ہوں کہ آپ کی یہ مساعی جو ملک و قوم اور بنی نو انسان کی خدمت کے بہترین جذبے پر مبنی ہیں نتیجہ خیز اور باروَر ثابت ہوں خدائے تعالےٰ آپ کی ہمتوں میں برکت دے اور اُس نورِ فراست سے آپ رہنمائی فرمائے جو بلند مقاصد کی خاطر جدّ و جہد کرنے والوں کی پیشانی پر ہمیشہ چمکتا ہے۔ آمین!

خطبہ صدارت

جناب بشیر احمد صاحب ہاشمی

میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے اس جلسے کے منتظمین کی خدمت میں شکرگزار ہوں۔
ہ انہوں نے مجھے یہاں آنے کی دعوت دی۔ مجھ ایسے آدمی کے ایسے بارونق جلسے
ی صدارت کے لئے آمادہ ہوجانا آسان کام نہیں۔ پھر بھی میں نے اس دعوت کو خوشی
ے منظور کرلیا۔ اس کی چند وجوہ ہیں۔ جو ایک حد تک خود غرضی پر مبنی ہیں۔ ایک وجہ
و یہ ہے کہ اس جلسے میں شرکت کی طفیل چند ہم پیشہ دوستوں سے ملاقات ہوجائے گی
ر کچھ نئے اصحاب سے تعارف ہوجائے گا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس موضوع پر
چھ بھلے برے چند خیالات جو بحیثیت ایک مدرس اور تعلیمی خدمت گزار کے، میرے
ذہن میں موجود ہیں۔ آپ لوگوں کے سامنے پیش کرسکوں گا۔ تاکہ آپ غور و خوض کے بعد
ن خیالات کو یا تو غیر ضروری اور بے کار سمجھ کر مسترد کردیں یا پھر انہیں قابل اعتنا
سمجھتے ہوئے اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں جہاں تک ممکن ہو استعمال کریں۔ شاید اس
انچ پرکھ اور چھان بین سے تدریسی قدروں کے سمجھنے اور انہیں ترتیب دینے میں
کچھ مدد ملے۔

اس کانفرنس میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے۔ کہ یہ نیو ایجوکیشن یا نئی تعلیم کی طرف ہم لوگوں کی توجہ مبذول کرنا چاہتی ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ہماری روزمرہ کی رسمی تعلیم و تدریس میں ان مناسب اور ضروری اجزا کو شامل کرنا چاہتی ہے۔ جنہیں ہم نصاب کی پابندیوں۔ درسیات کی قیدوں اور امتحانوں کے خوف سے اکثر نظرانداز کر جاتے ہیں۔ صاحبو! یہ تضاد کی دنیا ہمیں سوچنے کی مہلت نہیں دیتی۔ زندگی کے مطالبات اس قدر مبہم اور مسلسل ہیں۔ کہ ہم معمولات کے جنگل میں کھوئے جاتے ہیں۔ اور اکثر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ ہم محتاج ہو گئے ہیں کہ کوئی ہر وقت ہمیں راہ دکھاتا رہے اور ہم اندھے آدمی کی طرح کسی آنکھوں والے کے سہارے زندگی کی منزل طے کرتے رہیں۔ شاید نوع انسانی کا ہمیشہ سے یہی دستور اور وطیرہ رہا ہے۔ کہ جمہور بغیر غور و فکر کئے، اتباع اور پیروی میں عمریں گذار دیں۔ لیکن ہمارا یعنی مدرسین کا طبقہ اس طریق کار پر عمل پیرا ہو کر اپنی صحیح خدمت کو مناسب طور پر پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکتا۔ اس متناقض دنیا میں ہمیں بڑے شعور سے قدم اُٹھانا چاہیئے۔ ہماری ذمہ داریاں بہت اہم ہیں۔ آپ فرمائیں گے۔ آخر یہ کیوں؟ ہم مدرسین ہی پر یہ بوجھ کیوں ڈالا جائے؟ اس لئے کہ آنے والی نسلیں ہم سے بہت کچھ سیکھنے والی ہیں۔ ہمارے عیوب اور ہماری خوبیاں آنے والی نسل کی بُرائیاں اور بھلائیاں بن جائیں گی۔ میں جب اپنے پیشے کی ذمہ داریوں پر نگاہ ڈالتا ہوں تو معاً یہ خیال آتا ہے۔ کہ اتنا بڑا بوجھ ہمارے ناتواں کاندھے کیونکر اُٹھا سکیں گے۔ سوائے اس کے کہ فضل ربی ہمارے شامل حال ہو اور ہم آج ہی سے یہ ارادہ کر لیں کہ ہماری زندگیاں نہایت یک سوئی کے ساتھ آنے والی نسلوں کے لئے وقف کر دی گئی ہیں۔

صاحبو! صدیوں کے رواج کی وجہ سے ہم بچے کی صحیح نشو و نما کو صرف چند باتوں پر منحصر سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ صحیح غذا۔ سونے جاگنے کے مناسب اوقات۔ مقررہ وقت پر نشست و برخاست ضروری اور مفید لباس۔ رسمی درس و تدریس اور اسی قسم کی چند اور احتیاطیں ایک بچے کی تندرستی اور صحت مندانہ پرورش کے لئے کافی سمجھی جاتی ہیں۔ اِن کی بدولت جسمانی بالیدگی اور جذباتی توازن

کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے یعنی نفسیاتی اعتبار سے عادات کی تربیت کی داغ بیل پڑ جاتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ ماں اور استاد کی دیکھ بھال اور گرد و پیش کے اثرات سے عادات کا وہ جال بچھنے لگتا ہے جس کی بدولت غیر شعوری طور پر بچے میں سیکھنے کی صلاحیتیں بروئے کار آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کی تربیت بڑی ضروری اور قیمتی ہے لیکن اس میں بچے کی ذہانت اور سمجھ بوجھ کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

آپ نے کبھی کتا، بلی یا کوئی اور جانور پالا ہے؟ آپ کو یاد ہوگا کہ مسلسل اور پیہم تکرار سے اپنے پالتو جانوروں میں آپ حسب منشا چند عادتیں پیدا کر دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ غور فرمایئے کیا اس بچے میں جس کو آپ نے چند معمولات کا عادی بنا دیا ہے اور ایک پالتو جانور میں کوئی فرق ہے؟ پالتو جانور نے پہلے چھ مہینے میں جو سیکھنا تھا سیکھ لیا۔ اور وہ اس کی تمام عمر کے لئے کافی ہوگا۔ مگر انسانی زندگی کے تقاضے مشکل اور مختلف ہیں۔ چھ مہینے کا انسانی بچہ جب چھ سال کی عمر تک پہنچے گا۔ تو اسے سب کچھ سیکھ لینا ہوگا۔ اور یہی چھ سال کا بچہ جب سولہ سال کا ہو جائے گا تو اس کے علم کا ذخیرہ اور عادات کا طور لازمی طریقے پر بے انتہا مختلف ہوگا۔ یہ روز بروز سیکھتا ہی رہے گا۔ چالیس، پچاس، ساٹھ سال کی عمر تک یہ رنگا رنگ کی زندگانی اسے نئے سبق دیتی رہے گی۔

دو ڈھائی سال کی عمر میں بچے بالعموم بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ بولنا شروع کرتے ہی بچہ پالتو جانور سے مختلف ہو جاتا ہے۔ اس کی اچھل کود، رونا بسورنا، ہنسنا اور کھلکاریاں۔ جانور کی نوشِ آمد حرکات سے مختلف ہو جاتی ہیں۔ اس کے آدھے بوسے ہوئے لفظ اور ٹوٹے پھوٹے جملے انسانی فکر اور تامل کی ابتدائی حالتیں ہیں۔ یہ بچہ اب بچہ نہیں رہا۔ اس میں اور پالتو بلی میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ گویائی کی قوت اپنے ساتھ ساتھ خیالات بھی لے آئی ہے۔ انہیں خیالات کی یکسانیت اور تضاد ہی اس بچے کو اس کی

مرکے آخری لمحوں تک اسے ہمیشہ متعارف کار لیکن مجروح تضاد رکھیں گے۔ بولنا شروع کرتے ہی
بچہ جس چیز کو دیکھتا ہے، غیر شعوری طور پر اپنے تجربوں کے خزانے میں جمع کر لیتا ہے۔ اور پھر
خیالات اور عقائد کا بھی خزانہ سیم وزر کے خزانے سے زیادہ تکلیف دہ بن جاتا ہے۔
آپ دو ایسی چیزیں کھا لیجے جو متناقض ہوں۔ آپ کا ہاضمہ خراب ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن
ہے کہ آپ کا معدہ انہیں بالکل ہی قبول نہ کرے۔ اجسام کی دنیا میں متضاد چیزیں یکجا
نہیں ہو سکتیں لیکن ہمارے دماغوں میں متضاد خیالات ایک ہی وقت میں موجود ہو جاتے
ہیں۔ اگرچہ بالعموم ہمیں دماغی بدہضمی کی شکائیت نہیں ہوتی یا کم از کم ہمیں اس دماغی
بدہضمی کا واضح علم نہیں ہوتا۔ اگر متناقض خیالوں کے دماغ میں جمع ہونے کا اظہار
دردِ سر سے ہوتا تو آپ دیکھتے کہ بنی نوع انسان کا معتدبہ حصہ درد کی شکایت میں مبتلا
رہتا۔ تاہم ان متضاد خیالات کے اجتماع کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہمارے طرزِ غور و فکر میں
ایک مسلسل انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ میرے ہم پیشہ بھائیو! ہمارا فرض ہے کہ ہم پہلے اس
انتشار سے خود عہدہ برآ ہو جائیں۔ اور عمر بھر یہی کوشش کرتے رہیں کہ ہمارے بچے
اس ذہنی کشمکش اور انتشار سے محفوظ رہیں۔ یہ بہت مشکل اور بہت بڑا کام ہے۔
لیکن کرنے کا کام ہے۔ صرف اچھے نصاب، درسی کتب اور امتحانات کے ذریعے سے اس
کام کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس کے لئے ہمیں روشنی کی ضرورت ہے اور وہ روشنی نئی تعلیم
کے ذریعے میسر آ سکتی ہے۔

بچے کے ناآگاہ والدین، اس کے بے تعلق اُستاد، اس کا دُھندلا گرد و پیش، اس
کے ناسمجھ ہم سبق بالعموم اسی نامعلوم ذہنی انتشار میں مبتلا ہوتے ہیں ؎

دلم بہ پاکیٔ دامان غنچہ مے لرزد
کہ بلبلاں ہمہ مستند و باغبان تنہا

نئی تعلیم کا منشا یہ ہے کہ اس شور و شغب سے آلودہ دنیا میں منتشر دماغی کے

آشوب کے باوجود بچہ کی ذہنی پاک دامانی کو برقرار رکھا جائے۔

اِس کا طریق کیا ہونا چاہیئے؟ اور یہ فرض کس طرح انجام دیا جا سکتا ہے؟ مَیں آپ کی توجہ درسی کتب کی طرف مبذول نہیں کرنا چاہتا۔ مَیں اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی سے بھی خوب واقف ہوں۔ اِس لئے یہ عرض کرنے کی جسارت بھی نہیں کر سکتا کہ جو کچھ مَیں کہوں گا وہ مبسوط اور مکتفی ہوگا۔ میں تو صرف اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر چند باتیں عرض خدمت کروں گا۔ جو مَیں نے مدرسانہ حیثیت سے مفید پائی ہیں اور شاید آپ بھی انہیں مفید پائیں۔

۱۔ نئی تعلیم کے نظام میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آپ بچوں سے انتہائی محبت کریں۔ لیکن محبت کا تقاضا یہ نہیں کہ بچوں کی خواہشات کو بے چون و چرا منظور کر لیا جائے اور انہیں ہر طرح کی آزادی دے دی جائے۔ جو بعض اوقات مضر بھی ثابت ہو سکتی ہے اپنی بساط اور حیثیت سے زیادہ ان کے لئے زندگی کے آرام و اسباب مہیا کئے جائیں۔ جو شاید انہیں آرام طلب اور سست رگ بنا دیں۔ بلکہ بچوں سے اصلی اور حقیقی محبت یہ ہے کہ ہر بچے کو واجب تکریم و تحریم سمجھنا چاہیئے۔ اس کی جبلی شرافت اور صلاحیتوں کی نشوونما کے بعد اسے دنیا کے اہم سے اہم کام کو انجام دینے کے قابل تصور کیا جائے۔ ہم میں سے جو بھی یہ رتبہ بچوں کو دینے کے لئے تیار نہیں۔ وہ باوجود اپنے پیشے سے شغف و انہماک رکھنے کے کبھی بھی صحیح معنوں میں نیا معلم کہلانے کا مستحق نہیں۔ مَیں نے اکثر سنا ہے کہ فلاں اُستاد اپنے شاگردوں سے درشتی سے پیش آتا ہے۔ عامی اور رکیک زبان میں گفتگو کرتا ہے۔ بچوں کے بے باکانہ اظہار رائے پر بھڑک اُٹھتا ہے۔ غرض کہ باوجود محنتی اور فرض شناس ہونے کے وہ بچوں کی عزت نہیں کرتا۔ ایسے اُستادوں کا حال سُنکر مجھے صد درجے ملال ہوتا ہے اور مَیں ہمیشہ یہی آرزو کرتا ہوں کہ ان کے دل میں اپنے شاگردوں کی عزت جاگزیں ہو جائے۔ وہ حقیقی معنوں میں ان سے محبت کرنے لگیں اور ان کی تدریس و تعلق کے

ہر زمانے میں محبت کارفرما نظر آئے۔ وہ محبت جو ایک مدرس کو درسی کتب کی تکمیل اور امتحانات کے خوف سے زیادہ ایک شخصیت کی تشکیل میں مصروف کر دیتی ہے۔

ہر اُس شخص کو جو اچھا مدرس بننے کا خواہاں ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے شاگرد اپنی فطری بلندی تک نشو و نما پائیں۔ سرتاسر جذبۂ ادب و احترام سے معمور ہونا چاہئے۔ گویا اُسے بچے میں کوئی ایسی چیز نظر آنی چاہیئے جو متبرک اور تفضیل کی حدود سے بالاتر ہے۔ ایسی چیز جو انفرادی ہے مگر حیرت انگیز طور پر گراں بہا۔ بچے کے حضور ایسے ایک ناقابل بیان عاجزی اور انکساری محسوس کرنی چاہیئے۔ ایسی عاجزی اور انکسار جس کا جواز عقلی دلائل کی رو سے آسان نہیں مگر بہت سے اساتذہ اور والدین کے سہل انگارانہ اعتماد نفس کے مقابلے میں یہ عجز و انکسار دانشمندی کی حد سے زیادہ قریب ہے۔ ایسے مدرس کو اُس کا تخیل بتا دے گا۔ کہ بچہ نیکی اور بدی کی راہ میں کس مرتبہ تک پہنچ سکتا ہے کس طرح اُس کی خواہشات کی مزاحمت کی جا سکتی ہے کس طرح اس کی اُمیدوں کو مدھم کرنے کی ضرورت ہے۔ اور کس قدر اُس زندگی کے اُبھار کو جو اُس کے اندر موجزن ہے کم کرنا ضروری ہے۔ یہ سمجھ بوجھ ایک صحیح قسم کے مدرس کے دل میں اُمنگ پیدا کر دے گی۔ کہ وہ بچے کا اُس کی اپنی جد و جہد میں مددگار بنے کسی بیرونی مقصد کے لئے نہیں بلکہ اُنہی مقاصد کے لئے جن کی مبہم طور پر بچے کی اپنی روح متلاشی ہے۔

یہ ہے اصلی معنوں میں محبت کا مفہوم جس کے اجزائے اعظم بچوں کی تکریم و تحریم ہیں۔ اس کے بعد بچوں کی آزادی کا درجہ ہے۔ اس لفظ کو طرح طرح کے معنی پہنائے گئے ہیں اور اسی اختلاف معنی کی وجہ سے کوئی آزادی کے موافق ہے تو کوئی مخالف۔ آزادی کے موضوع پر فن تدریس کی کتابوں میں بڑی مکمل بحثیں موجود ہیں۔ اس لئے میں اس مسئلے پر کچھ عرض کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ آزادی کا مفہوم بے جا خود مختاری نہیں ہے۔ درحقیقت معلم کے نقطۂ نگاہ سے آزادی صرف بچوں کی انفرادی آزادی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسے ماحول سے ہے جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں اور تخلیقی قوتیں زیادہ سے زیادہ

بالیدگی پا سکتی ہیں۔ اس ماحول میں دماغی اور اخلاقی رجحانات کی تربیت بدرجہ اتم ہو سکے۔ اور اس تربیت کا قطعی اور واضح مقصد یہ ہو کہ بچے اپنی تعلیمی سرگرمیاں بذاتِ خود جاری رکھ سکیں۔

آپ نے والدین اور اُستادوں کو کہتے سُنا ہوگا۔ کہ فلاں بچہ بدشوق ہے۔ ہم یہ سُنکر اثبات یا نفی میں سر ہلا دینے کے عادی ہیں۔ اور اس بات پر کبھی غور نہیں کرتے۔ کہ بدشوق ہونے کے اصلی معنی کیا ہیں۔ کیا آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ وہی بدشوق بچہ دوسرے مشاغل میں اکثر بڑے ذوق و نشاط سے مصروف ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کیجئے۔ تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔ کہ بے پابندشیں۔ خشک اور غیر دلچسپ باتیں ہر شخص کو بدشوق بنا دیتی ہیں۔ اس لئے میرے نزدیک آزادی کا مفہوم ایک ایسے ماحول کا ترتیب دینا ہے۔ جو بچوں کے جبلی رجحانات اور شوق کے مطابق ہو۔

کیا ہم لوگ اپنے طور وطریق میں خود رائے اور سرکش نہیں ہوتے ؟ اور کیا ہماری سرکشی کے لئے کوئی بھی وجہ جواز مل سکتی ہے ؟ میرے نزدیک وہ انسان بے انتہا کم مایہ اور بدنصیب ہے۔ جو اپنی رائے کے سامنے دوسرے کی کوئی بات قابلِ غور نہیں سمجھتا۔ جو اپنی منصبی حیثیت کے بل بوتے پر عقلِ کُل بن بیٹھتا ہے اور یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اس سے اختلاف کرے۔ بھائیو! میں اس صاف گوئی بلکہ تلخ بیانی کی معافی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد نکتہ چینی یا دل آزاری نہیں۔ میں آپ ہی میں سے ایک ہوں اور شاید اپنی کوتاہی کو ہی عمومی رنگ دے کر بیان کر رہا ہوں۔ لیکن یہ بات جانتا ہوں کہ اس قسم کی سرکشی ہمارے پیشے میں بڑا گناہ ہے۔ ہم میں تو عاجزی ہونی چاہیئے۔ وہ عاجزی جو بچوں کو سرفراز اور ممتاز بنا دے تاکہ روزمرہ کی زندگی میں وہ یہ راز سمجھ لیں کہ دماغی ترقی اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے۔ جب دماغ اپنے گرد و پیش سے ہر وقت دوچار ہوتا رہے عجز سے اخلاق پر بہت اچھا اثر پڑتا ہے بشرطیکہ عاجزی کم ہمتی اور نااہلی کے باعث نہ ہو مستبد قوانین کو برداشت کرنا عاجزی

نہیں ہے یہ کمزوری ہے جو صحیح اخلاقی قدروں کے لئے زہر کا حکم رکھتی ہے۔ مدرسے کا ضبط
و انتظام جو خارجی اثرات کی وجہ سے برداشت کیا جاتا ہے۔ اُستادوں اور شاگردوں
دونوں کے لئے ضرر رساں ہے۔ اخلاق کی تہذیب اور تربیت کے لئے خود مختارانہ نظام
کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ خود مختارانہ نظام شخصی یا اجتماعی سرکشی کی وجہ سے نہ مرتب کیا جائے
بلکہ بلند اور صحیح قدروں کے ماتحت۔ یہ بلند اور صحیح اقدار کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب طویل
بھی ہو سکتا ہے اور مختصر بھی۔ اس کا مختصر مگر جامع جواب یہ ہے کہ میرے نزدیک مذہب کی
اقدار صحیح اخلاقی اقدار ہیں۔ جن میں راست بازی۔ راست گوئی۔ رحم دلی۔ ہمدردی۔
تلاش و تجسس بہت اہم رتبہ رکھتی ہیں۔ ان اقدار کی پابندی اور اس سلسلے میں بے باکا
زندگی وہ ماحول پیدا کر دیتی ہیں۔ جو آزادی کا صحیح مفہوم ہے۔ لیکن آزادی کا مفہوم اضافی ہے یعنی
ایک معاشرے اور سوسائٹی ہی میں آزادی ممکن ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں کوئی نہ بستا
ایک انسان نہ آزاد ہے نہ مقیّد۔ اِس لئے نئی تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے۔ کہ ہر بچہ
کو مقررہ معاشرے کے واجبات سمجھنے کے قابل بنا دیا جائے۔ اس کے لئے اپنے معاشرے کا
عزّت کرنے کے اسباب مہیّا کر دیئے جائیں۔ اپنی تہذیب اور کلچر سے محبت کرنے کا عادی بن
جائے۔ مگر ایسی محبت جس کا مقصد معاشرے کی اصلاح اور ارتقاع ہو۔ ڈیڑھ صدی کی غلامی کی و
سے جو اپنوں سے بیگانگی پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا ازالہ ضروری ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ
کہ ہم خود پسند بن بیٹھیں۔ غیروں سے بیزار ہو جائیں۔ دنیا کے امن میں خلل انداز ہوں۔ اپنوں
محبت کا تقاضا یہ نہیں کہ اوروں سے نفرت کرنا سیکھیں۔ نئی تعلیم میں ایسے ماحول کی ضرور
ہے۔ جس میں بچہ نوع انسانی کی بالیدگی کا باعث بن سکے۔

مدنی ارتقا کے ساتھ ساتھ انسانوں کی جماعتی زندگی روز بروز پیچیدہ ہوتی جاتی
ہر بچہ میں خود غرضانہ اور جماعتی وفاداری دونوں میلانات پائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر تربیت نا
ہو تو خود غرضانہ جذبات گہرے ہو جاتے ہیں۔ اور جماعتی مفاد کا احساس مفقود ہو جاتا ہے۔ ہر بچہ

جماعت کا فرد ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ جماعت کا تصور بڑھتا جاتا ہے۔ وہ جماعت دوستوں کی جماعت سے مدرسہ کی جماعت ہو جاتی ہے۔ اور مدرسہ کی جماعت سے ضلع یا شہر کی آبادی اور پھر صوبہ یا ملک کی آبادی اور پھر تمام دنیا کی انسانی آبادی۔ غرض کہ جماعتوں میں رہ کر جماعت کی وفاداری کی تعلیم "سماجی تعلیم" کہی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں "سماجی تعلیم" کو بڑی حد تک نظرانداز کیا گیا ہے کھیل میں ایک کھلاڑی اگر صرف اپنی ذاتی شہرت کا خیال رکھتا ہے۔ تو وہ خودغرض ہے۔ لیکن اگر جماعت کی فتح کا خیال رکھتا ہے۔ اور اِس فتح کی کوشش میں وہ اپنی ذات کی نیک نامی کو قربان کرتا ہے۔ تو اُس کا یہ احساس اُس کے سماجی احساس کا عمدہ نتیجہ ہے۔ ہمارے بچوں میں اپنی ذات کے مفاد کو جماعت یا قوم کے مفاد کے مقابلے میں قربان کرنے کا جذبہ ضرور پیدا کرنا چاہیئے جس قوم کے افراد میں یہ ایثار نہ ہو تو وہ قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ نئی تعلیم کا ایک اہم تقاضا یہ بھی ہے۔ انسان چھوٹے چھوٹے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایسی محبت کی دنیا بسائے۔ جس کی وسعتوں میں نوعِ انسانی سما جائے۔

بچوں کی ذہنی ترقی کے لئے علم و عمل دونوں کی ضرورت لازمی ہے۔ صرف حصولِ علم کافی نہیں ہے۔ حصولِ علم کے ساتھ اکتسابِ ہنر بھی ضروری ہے۔ اب تک ہماری تعلیم میں صنعت و حرفت کو وہ جگہ حاصل نہیں تھی جو ہونا چاہیئے۔ دست کاری، صنعت اور عملی تعلیم کی طرف ہماری درسگاہوں کو زیادہ توجہ کرنا چاہیئے۔ عام تعلیم ہو یا صنعتی تعلیم۔ بچے کی روزانہ زندگی سے اُس کی مطابقت نہایت ضروری ہے۔ ہمارے اب تک کے تعلیمی نظام کا مقصد دفاتر کے لئے محرر یا عہدہ دار پیدا کرنا تھا۔ اب ہماری درس گاہوں کے تعلیم یافتہ کی خواہش یا منتہائے نظر سرکاری ملازمت نہ ہونا چاہیئے۔ اُن میں تجارت، زراعت، صنعت و حرفت سے دلچسپی پیدا ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ آزاد پاکستان میں آزاد شہری کی حیثیت سے معاش پیدا کر سکیں اور ملک کی دولت میں سائنسی اور ترقی یافتہ طریقے استعمال کر کے زیادہ سے زیادہ اضافہ کر سکیں۔ مدارس میں اکتسابِ علم۔ اکتسابِ ہنر یا جمالیاتی ذوق پیدا کرنے کے جو طریقۂ تعلیم رائج ہیں۔ وہ بہت

فرسودہ ہیں۔ ان طریق ہائے تعلیم کو دیگر ترقی یافتہ ممالک کی طرح جدید ترین ہونا چاہیئے۔ مشرقی زبان ہو یا مغربی۔ اِس طرح پڑھائی جائے کہ بچوں کو اظہارِ خیال کا موقع اُن زبانوں میں تقریر و تحریر ہر دو طریقوں سے زیادہ سے زیادہ حاصل ہو۔

ہمارے طریقۂ تعلیم میں ایجادی قوتوں کی تربیت کی طرف کم توجہ کی گئی ہے۔ ہماری تعلیم میں تقلید اور نقالی زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نقالی کے بعد ہی ایجادی قوتیں کام کرتی ہیں لیکن نقالی کے ساتھ ساتھ ایجادی قوتوں کے استعمال کے مواقع طلبہ کو زیادہ سے زیادہ مہیا کرنے چاہیئے۔ ایجاد و اختراع کی قابلیت ہر انسان میں ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس قوت کے استعمال کے مواقع ابتدائی عمر میں کسی شخص کو نہ ملیں۔ تو اُس میں یہ ایجادی قوت مُردہ ہو جاتی ہے۔ قدامت پسندی۔ لکیر کا فقیر ہونا۔ ناسمجھی کی نقالی۔ کم فہمی کی تقلید ہماری قوم کی فطرتِ ثانیہ ہو گئی ہے۔ اِس لیے اب ہماری تعلیم کو تخلیقی تعلیم بنانا چاہیئے۔ نئی تعلیم کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ وہ بچوں میں تخلیقی قوتیں بیدار کرتی رہے۔

ایسے مدرسے میں جہاں آزادی کا دور دورہ ہو۔ اور جہاں مدرسین بچوں کو احترام کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں۔ بہ کم و بیش یقینی ہے کہ تمام ماحول خوشی اور انبساط سے بھرا ہوا ہوگا۔ کوئی زیادہ مدت نہیں گزری جب ماں باپ اپنے بچے کو اُستاد کے پاس لے جاتے تھے۔ تو نہایت وضاحت سے یہ بھی عرض کر دیتے تھے کہ بچے کا گوشت اُستاد کی نذر ہے۔ اور ماں باپ صرف کھال اور ہڈیوں کے حق دار ہیں۔ اس انتساب کا مفہوم غالباً یہ ہوتا تھا کہ اُستاد کو حق حاصل ہے کہ وہ مار پیٹ میں احتیاط نہ کرے۔ اور بچے کو بھی کی معرفت علم و اخلاق سے بہرہ مند کر دے۔ پچھلے زمانے ہی پر کیا موقوف ہے۔ اب بھی مدارس میں پچھلے وقتوں کے اساتذہ کے جانشین کافی تعداد میں موجود ہیں۔ مدرسین کے اس طرزِ عمل کا جو یہی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ طلبہ بالعموم خوف زدہ رہتے ہیں۔ اور خوف کی وجہ سے جھوٹ اور فریب ان کی روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی حرکات میں رونما ہونے لگتا ہے۔ ظاہر ہے۔ جہاں خوف جھوٹ اور فریب دخل انداز ہوں۔ وہاں خوشی اور انبساط دُور دُور بھی نہ ملے گا۔ اور جو

انبساط۔ فرحت اور نشاط مفقود ہوں۔ وہاں تخلیقی قوتیں سو جائیں گی۔ اور زیادہ سے زیادہ
قوتِ حافظہ اور روایات۔ بالفاظ دیگر نقل اور تکرار بروئے کار آجائیں گے۔ نئی تعلیم کا اہم تقاضا
ہے۔ کہ تخلیقی قوت کو پیدا کیا جائے۔ اور اس کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ انبساط طلبا کی زندگی کا
جزو اعظم بن جائے۔

جی چاہتا ہے کہ ایسے مدرسے کا نقشہ کھینچوں۔ جہاں تدریس کا انحصار انبساط پر ہے۔
استادوں کے پُرسکون اور شاداب چہرے آپ کو دکھاؤں۔ ان کی رفتار و گفتار میں جو وقار
اور شگفتگی ہوتی ہیں۔ ان کا ذکر کروں۔ طلبا کے کھلکھلاتے ہوئے چہرے۔ زندگی اور بالیدگی سے لبریز
حرکات و سکنات کی تصویر کھینچوں۔ مگر موقع اور محل اس کی اجازت نہیں دیتا۔ مختصر یہ سمجھ لیجئے کہ
استادوں اور طلبا کا وقت ہنسی خوشی گذرتا ہے۔ وہ ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔ ان کی ہر
حرکت بامعنی ہوتی ہے۔ اور ہر حرکت کی مزید تشریح نقطۂ تخلیق سے ہو سکتی ہے۔ صاحبو!
نئی تعلیم کوئی اصول اور قانون نہیں۔ یہ محکمے کے انسپکٹر معائنے کے وقت کتاب میں درج نہیں
کرتے۔ یہ تو ایک طرزِ زندگی ہے جس میں ماں باپ بھی شریک ہیں۔ سماج بھی شریک ہے۔
ہمارے مکھیا تو ستھے۔ رنج اور خوشی کے موقعے۔ ہم سب کا طرز بود و باش اس میں بہ قدر مناسب
اضافہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن سب سے اہم شخصیت استاد کی ہے۔ جو پیشہ ورانہ انداز سے تنقید اور
تعمیر میں مصروف رہے۔ یہی کام مقدس ہے۔ جب کوئی نیا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو مجھے اس امر کا پھر یقین
ہو جاتا ہے۔ کہ خالق مطلق اللہ عزوجل ابھی اپنی مخلوق سے ناامید نہیں ہوا۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ
اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ نئی تعلیم کا ہر مدرس جب نیا بچہ اس کے مدرسے میں داخل
ہونے آتا ہے۔ تو یہی سمجھتا ہے۔ کہ سماج ابھی مدرسین سے مایوس نہیں ہوئی۔ اور باوجود ہماری
کوتاہیوں کے ہم مفید اور ضروری خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اللہ وہ دن لائے کہ ہم سب
نئی تعلیمی زندگی اختیار کر لیں۔ اور نئی تعلیم کے سرچشمے سے بہرہ ور قومی، شریف اور متمدن
سماج پیدا کر سکیں۔

ڈاکٹر ایوب احمد خان صاحب

مجھے اخلاقی تعلیم پہ کچھ کہنا ہے۔ حیران ہوں کہ وہ کون سی ایسی نئی چیز ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ قاصر ہوں۔ تاہم اِس غرض سے آپ کے سامنے چند ایک خیالات ظاہر کرنے کے لئے آیا ہوں کہ صدیوں کے احکامات کو ایک بار پھر دُہرا سکوں۔

۱۹۴۷ء کے وحشیانہ مظالم کے حالات مَیں نے ایک غیر ملک کے اخبارات میں پڑھے۔ رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ آپ نے تو اپنی آنکھوں دیکھے ہوں گے۔ انسان جب اخلاقی تعلیم سے دُور ہو جائے تو اس کا درجہ درندوں سے بھی گر جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء کے واقعات کی تصویر دوبارہ کھینچنا نہیں چاہتا اور نہ ہی مناسب ہے کہ ایسی بھیانک تصویر کو تاریخ میں اہمیت دی جائے۔ کیونکہ تاریخ ایک انسانی چیز ہے حیوانی نہیں۔ اس کے برعکس تاریخ کو اس سانچے میں ڈھالا جائے کہ وہ نفرت کی جگہ بنی نوع انسان کو محبت کا پیغام دے۔

مجھ سے بہتر آپ جانتے ہیں کہ سوسائٹی کے موجودہ اخلاقی حالات کچھ کم ہراساں

نہیں۔ خود غرضی اور بد دیانتی عام ہے۔ جسے دیکھو چاندی اور سونے کے پہیّوں کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ جاہ و حشمت کا دیوانہ اور عیش و عشرت کا دلدادہ۔ یہ سب چھوٹے چھوٹے خدا ہیں۔ بھلا ہم ایک خدا سے زیادہ خدا رکھ سکتے ہیں؟ منافقت کی حد ہے۔ قرآن بغلوں میں دبائے یا سروں پہ اُٹھائے وہ کچھ کر رہے ہیں جو قرآنی تعلیم کے بالکل برعکس ہے۔ جھوٹ عام ہے۔ بدعہدی ایک روزمرّہ کا کھیل۔ چھوٹے مسلمان بھائی کی کمائی پر پیٹ پھیلانا اور سینہ اُبھارنا عین اسلامی تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ رسولؐ نے یہ کبھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ چغل خوری، رشوہ دوائی حکومت کے دفاتر کا وہ حربہ ہے جس سے کہ ایک افسر دوسرے بھائی کے کندھوں پہ پاؤں رکھ کر منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے۔

زبان سے تو ہم لوگ دنیا کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں۔ اسلام زندہ باد کے گیت گاتے ہیں۔ عملی کام کا وقت آئے تو بائیں ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی تک ہلا نہیں سکتے۔

صاحبِ صدر! میرا واسطہ دنیا کی باقی قوموں سے کافی پڑا ہے۔ مغرب کے لوگ گو قرآن کو تسلیم نہیں کرتے لیکن اُن کا طرزِ عمل قرآن کے اصولوں کے بہت حد تک مطابق ہے۔ گو ہم اُن کی چند ایک رسموں پہ خشت باری کرتے ہیں۔ مثلاً بیاہ شادی کا معاملہ۔ لیکن یہ اُن کے اپنے رواج ہیں۔ تاہم وہ لوگ قول کے سچے۔ عہد کے پابند۔ صاف گو۔ خوش معاملہ۔ نیک طبیعت ہیں۔ کاش کہ ہم جو قرآن کے حامل ہیں قرآن کے احکام سے آشنا ہوں۔ اور رسمی اسلام کے گورکھ دھندے سے نجات حاصل کر سکیں۔

صاحبِ صدر اور معزز حاضرین! میرا مضمون ایک لحاظ سے مشکل ہے۔ چونکہ ہر مسلم کا نقطہ نظر جداگانہ ہے۔ عادتاً مجبور ہوں کہ جو کچھ دل میں آئے کہوں۔ معزز حاضرین سے التماس ہے کہ میری صاف گوئی سے ناراض نہ ہوں۔

دین اور مذہب میں ایک گونہ فرق ہے۔ دین قرآن کے اصولی موتیوں کی ایک

وہ لڑی ہے جو ہمیں ایک ہستی کی طرف کھینچ رہی ہے۔ مذہب تہذیبی، سیاسی، تمدنی اور
معاشرتی اور کچھ دینی اجزا کا مرکب ہے۔ ایک باغ کی مثال دیتا ہوں جس میں رنگا رنگ پھولوں کے
درخت ہیں اور جھاڑی بوٹیاں۔ معاف فرمایئے۔ ہم جیسے مسلمان جھاڑی بوٹیوں کی طرح
پرورش کر رہے ہیں۔ گویا سچائی، نیک نیتی، عالی حوصلگی، ہمدردی، رحمدلی، خدمت خلق،
انصاف، فیاضی، درخشندگی کے خوبصورت پودوں کو ہم نے بے توجہی سے خشک کر دیا۔
امید ہے کہ آپ میرے ساتھ متفق ہوں گے کہ انسان کی زندگی ان سات دائروں میں
گھری ہوئی ہے جو کہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ سب سے اندر کا دائرہ
(I) کا ہے جسے (Ego) کہا جاتا ہے۔ دوسرا دائرہ اس کے گرد خاندان اور قبیلے کا ہے۔
تیسرا ہمسائے اور اس بستی کا جس میں آپ رہتے ہیں۔ چوتھا آپ کا صوبہ۔ پانچواں آپ کی
قومیت۔ چھٹا آپ کی نسل اور اسلامی دنیا۔ ساتواں دائرہ ہے بنی نوع انسان ہیں۔
یاد رہے کہ شخص کو ہمیشہ چھوٹے دائروں میں اپنی قوت صرف کرنا چاہئے۔
مجھے ایک عربی کے معلم کا واقعہ یاد ہے۔ وہ صاحب ایک پاؤ گوشت لاتے اسے چولہے پر
خود ہی ختم کر جاتے اور بچے منہ تکتے رہ جاتے۔ مولوی صاحب عربی کے بہت بڑے عالم تھے
قرآن ان کو حفظ یاد تھا۔ انسان کی ارتقا پہلے دائرے سے باہر کی طرف ہونی چاہئے۔
جب کوئی ایسا معاملہ ہو کہ بنی نوع انسان کی بہتری کی مڈبھیڑ قوم اور نسل کی بہتری
کے ساتھ ہو تو آخری کو پہلی پر قربان کر دینا چاہئے۔ اسی طرح چھٹے دائرے کی خاطر پانچویں
پہلا اور پانچویں کی خاطر چوتھے پر مقصود ہے۔

صاحب صدر! اسلام فطرتی مذہب ہے جس میں دلیل اور عقیدہ دونوں کو دخل
ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہر بچہ مسلمان پیدا ہوتا ہے۔ اس کی فطرت میں ہرگز کجی نہیں ہوتی ہے
یہ ہماری اپنی بدقسمتی ہے کہ اس نیک فطرت مسلمان بچے کو ہم دوزخ کی تیاری میں لگا کر
ہم مسلمان برباد کر رہے ہیں۔

کا مطالعہ کرتا ہے۔ اور نہ کبھی ریڈیو سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اُن کے لئے فلم انڈسٹری خاصہ کام کر سکتی ہے۔ اگر اُن کا مطمح نظر خدمتِ خلق ہو نہ کہ روپیہ کا انبار اکٹھا کرنا۔

کنڈرگارٹن میں بچوں کی تعلیم کا خاصہ خیال رکھا جائے۔ تاکہ وہ پُر اخلاق زندگی کے لئے تیار کئے جائیں۔ یہ کام وہی اُستاد کر سکتے ہیں۔ جو تعلیم نفسیات اور اخلاقی تعلیم میں ماہر ہوں۔ مُلّا لوگوں کو اِس تعلیم میں کوئی دسترس نہ ہو۔ اس سٹیج پہ بچوں کو آپس کا پیار۔ آپس کی ہمدردی۔ سچائی۔ دیانت داری اور انصاف سکھائے اور نفرت سے گریز۔

پرائمری اسکولوں میں چھوٹی چھوٹی سبق آموز کہانیوں کے ذریعے بڑے بڑے اخلاقی اصولوں کو پیش کریں۔ اُستادوں کا اپنا اخلاق ایسا ہو کہ بچے اُن کی نقل کو فخر سمجھیں۔ یہ سچ ہے کہ اُستاد بچوں پہ زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ تھوڑی تنخواہ ہونے کی وجہ سے بھوک کا مسئلہ ہمیشہ درپیش رہتا ہے۔ تاہم اُمید کی جاسکتی ہے کہ ہماری اچھی گورنمنٹ اس کی طرف کچھ غور کر سکے۔

مڈل اسکولوں میں تاریخ کو سبق آموز شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگلے دن جنرل آسبرن نے کہا تھا۔ کہ ہسٹری سے ہم نے یہی سیکھا ہے کہ ہسٹری ہم کو کچھ بھی نہیں سکھا سکتی۔ یہ بہت حد تک درست ہے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ تاریخ کے واقعات کو ترمیم کر کے اخلاقی رنگ میں پیش کیا جائے۔ آج تک تاریخ نے نفرت کی آگ بھڑکائی اب چاہیئے کہ یہ اصول سکھائے۔

ہائی اسکولز میں لڑکوں کو لائبریری کے استعمال کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ جو کتاب چاہیں پڑھیں اور اپنی اخلاقی تعلیم میں اضافہ کریں۔ اِن نوجوانوں کے دِل میں اِنسان کی ہمدردی نقش کر دینی چاہیئے۔ اسلام میں قومیت کی جگہ نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ محسوس کریں کہ وہ اس عالمگیر تخلیق میں کیا ہستی رکھتے ہیں۔ اُن کو خدمتِ خلق

انصاف۔ ہمدردی اور محبت کا سبق ضرور پیارا معلوم ہوگا۔ اِس طرح ہم اگلی لڑائیوں اور کشت و خون سے نجات حاصل کر سکیں گے۔

جب یہ نوجوان کالجوں میں جائیں گے۔ تو خود بخود اُن کا رُجحان اخلاقی کتابوں کی طرف ہوگا۔ اور اُن کی سوچ بچار۔ گفتار اور کردار اسی سانچے میں ڈھلے ہوں گے۔ جو آج ہم اپنے دفاتر اور حکومت کے افراد سے مایوس ہو رہے ہیں۔ کل ایسا نہ ہوگا۔

جو لوگ ڈاکٹر بنیں۔ اُن کو خاص طور پر پُر اخلاق ہونا چاہیئے۔ تعلیم ہی ایسی ہو کہ ڈاکٹر لوگ روپیہ سے محبت کرنے کی بجائے مریض سے شفقت کریں •

بالکل بے خبر ہیں۔ کہ بچوں کی پرورش ایک علیحدہ علم ہے۔ اور نہایت ہی ضروری۔ دیہات میں تو خاص طور پر شاید ہی کوئی بچہ ایسا نظر آئے گا۔ جو ضدی نہ ہو۔ عادات بد میں مبتلا نہ ہو۔ مزاج کا چڑچڑا نہ ہو۔ جس کا شغل ہر وقت، روتے رہنا نہ ہو۔ اور جو تحصیل علم سے خائف نہ ہو۔ والدین تنگ آکر کہیں گے۔ کاش ہمیں ایسا بچہ نصیب نہ ہوتا۔ معلمین کہیں گے۔ ہم کیا کریں۔ کیسا شریر بچہ ہے۔ اس کا علاج سوائے بید اور مختلف سزاؤں کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن ہیں یہ دونوں ہی غلطی پر۔ اگر والدین کو یہ کہا جائے۔ کہ سب تمہارا قصور ہے۔ تو کون والدین ایسے ہیں۔ جو نا راضی کا اظہار نہ کریں گے؟ اگر معلمین کی خدمت میں یہ عرض کیا جائے۔ کہ مار پیٹ سے آپ لوگ بچے کی شرارت میں اور بھی اضافہ کر رہے ہیں۔ تو ماتھے پر شکن ڈال کر فرمائیں گے۔" اس کے علاوہ ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟ کیا ہماری تربیت بغیر سزا کے ہوئی تھی؟ ہم نے تو آج تک ایسا بچہ نہ دیکھا ہے۔ نہ سنا ہے۔ جو بغیر مار پیٹ کے درست ہو گیا ہو۔ کیا متقدمین کا طریقۂ تربیت غلط ہو سکتا ہے"؟ لیکن یہ سب جہالت کا نتیجہ ہے۔ والدین اور معلمین دونوں ہی بچے کو خراب کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارا کام آپ کو اس لاعلمی اور نفسیاتی طریقے سے آگاہ کرنا ہے۔ وما علینا الا البلاغ۔

نوزائیدوں کی سیرت اور ان کے نشو و نما کے متعلق ڈاکٹر جان۔ بی۔ واٹسن سے پہلے کسی نے بھی اس نہایت ہی دلچسپ میدان میں نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ واٹسن بچوں کی سیرت کے ماہر نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس نفسیات کے ایک مشہور ترین مسلک "کرداریت" (Behaviourism) کے بانی اور قائد اعظم ہیں۔ انہوں نے محض کرداریت کی بنیاد رکھنے کے لئے نوزائیدوں کی سیرت کا مطالعہ کیا۔" جان ہاپکنز" کے شفاخانے کے نفسیات کی تجربہ گاہ میں ایسے بچوں کا ایک علیحدہ وارڈ قائم کیا۔ بچوں کی پیدائش کے فوراً بعد ہی ان کو مطالعے کے لئے تجربہ گاہ میں لایا جاتا۔ اور اس طریقے سے نہایت ہی دلچسپ اور مفید نتائج

برآمد کئے گئے۔ ان مفید ترین نتائج سے متاثر ہو کر مختلف ماہرین نفسیات نے مختلف جگہوں پر بچوں کی نفسیات کے مطالعے کے لئے معمل اور ان کی بہبودی کے ادارے قائم کئے۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ ڈاکٹر واٹسن کے نتائج نے انہیں مجبور کیا۔ کہ اس کام کو اعلیٰ پیمانے پر شروع کیا جائے۔ اور ڈاکٹر موصوف کے نتائج کو اساسی خیال کیا جائے۔ آپ کی دلچسپی اور مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے آج انہیں اساسی نتائج پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

واٹسن کا طریقہ۔ بچوں کی پیدائش سے لے کر ان کے بڑے ہونے تک کے جبلی تقاضات جذباتی کیفیات اور انعکاسات (Reflexes) کے مطالعے پر منحصر تھا۔ یہاں سے انہیں یہ نتائج برآمد کرنے تھے۔ کہ ان کی سیرت کی نشوونما کیسے اور کس طور پر ہوئی ہے۔ اس امر پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ کہ بچہ کس عمر میں چیزوں کو پکڑ سکتا ہے۔ چل سکتا ہے۔ اکیلا بیٹھ سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کن کن چیزوں سے بچہ خوف کھاتا ہے۔ غصے میں آتا ہے۔ یا کن کن چیزوں سے محبت کرتا ہے۔ ان تمام چیزوں پر ماحول کی تاثیر کو خاص طور پر ملاحظہ کیا گیا۔ ایسے نتائج تعلیم کے لئے نہایت ہی مفید ثابت ہوئے ہیں۔ کیونکہ صحیح طریقے کی تعلیم میں ان نتائج کو استعمال کرنا اشد ضروری ہے۔ بچوں کی بعد کی زندگی فی الحقیقت انہیں انعکاسات پر مبنی ہے۔ ان سے فائدہ اٹھانا صرف معلمین ہی کے لئے نہیں۔ بلکہ تمام ان والدین کے لئے ضروری ہے جو بچوں کی صحیح تربیت کے خواہش مند ہیں۔

سب سے پہلا اضطراری فعل "چھینکنا" ہے۔ جو بعض اوقات پیدائش کی چیخ سے بھی پہلے ظہور میں آتا ہے۔ چیخنا۔ جمائی لینا اور کھانسنا وغیرہ بھی پیدائش کے فوراً بعد ہی موجود ہوتے ہیں۔ اخراج کے انعکاسات بھی جنم کے کچھ عرصہ بعد اور بعض اوقات اس سے چند منٹ پہلے ظاہر ہوتے ہیں۔ مسکرانا جو بلاشبہ ایک فطری امر ہے۔ پیدائش سے بالعموم چار یا پانچ دن بعد ظاہر ہوتا ہے۔ اگر نوزائیدہ بالکل تندرست ہے۔ تو مسکراہٹ کو اس کے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن بچہ جب تک کم از کم

ایک ماہ کا نہ ہو جائے۔ چیزوں سے متأثر ہو کر مسکرانا نہیں سیکھ سکتا۔

تندرست اور طبعی بچے کی ابتدائی حرکات میں سے ایک گرفت کا انعکاس ہے۔ نوزائیدہ اُنگلیاں۔ چھڑی یا پنسل وغیرہ کو دیکھ کر گرفت میں لے لیگا۔ اور اس کے ساتھ بندر کی طرح چمٹ جائے گا۔ تقریباً ۹۸ فی صدی طبعی بچے اس ذریعے سے اپنا بوجھ بھی اُٹھا سکتے ہیں۔ گرفت کی میعاد سیکنڈ کے کچھ حصے سے لے کر ایک منٹ تک ہے۔ یہ حرکت جو مکمل طور پر فطری ہے۔ پیدائش کے کچھ عرصہ بعد ظاہر ہوتی ہے۔ اور تقریباً چار ماہ کے بعد غائب ہو جاتی ہے۔ جب یہ حرکت غائب ہو جائے تو بعینہٖ یہی حرکت کبھی بھی ظاہر نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر واٹسن متعدد تجربات کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ اس حرکت کا دیر میں غائب ہونا ایک غیر طبعی فعل ہے۔ جو کاہلی اور نشو و نما کی رفتار میں سستی کا باعث ہے۔

گرفت کے انعکاس کے غائب ہونے کے ساتھ ہی بچہ اس شے تک پہنچنے کی کوشش میں کچھ کامیابی حاصل کرلیتا ہے۔ اس میں اس شے کے لئے ہاتھوں کا پھیلانا یا پکڑنا اور بالعموم اپنے منہ میں لے جانا شامل ہیں۔ تقریباً اس وقت تک بچہ اپنے انگوٹھے کو استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ کہ بالغ انسانوں میں سے بعض اپنا دایاں ہاتھ استعمال کرتے ہیں اور بعض اپنے بائیں ہاتھ کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ سوال اُٹھایا جاسکتا ہے۔ کہ کیا بائیں یا دائیں ہاتھ کو ایک دوسرے پر ترجیح دینا جبلی ہے یا موروثی ہے یا اکتسابی ہے۔ اس سوال کا جواب علمی طور پر نہایت ہی کارآمد ہے۔ اگر یہ استعمال جبلی یعنی پیدائشی ہے۔ تو بہتر یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ بچے کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ اور اسے دوسرے ہاتھ کے استعمال پر مجبور نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس ناجائز تشدد سے لکنت کے پیدا ہونے اور دوسری جذباتی کیفیات کے درہم برہم ہو جانے کا شدید اندیشہ ہے۔ لیکن اگر یہ استعمال محض اتفاق کا نتیجہ ہے۔ یا ابتدائی عادات کا نتیجہ ہے۔ تو چونکہ زیادہ تعداد میں انسان دائیں ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر ترجیح دیتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ بچے کو شروع ہی سے دائیں

ہاتھ کے استعمال کی عادت ڈلوائی جائے۔ ڈاکٹر موصوف نے اس سوال کا جواب چار تجربات کی بنا پر دیا ہے :۔

۱۔ بیس نوزائیدہ بچے لئے گئے۔ اور دیکھا گیا کہ وہ کتنے عرصے تک بائیں ہاتھ سے اور کتنے عرصے تک دائیں سے چھڑی کو پکڑ کر اپنے سہارے پر لٹک سکتے ہیں۔ یہ آزمائش پیدائش کے فوراً بعد شروع کی گئی۔ اور متواتر دس یوم تک جاری رکھی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا۔ کہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر کوئی پیدائشی ترجیح نہ تھی۔

۲۔ بچے کی اضطراری۔ لمبی لمبی۔ دائیں بائیں ہاتھ کی حرکات کی پیمائش کی گئی۔ دونوں ہاتھوں کی حرکات کو نہایت ہی احتیاط سے ثبت کیا گیا۔ اس تجربے سے جس کی میعاد تقریباً ۵ منٹ تھی۔ یہ نتیجہ نکلا۔ کہ تقریباً دائیں ہاتھ سے اتنا ہی کام کیا گیا ہے۔ جتنا کہ بائیں ہاتھ سے۔

۳۔ ۵ ماہ سے لے کر ۱۲ ماہ تک کی مختلف عمروں کے بچے لئے گئے۔ اور دیکھا گیا کہ وہ پہلے پہل کسی چیز کے پکڑنے میں کون سا ہاتھ استعمال کرتے ہیں۔ بیس بچوں کا ہفتے میں ایک مرتبہ معائنہ کیا گیا۔ ہر ایک بچے کو تقریباً بیس آزمائشیں دی گئیں۔ تجربے میں مصری کی ڈلی استعمال کی جاتی تھی معلوم ہوا کہ دونوں ہاتھوں میں کسی ایک کو ایک دوسرے پر ترجیح نہیں دی گئی۔ بعض اوقات دایاں ہاتھ استعمال کیا گیا۔ بعض اوقات دوسرا۔

۴۔ آخری آزمائش دائیں اور بائیں ہاتھوں۔ کلائیوں۔ انگلیوں اور ہتھیلیوں کی پیمائش تھی۔ یک صد بچوں کی ایسی پیمائش کی گئی۔ کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔

ان نتائج سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ ایک یا دوسرے ہاتھ کا استعمال فطری نہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ متفقہ طور پر تمام ممالک میں دایاں ہاتھ استعمال کرنے کو کیوں ترجیح دی جاتی ہے؟ کیونکہ اگر اس کی بجائے بایاں ہاتھ استعمال کیا جائے۔ تو کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ یہ درست ہے کہ والدین کی انتہائی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے دوسرے بچوں سے مختلف نہ ہوں۔ شروع ہی سے بچے کو دائیں ہاتھ سے مصافحہ کرنے۔ لکھنے اور دوسرے کام کرنے کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ لڑکیوں کا بھی بعینہ یہی

مال ہے۔ ہاتھوں کے استعمال پر اسی ماحول اور معاشرت کا اثر پڑتا ہے۔

نوزائیدہ کی نشوونما میں ایک چیز اکیلے بیٹھنے کی عادت ہے۔ کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ کہ نوزائیدہ اپنے تمام جسم کو استعمال کرنے کی عادت ڈال رہا ہے۔ ۴½ ماہ کا بچہ دو منٹ تک اکیلا بیٹھ سکتا ہے۔ لیکن جونز اس کی عمرہ ماہ مقرر کرتے ہیں۔ اور گیسل تقریباً چھ ماہ۔ ۶ ماہ کی عمر کے بچے کو ۶ منٹ تک اکیلے بیٹھ سکنا چاہیئے۔ اور اپنے جسم کے بعض حصوں کے ساتھ کھیلنا بھی چاہیئے۔ نیز اپنے کپڑوں کو کھینچنا اور اپنے بستر کو ہاتھوں سے مارنا بھی چاہیئے۔ اکیلے بیٹھنے کے بعد چلنے کا پہلا درجہ رینگنا ہے۔ جہاں سے کھڑے رہنے اور چلنے کا نشوونما ہوتا ہے۔ ۸ یا ۹ ماہ کے بعض بچے کسی چیز کو پکڑ کر کھڑا ہونے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ بچہ کون سی عمر میں چلنا شروع کر دیتا ہے؟ یہ اس کی صحت۔ وزن اور اس حقیقت پر مبنی ہے۔ کہ اس نے گرنے کا تجربہ بھی حاصل کیا ہے یا نہیں۔ چلنا تقریباً ایک سال کی عمر میں یا اس سے ذرا پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ پہلا قدم اُٹھانے کے بعد چلنے کا انحصار جسمانی قوت نشوونما اور والدین کی جرأت دلانے پر ہے۔

فعلیاتی نشوونما کی آزمائشوں سے یہ معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ بچہ اپنی عمر کے مطابق طبعی کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں۔ ایسی آزمائشیں بالعموم معیاری قرار دینے کے بعد استعمال کی جاتی ہیں۔ بینے اور سائموں کی مشہور و معروف آزمائشیں تین سال کی عمر سے پہلے استعمال میں نہیں آتیں۔ کوہلمین کی آزمائشیں ۳ - ۶ - ۱۲ - ۱۸ اور ۲۴ ماہ کے بچوں کے لئے نہایت ہی مفید ہیں۔ ان آزمائشوں کا انحصار زیادہ تر انعکاسات کی موجودگی سے ہے۔ کوہلمین کی سکیم کے مطابق تین ماہ کے طبعی بچے کو اس قابل ہونا چاہیئے کہ

۱۔ اپنے ہاتھ یا کسی اور شئے کو اپنے مُنہ تک لے جا سکے۔
۲۔ ناگہانی آواز مثلاً تالی کی آواز سے چونک پڑے۔

۳۔ کسی روشنی یا منوّر اشیاء پر اپنی نگاہ قائم کر سکے۔ یا اپنی آنکھوں سے متحرک منوّر اشیاء کا تعاقب کر سکے۔

۴۔ جو چیز اس کی نگاہ کے خط سے ذرا دُور ہے۔ اپنی آنکھیں یا سر اور آنکھیں دونوں ارادۃً ادھر لے جا سکے۔ اور

۵۔ جب کوئی چیز اچانک اس کی آنکھوں کے قریب لائی جائے۔ تو وہ اپنی آنکھیں فوراً جھپک لے۔

۶ ماہ کے طبعی بچے کو مندرجہ بالا آزمائشوں کے علاوہ اس قابل ہونا چاہیئے کہ وہ اکیلا بیٹھ سکے۔ اپنے انگوٹھے کو انگلیوں کے مقابلے میں زیادہ استعمال کرے۔ اور جو چیزیں اس کی نگاہ کے سامنے آئیں۔ ان تک پہنچ سکیں۔ ۱۲ ماہ کے بچے کو اس قابل ہونا چاہیئے۔ کہ وہ دو یا تین الفاظ کی صدا نکال سکے۔ پنسل سے کاغذ پر نشان لگا سکے۔ اور بعض چیزوں جیسے گیند اور گڑیا وغیرہ میں فرق کر سکے۔ ۱۸ ماہ تک اسے اس قابل ہو جانا چاہیئے۔ کہ وہ اپنی خوراک کے لئے چمچہ استعمال کر سکے معمولی سوالات کو سمجھ سکے۔ اور دیکھی ہوئی چیزوں کی تصویریں پہچان سکے۔ اور ان میں دلچسپی لے سکے۔ ۲ سال کی عمر میں معمولی احکام مثلاً "بیٹھ جاؤ"۔ "ادھر آؤ"۔ پر عمل کرنے کے قابل ہو جانا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اسے اس قابل بھی ہونا چاہیئے۔ کہ ایک دائرے کی شکل کی نقل اُتار سکے معمولی حرکات کی تقلید کر سکے۔ اور عام چیزوں مثلاً کتے۔ بلی اور آدمی وغیرہ کی تصویر کو پہچان سکے۔ ان آزمائشوں کی کامیابیوں یا ناکامیوں کے مطابق بچے کی ذہنی عمر کا صحیح صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

بچوں کے لئے مرل پامر (Merill Palmer) کی تیار کی ہوئی اتمامی آزمائشیں نہایت ہی دلچسپ اور مفید ہیں۔ کُل نوّے آزمائشیں ہیں۔ جو ۱۸ ماہ کے بچے سے لے کر ۶ سال کی عمر تک کے بچے کے لئے کارآمد ہیں۔ ان آزمائشوں کا پہلا گروہ

جو گیارہ پر مشتمل ہے۔ ۱۸ ماہ سے لے کر ۲۶ ماہ کے بچوں کے لئے ہے۔ جو گروہ ایک خاص عمر کے لئے معین ہے۔ اس کو سارا حل کر لینے سے ذہنی عمر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ۲ یا ۲½ سال کے طبعی بچے کے لئے ضروری ہے۔ کہ چار معمولی الفاظ دُہرا سکے۔ شیشے میں سے اپنی شکل کو پہچان سکے۔ سولہ لکڑی کے مکعبوں کو زیادہ سے زیادہ ۱۲۵ سیکنڈوں میں بکس میں فٹ کر سکے۔ قسم قسم کی کھونٹیاں تختے میں مناسب جگہ پر رکھ سکے۔ ۴ مختلف حجم کے مکعب جو ایک طرف سے کھلے ہوں۔ ایک دوسرے میں اس طرح رکھ سکے۔ کہ وہ سارا ایک بکس بن جائے۔ دس آسان آسان سوالات میں سے چھ کا درست جواب دے سکے قینچی سے کاغذ کاٹ سکے۔ اور آسان فقرے دُہرا سکے۔ ان آزمائشوں کا مقصد یہ ہے کہ بچہ عام چیزوں کو پہچان سکے۔ [اس شکل میں چند ایسی ہی آزمائشوں کو دکھایا گیا ہے]۔

اب ہم تصویر کے دوسرے رُخ کی طرف توجہ مبذول کرتے ہیں۔ جس کی میکانیت کا سمجھنا بچے کے صحیح صحیح نشو و نما کے لئے اشد ضروری ہے۔ ڈاکٹر واٹسن کو چند گھنٹوں کے نوزائیدوں پر آزمائش کرنے سے یہ پتہ چلا۔ کہ طبعی حالات میں پیدائش کے فوراً بعد تمام بچے تین اور صرف تین جذبوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ یعنی خوف۔ غصہ اور محبت۔ یہاں محبت سے مراد جلد پر ہاتھ پھیرنے سے خوش گوار اثر کا محسوس کرنا ہے۔ بالفاظ دیگر بچہ اپنے وقتِ ولادت ہی سے چاہتا ہے کہ کوئی اس پر ہاتھ پھیرے اور پیار کرے۔ بقول ڈاکٹر موصوف یہی اساس محبت ہے۔ بالغ انسان کی جذباتی زندگی ان ہی تین اساسی جذبات پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے بچوں کو خاص خاص طریقوں سے برانگیختہ کرکے نہ صرف ان کے بشرے اور حرکات و سکنات کو ملاحظہ کیا۔ بلکہ ان کی متحرک تصاویر بھی لیں۔ ان دلچسپ تجربوں سے یہ حقیقت منکشف ہوئی۔ کہ بچوں میں دو طرح پر خوف کے جذبے کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بچے صرف یک بارگی زور کی آواز اور سہارے کے ہٹ جانے یعنی گرنے سے بہت ڈرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز سے نہیں ڈرتے۔

بچے کو غصے میں لانے والی دو باتیں یہ ہیں۔ اس کی حرکتوں کو روکنا۔ مثلاً ہاتھوں کو پہلوؤں سے باندھ دینا۔ اور بھوک۔ اس کے علاوہ بچے اور کسی چیز سے غصے میں نہیں آتے۔ محبت کا اثر پیدا کرنے کے لئے واٹسن نے معلوم کیا۔ کہ آہستہ آہستہ جسم بالخصوص جسم کے حساس حصوں پر ہاتھ پھیرنے سے یہ کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ہر بالغ انسان کی جذباتی زندگی تشریط کے عمل کے ذریعے سے خوف۔ غصہ اور محبت کے تین اساسی جذبات پر قائم ہے۔ دوسرے جذبات کی دریافت کے لئے واٹسن نے چند تجربے ۴ ماہ کی عمر سے لے کر ۱۲ ماہ تک کی عمر کے بچوں پر کئے۔ ایسے تمام بچوں کی پرورش ڈاکٹر موصوف کے زیر نگرانی شفا خانے میں ہوئی تھی۔ ان بچوں نے نہ تو کوئی ایسا جانور ہی دیکھا تھا۔ اور نہ ہی کوئی شے جن کو آزمائش میں استعمال کرنا تھا۔

سب سے پہلے بچے کو تجربہ گاہ میں اس کی ماں یا مددگار کی گود میں آرام سے بٹھا دیا گیا۔ بہت سے جانور باری باری سے تجربہ گاہ کے سامنے لائے جاتے۔ اور بچے کا ردِ فعل بغور دیکھا جاتا۔ جب ایک سیاہ رنگ والی بلی بچے کے قریب سے گذاری گئی۔ تو بچہ مطلق خائف نہ ہوا۔ اسی طرح کبوتر۔ خرگوش اور سفید چوہے سے بھی بچے نے خوف کا اظہار نہ کیا۔ برعکس اس کے بچوں نے ان تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ایک بچے نے تو خرگوش کا کان اپنے منہ میں ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ ہر ایک بچے کو چڑیا گھر میں لے جا کر جانوروں کے بالکل قریب لایا گیا۔ نتیجہ یہی تھا۔ کہ کسی بچے نے بھی مطلق خوف کا اظہار نہ کیا۔

واٹسن نے یہاں سے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ بچوں کے تمام دوسرے خوف ابتدائی شیر خوارگی کے زمانے میں لاحق ہو جاتے ہیں۔ جیسے سانپوں کا خوف۔ اندھیرے کا خوف۔ بالدار جانوروں کا خوف۔ کتے کا خوف وغیرہ۔ ایسے تمام خوف "انعکاس مشروط" کے ذریعہ لاحق ہو جاتے ہیں۔ اس کے ثبوت میں ڈاکٹر موصوف نے ایک بچے البرٹ کو لیا۔ اس

بچّے کی عمر گیارہ ماہ تھی۔ اور اس کی صحت نہایت عمدہ تھی۔ یہ بچہ خرگوش اور دوسرے بالدار جانوروں سے بالکل خائف نہ تھا۔ جب خرگوش کو اس کے قریب لایا گیا۔ تو اس نے مسرت کا اظہار کیا۔ لیکن بچہ زور کی آواز سے فطرتاً ضرور خائف تھا۔ پھر موصوف نے عمداً بچے کو خرگوش سے ڈرنا سکھلا دیا۔ اس کا طریقہ یہ تھا۔ ایک دن جب بچہ خرگوش سے کھیل رہا تھا۔ تو ڈاکٹر نے بچے کے بہت قریب ہتھوڑے کے ذریعے سے اچانک بہت زور کی آواز پیدا کی۔ اس دفعتہً زور کی آواز سے بچہ ڈر گیا۔ بچے کے ذہن میں یہ آواز خرگوش کی موجودگی سے وابستہ تھی۔ اس لئے اس کے بعد چند دفعہ جب اس عمل کی تکرار کی گئی۔ تو بچہ نہ صرف خرگوش سے بلکہ تمام بالدار جانوروں سے ڈرنا سیکھ گیا۔ اس عمل کا نام "انعکاس مشروط" ہے۔

اسی طریقے سے لوگوں کے بچپنے میں خوفوں کا ایک "خوفناک مجموعہ" تیار ہو جاتا ہے۔ اور بچہ تاریکی سے بھی ڈرنا سیکھ جاتا ہے۔ تاریکی کے خوف کے لاحق ہو جانے کا باعث اغلباً یہ ہے کہ جب بادل کی گرج یا کھڑکیوں کی کھڑکھڑاہٹ وغیرہ سے اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ تو بچہ اس آواز کو اس تاریکی سے وابستہ کر لیتا ہے۔ اور اس طرح اندھیرے سے ڈرنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی طرح بچوں کے مختلف خوف فطری ہونے کی بجائے سراسر اکتسابی ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا تجربات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہ بچے کے بہت سے خوف نہ صرف فضول ہی ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات بچے کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا کہ بچے نے وہ خاص خوف کیسے حاصل کئے ہیں تعلیمی مسائل کے لئے نہایت ضروری ہے کیونکہ صرف اس ذریعے سے خوف کے اس خطرناک مجموعے کی حقیقت کو دریافت کر کے دور کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم تحقیق سے یہ معلوم کر لیں۔ کہ بچہ پہلے پہل کتے یا تاریکی سے کیسے ڈرا۔ تو ہم یقیناً اس خوف کو دور کرنے میں بہت بڑی حد تک کامیاب ہو سکیں گے۔ علاوہ ازیں بطور حفظ ماتقدم ہم بچے کو مختلف فضول خوفوں سے محفوظ بھی رکھ سکتے ہیں۔ اس عمل کو جس سے اکتسابی خوفوں اور بدعادات کو رفع کیا جا سکتا ہے۔ "عمل بازتشریط" کہتے ہیں۔

عمل باز تشریط" انعکاس مشروط" کی ضد ہے۔ خوف والی شئے کو کسی ایسی چیز کے ساتھ پیوستہ کرکے تشریط کہا جاتا ہے۔ جو بچے کے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث ہو۔ اور جس کو دیکھ کر بچہ بغایت محبت کا اظہار کرسکے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے۔ کہ خوف والی چیز کا ردّ فعل نفی کی بجائے اثبات میں ہو۔ مثال کے طور پر اس ننھے البرٹ ہی کو لیجئے۔ جو خرگوش سے ڈرنا سیکھ گیا تھا۔ اس بچے کو دلیا بہت پسند تھا۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا۔ کہ اس خوفناک شئے کو اس وقت بچے کے قریب لایا گیا۔ جب کہ اسے کھانے کے لئے دلیا دیا گیا۔ لیکن اس عمل کو آہستہ آہستہ کیا گیا۔ کیونکہ اگر جلدی سے کام لیا جاتا۔ تو اس کا نتیجہ یقیناً معکوس ہوتا۔ یعنی ممکن تھا۔ کہ بچہ دلیئے ہی سے متنفر ہو جاتا۔ پہلی مرتبہ خرگوش کو بچے کی کرسی سے کافی فاصلے پر رکھا گیا۔ اس کے بعد ہر دفعہ اس کو نزدیک تر کیا گیا۔ رفتہ رفتہ بچہ خرگوش سے مانوس ہو گیا۔ اور اس کا بالدار جانوروں کا خوف جاتا رہا۔

یہ طریقہ عملی لحاظ سے یقیناً بہت ہی مفید ہے۔ اگر کسی ماہر نفسیات کے ساتھ مل کر اس کو استعمال کیا جائے۔ تو نتیجہ نہایت ہی اطمینان بخش ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر واٹسن کو تو اس طریقے پر اتنا بھروسہ ہے۔ کہ وہ ڈنکے کی چوٹ سے اعلان کر رہے ہیں:۔

"آپ مجھے چند صحیح الخلقت اور تندرست بچے لادیں۔ اور جو ماحول ان کے لئے مطلوب ہو مہیا کر دیں۔ پھر میرا ذمہ ہے۔ کہ میں انہیں جس فن کا ماہر بنانا چاہوں گا۔ بنالوں گا۔ ڈاکٹر۔ بیرسٹر۔ صنّاع یا تاجر — ہاں اور ڈاکو یا چور۔ خواہ ان کا میلان ان کے ہم نشین۔ والدین یا ابنائے جنس کی عادات اور رجحانات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو"؟

اصطلاحی غور و فکر

(۱)

اصطلاحات

101. Intermediate Examination

لفظی ترجمے کے لحاظ سے درمیانی امتحان، متوسط امتحان، وسطی امتحان اور
انی امتحان چاروں مفہوم کے قریب ہیں۔ "مابینی امتحان" سے ہمیں اتفاق نہیں۔ "میانی
ان" بھی کچھ نا مناسب سا ہے۔ "آزمائش" کی جگہ امتحان ہی بہتر ہے۔ مندرجہ بالا چار
ں میں سے "وسطانی امتحان" اچھا اور موزوں معلوم ہوتا ہے۔

102. Aggregate.

لفظی معنی کی رو سے "کل" اور "جملہ" بھی اس کا مفہوم صحیح ادا کرتے ہیں۔ لیکن
انی اصطلاح کے لحاظ سے "بحیثیت مجموعی" اور "مجموعی" مناسب ہیں۔ اور ان دو
اسے "مجموعی" زیادہ اچھا اور موزوں ہے۔

103. Diploma

اس کے لئے مختلف ترجمے موصول ہوئے ہیں :-

اعزازی سند، سرکاری کاغذ، ڈپلوما، جامعہ کی سند، دفتری دستاویز، سند، سند فضیلت، دستاویز فضیلت۔

"اعزازی" کی قید کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ باقاعدہ امتحان پاس کرنے پر جو ڈپلوما ملے۔ اس کے لئے اعزازی کے لفظ کا اطلاق نارد ہوگا۔ "ڈپلوما" کوئی بُرا نہیں لیکن اس کے مقابلے میں کوئی اچھا لفظ ملے۔ تو اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ "دفتری دستاویز" تو ناموزوں ہے۔ "سند فضیلت" اور "سند" مناسب ہیں۔ لیکن ان کے مقابلے میں "جامعی سند" زیادہ قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے۔

104. Remuneration

زرعوضانہ، عوض، نذرثمن، انعام، حق الخدمت، صلہ، معاوضہ، اُجرت،

یہ تمام اپنی اپنی جگہ اچھے ترجمے ہیں۔ اور مختلف مواقع کے لحاظ سے ان کا استعمال مناسب ہوگا۔ لیکن ایک عام اور جامع اصطلاح کی خاطر ان تمام میں سے "معاوضہ" قابل ترجیح معلوم ہوتا ہے۔ "معاوضہ" ہر قسم کی اُجرت کے سلسلے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

105. Testimonial

تصدیق، تصدیقی بیان، شہادت، سرٹیفکیٹ، سند، صلہ خدمت، تصدیقی کاغذ

"صلہ خدمت" Testimonial کا صحیح مفہوم ادا نہیں کرتا۔ باقی سب ترجمے مفہوم کے قریب قریب ہیں۔ لیکن مواقع استعمال کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ مثلاً "شہادت" اگرچہ سب جگہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن عدالتوں کے لئے مخصوص ہوگیا ہے۔ سرٹیفکیٹ انگریزی لفظ ہے۔ اور صحیح تلفظ کے ساتھ اُردو میں اس کا استعمال دشوار سا ہے۔ اس لئے Testimonial کے لئے "تصدیقی دستاویز" مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اختصار کے

لحاظ سے صرف "تصدیق" بھی اچھا ہے۔

106. Privilege Leave

رعایتی رخصت، مستثنیٰ رخصت، حقی رخصت، استحقاقی رخصت، حاصل کردہ رخصت، جمع شدہ رخصت، بجا رخصت،

Privilege Leave اگرچہ ایک قسم کی رعایت ہے۔ اور عام رخصتوں کے قوانین سے مستثنیٰ بھی ہے۔ اور ہر ملازم کے عرصۂ ملازمت کی بنا پر بطور حق ملتی ہے۔ لیکن اس کے لئے صرف "رعایتی رخصت" یا "مستثنیٰ رخصت" یا "حقی" رخصت کہنا موزوں نہیں ہوگا۔ کیونکہ ان میں سے کسی ایک ترجمے سے Privilege کے تمام پہلو مدِنظر نہیں رہتے۔ اور صرف رعایت یا حق، یا مستثنیٰ کا لفظ مبہم سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ رعایت کے طور پر اور رخصتیں بھی مل سکتی ہیں۔ "ہنگامی رخصت" بھی تو ملازم کے حق میں شامل ہے۔ تمام قوانین کی رو سے ملنے والی رخصتوں کے علاوہ کسی اور رخصت کو مستثنیٰ کہا جا سکتا ہے۔ "حاصل کردہ"، "جمع شدہ" اور "بجا" بہت نامناسب ہیں۔ "حاصل کردہ" سے تو وہ رخصت ہی مراد ہو سکتی ہے۔ جو لی جا چکی ہو۔ "جمع شدہ" میں Privilege. کے سوا اور بھی تو آسکتی ہیں۔ "بجا" تو ہر درست طور پر قوانین کے ماتحت حاصل کردہ رخصت کے استعمال ہو سکتا ہے۔ اور اس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے کہ Privilege Leave کے علاوہ باقی تمام قسم کی رخصتیں بے جا ہیں Privilege Leave. کے لئے بہترین ترجمہ "استحقاقی رخصت" ہے۔ اس کے رواج میں کسی قسم کی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔

107. Syndicate.

شرکت، سنڈیکیٹ، مجلس منتظمہ، بزمِ اہتمام، تنظیم،

یوں تو سنڈیکیٹ کے مستعمل رہنے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن اس کے مقابلے باقی تمام ترجموں کی بجائے "ناظمہ" کا لفظ زیادہ مختصر اور مناسب ہوگا۔ چنانچہ

University of the Syndicate کے لئے "ناظمہ جامعہ" کہنا اچھا رہے گا۔

108. Secretariat

مراکز دفاتر، سیکریٹریٹ، دفاتر معتمد،

ان سب کے مقابلے میں "معتمدیہ" زیادہ مناسب ہے۔ تلفظ کے لحاظ شاید اس لفظ کی عربیت بعض نازک و لطیف اذہان پر گراں گذرے۔ لیکن سیکریٹریٹ کا لفظ بھی کچھ اس قسم کی دِقّت سے مبرّا نہیں۔

109. Plenipotentiary.

وکیل مطلق، مختارِ کل، سفیر با اختیارات تمیزی، سفیر بہ اختیارات کامل، مدارالمہام سفیر بہ اختیارات غیر محدود، سفیر با اختیارات غیر مشروط، ان سب میں سے "مدارالمہام" اچھا ہے۔ لیکن Plenipotentiary کے مفہوم کی وضاحت کے لئے بہتر ہے کہ "سفیرِ با اختیار" اختیار کیا جائے۔

110. Status quo.

"بدستور" اور "حالت موجودہ" دونوں درست ہیں۔ لیکن "بدستور" قابل ترجیح ہے ؛

(ب)

اصطلاحات زیر غور

111. Calendar, 112. Matriculation Examination.

113. Middle School Examination. 114. S.L.C. Examination.

115. Degree Examination.

116. Schedule.

117. Affiliation.

118. Extension.

119. Inspection.

120. Rector.

121 Convocation.

122. Substitute.

123. Initiative

124. Mass - Drill.

125. Stamped.

126. Mandate.

127. Substantive.

128. Conference.

129. Balance - Sheet.

130. D. O.

131. Precedence.

132. Priority.

133. Substitute.

134 Forwarding letter.

135 Communique,

136. Accountant.

137. Stenographer.

128. Undersigned.

139. Interview.

140. Demonstrator.

سال تعلیمی (۴۹-۱۹۴۸) میں

سنٹرل ٹریننگ کالج کے مشاغل

سنٹرل ٹریننگ کالج میں اس تعلیمی سال میں بڑی گہما گہمی رہی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ توسیعی تقاریر:

نومبر ۱۹۴۸ء سے توسیعی تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور تعلیمی موضوعات پر تقریباً ۱۲ تقاریر ہوئیں۔ سلطان محمود صاحب غزنوی نے "اطفالِ مدارس میں ضبط" پر تقریر فرمائی' بی۔ ایل رلیا رام صاحب سیکرٹری وائی۔ ایم۔ سی۔ اے نے "تعلیم بالغان" کے موضوع پر اظہارِ خیال فرمایا' مسٹر اے ڈی اظہر صاحب سیکرٹری فنانس ڈیپارٹمنٹ نے آسٹریلیا کی تعلیمی درسگاہوں کے متعلق اپنے مشاہدات و تاثرات بیان فرمائے۔ ڈاکٹر محمد موسیٰ اسسٹنٹ ڈائرکٹر محکمہ صحت و تغذیہ نے "صحت بخش خوراک" پر مفید معلومات بہم پہنچائے۔ ڈاکٹر رائیس صاحب پرنسپل ایف سی کالج لاہور نے "امریکہ میں تعلیم" کے عنوان پر لیکچر دیا۔ ڈاکٹر غلام محی الدین صاحب ڈی لٹ نے "استاد بحیثیت معمارِ قوم" کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار

فرمایا۔ "تکان اور اس پر غلبہ پانے کے طریق" کے موضوع پر ڈاکٹر ایوب خان کا ایک عالمانہ مقالہ پڑھا گیا۔ مسٹر عرفان ایم اے نے جو حال ہی میں امریکہ سے واپس آئے ہیں مندرجہ ذیل مختلف موضوعات پر مختلف اوقات میں تقاریر فرمائیں :۔

(۱) امریکہ کی وہ درسگاہیں جہاں اساتذہ تربیت پاتے ہیں۔

(۲) بالغین و بالغات کے تقاضے۔

(۳) امریکہ میں ثانوی تعلیم کے مقاصد۔

(۴) غیر نصابی مشاغل۔

۲۔ تعلیمی فلمیں :

مختلف تعلیمی مضامین میں دلچسپی پیدا کرنے اور عام معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر تقریباً ہر ہفتے طلبہ کو تعلیمی فلمیں دکھائی جاتی رہی ہیں۔ یہ سلسلہ باقاعدگی سے جاری رہا۔ اور طلبہ اس میں کافی دلچسپی لیتے رہے۔

۳۔ میلادالنبیؐ کی تقریب سعید :

میلادنبیؐ کی تقریبِ سعید کے موقعہ پر ۱۳ جنوری ۱۹۴۹ء کو ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب بارایٹ لاء کی زیر صدارت ٹریننگ کالج ہال میں اجلاس قائم ہوا۔ پروگرام میں اساتذہ اور طلبہ نے گرمجوشی سے حصّہ لیا۔ سید خیر محمدؐ صاحب ترمذی ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ مغربی پنجاب نے ایک نہایت عالمانہ اور فکر انگیز تقریر فرمائی۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب نے بھی تقریر فرمائی۔ اور اس بے سکون و پر آشوب زمانہ میں اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت پر زور دیا۔ اجلاس کے بعد غریبوں میں کھانا تقسیم کیا گیا۔

۴۔ مجلس طلبائے قدیم :

مجلس طلبائے قدیم کو اس غرض سے نئی تشکیل دی گئی ہے۔ کہ یہ پاکستان کی جدید ضرورتوں کے مطابق کوئی قومی و تعلیمی خدمت سرانجام دے سکے۔ اس کے قواعد و ضوابط پر نظرِ ثانی

کی گئی ہے۔ اور اس کا لائحہ عمل تیار کر لیا گیا ہے۔ اس کے چار عام اجلاس ہو چکے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے کانووکیشن (جلسہ تقسیم اسناد) کے موقعہ پر قدیم طلبہ ایک عصرانہ پر جمع ہوئے۔ این ای ایف کی کانفرنس کے موقعہ پر بھی اس کا ایک اجلاس ہوا۔

۵۔ این ای ایف کانفرنس:

صوبہ مغربی پنجاب کی این ای ایف کی مجلس نے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں ۲۸، ۲۹ اور ۳۰ جنوری ۱۹۴۹ء کو اپنی عالیشان کانفرنس منعقد کی۔ صوبے کے مختلف حصوں سے ایک ہزار سے زائد مندوبوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ تین دن کا پروگرام نہایت کامیابی سے سرانجام ہوا۔ تمام نشستوں میں کانفرنس کا پنڈال حاضرین سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ خواتین کے لئے ایک علیحدہ مخصوص نشست قائم ہوئی۔ اس کانفرنس میں وقت کے اہم تعلیمی مسائل مثلاً تعلیم بالغان، تعلیم صحت جسمانی، ابتدائی و ثانوی تعلیم، تربیت اساتذہ وغیرہ زیر بحث آئے۔ اعلےٰ مقررین و ماہرین تعلیم نے تقریریں کیں۔ اور مقالے پڑھے۔ ایک اعلےٰ پیمانے پر تعلیمی نمائش بھی قائم ہوئی۔ جو بہت سے ماہرین تعلیم کے لئے جاذب توجہ ثابت ہوئی۔ اور سب نے اس میں خاص دلچسپی لی۔ کانفرنس کے اختتام کے بعد دو دن تک یہ نمائش جاری رہی۔ کانفرنس ہر طرح سے کامیاب رہی۔ سنٹرل ٹریننگ کالج کے اساتذہ اور طلبہ نے اس میں گرمجوشی سے حصہ لیا۔

۶۔ سکاؤٹس کے لئے عصرانہ اور ڈنر:

۱۱ مارچ کو سنٹرل ٹریننگ کالج ہال میں آسٹریلیا سے واپس آنے والے سکاؤٹوں کو ہیڈ ماسٹرز ایسوسی ایشن کی طرف سے عصرانہ (چائے) اور پنجاب بوائے سکاؤٹس ایسوسی ایشن کی طرف سے ڈنر دیا گیا۔ یہ ایک نہایت پُر لطف تقریب تھی۔

۷۔ فوجی تربیت:

سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے طلبہ دو سے زیادہ مہینوں تک فوجی تربیت حاصل

لیتے رہے ہیں۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں فائرنگ کے سلسلے میں ان کی ایک ابتدائی آزمائش ہوئی۔ جس کا نتیجہ بہت تسلی بخش تھا۔

۸۔ اسکولوں کے طلبہ کا تقریری مقابلہ :

سنٹرل ٹریننگ کالج کی طرف سے مقامی ثانوی مدارس کے طلبہ کا تقریری مقابلہ پانچ مارچ ۴۹ء کو دو بجے بعد از ظہر ٹریننگ کالج ہال میں زیرِ صدارت جناب قاضی محمد اسلم صاحب صدر شعبہ نفسیات گورنمنٹ کالج لاہور منعقد ہوا۔ بہت سے مقامی اسکولوں نے حصہ لیا۔ مولوی ظفر اقبال صاحب انسپکٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوشنز، ڈاکٹر محمد صادق صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج اور مولوی غلام رسول مہر صاحب بحیثیت منصفین تشریف فرما تھے۔ تقریری مقابلہ کے لئے مندرجہ ذیل موضوع مقرر تھے :۔

(۱) کشمیر اور اہلِ کشمیر کی بقائے حیات کے لئے کشمیر کا پاکستان کے ساتھ الحاق ضروری ہے۔

(۲) مغربی پنجاب کے نئے انتخابات بالغوں کی رائے پر موقوف ہونے چاہئیں۔

(۳) پاکستان کی حکومت اسلامی اصولوں پر قائم ہونی چاہیئے۔

(۴) اسلامی تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ مدرس عملاً اسلامی اصولوں کا پابند ہو۔

(۵) مدرسوں میں جسمانی سزا اور جرمانہ بالکل بند کر دینا چاہیئے۔

ہر اسکول میں سے دو دو طلبہ نے حصہ لیا۔ لئیق احمد طالب علم سنٹرل ماڈل اسکول لاہور اول رہا اور اسے ایک طلائی تمغہ انعام میں ملا۔ فقیر اللہ طالب علم مسلم ہائی اسکول لاہور چھاؤنی دوم رہا اور ایک نقرئی تمغہ انعام میں حاصل کیا۔ شمشاد الحسن طالب علم سنٹرل ماڈل اسکول کی تقریر کی بھی تعریف کی گئی۔ اسکولوں میں سے سنٹرل ماڈل اسکول اوّل اور مسلم ہائی اسکول لاہور چھاؤنی دوم رہا۔ تمام حصہ لینے والے طلبہ کو سندیں دی گئیں۔

۹۔ تجدیدی اسباق (ریفریشر کورس) کا سلسلہ:

سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں اپریل ۱۹۴۹ء سے مندرجہ ذیل چھ مختلف نوعیتوں کے دہ روزہ تجدیدی اسباق کا سلسلہ جاری کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

(۱) ابتدائی مدارس کے اساتذہ کے تجدیدی اسباق۔ ۴ر اپریل ۱۹۴۹ء سے ۱۴ر اپریل ۱۹۴۹ء تک

(۲) جسمانی تعلیم کے اساتذہ	"	۲ر مئی ۱۹۴۹ء سے ۱۲ر مئی ۱۹۴۹ء تک
(۳) ڈرائینگ کے اساتذہ	"	۱۶ر مئی ۱۹۴۹ء سے ۲۶ر مئی ۱۹۴۹ء تک
(۴) ہائی اسکولوں کے اساتذہ	"	۶ر جون ۱۹۴۹ء سے ۱۶ر جون ۱۹۴۹ء تک
(۵) ارباب نظارت (انسپکشن سٹاف)	"	۲۰ر جون ۱۹۴۹ء سے ۳۰ر جون ۱۹۴۹ء تک
(۶) نارمل اسکولوں کے اساتذہ	"	۲۶ر ستمبر ۱۹۴۹ء سے ۶ر اکتوبر ۱۹۴۹ء تک

۱۰۔ تعلیم بالغان کے لئے اساتذہ کی تربیت کا اہتمام:

سنٹرل ٹریننگ کالج میں تعلیم بالغان کے لئے مخصوص اساتذہ کی تربیت کا ایک مرکز کھولا جا رہا ہے۔ اور اُمید ہے کہ وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ مرکز بہت مفید ثابت ہوگا۔

۱۱۔ سابق فوجیوں کی تربیت:

سابق فوجی ملازمین کے لئے ایک ڈرل کلاس کھولی جا رہی ہے۔ جس میں ان سابق فوجیوں کو ایک ماہ کی تربیت کے بعد ڈرل ماسٹری (معلم تربیت جسمانی) کی سند دی جائے گی۔

مختلف جماعتوں کا داخلہ:

سنٹرل ٹریننگ کالج میں بی ٹی، سی ٹی اور ڈرائینگ ماسٹر کلاسوں کا داخلہ پانچ جون ۱۹۴۹ء سے شروع ہوگا۔

بی ٹی کے لئے بی اے پاس اور سی ٹی کے لئے ایف اے پاس ہونا ضروری ہے۔ تمام عرضیاں پرنسپل صاحب سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے نام آنی چاہئیں۔ مزید تفصیلات دفتر پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔

سرکاری جریدہ کے اعلانات

سررشتۂ تعلیم مغربی پنجاب

صیغہ رجال ——— شعبہ کالج

خ و ہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
جنوری سنہ ۴۹ء ۱۹۰	م - محمد خورشید ایم اے انگریزی II	قائم مقام لیکچرار انگریزی گورنمنٹ کالج لائل پور (محمد شمس الدین کی جگہ جو رخصت پر ہیں)	قائم مقام لیکچرار انگریزی گورنمنٹ کالج لائل پور بشاہرہ ۱۵۰-۱۰-۳۵۰ شعبہ کالج	۳ ردسمبر سنہ ۴۸ء سے	ایک خالی اسامی کی جگہ -
جنوری سنہ ۴۹ء ۳۶۶	محمد صادق ایم اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائلپور ۱۵۰-۱۰-۳۵۰		۱۰ ر اکتوبر سنہ ۴۸ء سے	اپنے درجہ مشاہرہ اور تقرر میں مستقل قرار دئے گئے ہیں -
جنوری سنہ ۴۹ء ۴۰۶	محمد اسحاق ابراہیم اُپل ایم اے بی ایس سی بی ٹی ہائی ڈپلوما اِن ایجوکیشن ڈی سی ڈی سی اے اے ڈبلیو	لیکچرار تعلیمی دستکاری سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور		۱۷ ردسمبر سنہ ۴۸ء قبل از دوپہر سے	اپنے تقرر اور درجہ مشاہرہ عملہ فوقانی دوم میں مستقل قرار دئے گئے ہیں -
جنوری سنہ ۴۹ء ۳۴۴	م - فیاض الدین ایم اے	لیکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور	لیکچرار سیاسیات گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان - بشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م - امیر محمد خان کی جگہ جو مستعفی ہو چکے ہیں -
مارچ سنہ ۴۹ء ۴۹	ممتاز احمد بی اے بی ٹی نمبر ۱۷ (۹۰-۱۵۰)	معلم تعلیمی دستکاری سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور		۱۴ رنومبر سنہ ۴۸ء سے	اپنے تقرر اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے -
مارچ سنہ ۴۹ء ۵۲۶	م - محبوب شاہ ہاشمی ایم ایس سی	لیکچرار گورنمنٹ کالج لاہور (۱۵۰-۱۰-۳۵۰)		یکم اکتوبر سنہ ۴۸ء سے	"
مارچ سنہ ۴۹ء ۵۳۱۹	مسٹر ایل - برچ ایم اے بی ٹی	لیکچرار سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور (۱۵۰-۱۰-۳۵۰)		یکم اکتوبر سنہ ۴۸ء سے	اپنے تقرر اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں -
اپریل سنہ ۴۹ء ۶۱۲۵	م - محمد اسمٰعیل ایم اے	لیکچرار ریاضیات گورنمنٹ کالج لاہور	لیکچرار ریاضیات گورنمنٹ کالج جھنگ - بشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م - نورالدین ایم اے کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے -
"	س - م - یٰسین ایم اے ریاضیات I	ایک امیدوار جن کے لیکچرار ریاضیات گورنمنٹ کالج جھنگ کی حیثیت سے تقرری کے احکام جاری ہو چکے ہیں -	قائم مقام لیکچرار ریاضیات گورنمنٹ کالج لاہور - بشاہرہ (۱۵۰-۱۰-۳۵۰)	"	م - محمد اسمٰعیل کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا ہے -

صیغہ رجال ــــ شعبہ اسکول

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲ر فروری سنہ ۴۹ء 2225-E	م۔ محمد اسلم ایس وی (۵۰ــ۱۰۰)	معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول چکوال۔	معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول جہلم۔ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال کی فالتو اسامی کی جگہ جو اب گورنمنٹ ہائی سکول جہلم منتقل کی جا رہی ہے۔ ایک ضمیمہ معلم کی حیثیت سے۔
″	م۔ نور حسین ایس وی	ایک امیدوار	قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول چکوال۔ (۵۰۔۳۔۸۰/۴ــ۱۰۰)	″	م۔ محمد اسلم کی جگہ جن کا تبادلہ بحیثیت زائد معلم جہلم طرف ہو چکا ہے۔
۲ر فروری سنہ ۴۹ء 2222-E	م۔ محمد حفیظ بی اے بی ٹی نمبر ۱۳۸ (۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ	معلم انگریزی گورنمنٹ نارمل سکول شاہپور صدر بمشاہرہ سابقہ	″	م۔ محمد حیات بی۔ اے ایس وی کی جو تبدیل ہو کر نائب ناظم مدارس ضلع گجرات مقرر ہوئے ہیں
۱۹ فروری سنہ ۴۹ء 2665-E	م۔ فضل کریم نمبر ۱۴۱ (۱۴۰ــ۱۰ــ۲۲۰)	معلم اردو گورنمنٹ ہائی سکول گوجرانوالہ۔	معلم اردو گورنمنٹ نارمل سکول لالہ موسیٰ بمشاہرہ سابقہ	″	م۔ نظام الدین کی جگہ جو ۲۸ کو ملازمت سے سبکدوش ہو رہے
۲۲ر فروری سنہ ۴۹ء 3954-E	م۔ طالع مند بی اے بی ٹی نمبر ۳۳ (۱۵۰-۲۲۰)	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کہروڑ پکا۔ ضلع ملتان	صدر معلم گورنمنٹ ہائی سکول چونیاں ضلع لاہور۔ بمشاہرہ سابقہ	″	م۔ مشتاق احمد خان بی اے (نمبر ۶۰۔ ۲۳۰-۳۰۰) کی جو تبدیل ہو کر ناظم مدارس گوجرانوالہ مقرر ہوئے ہیں۔
″	م۔ محمد مختار صادق بی ایس سی بی ٹی (نمبر ۹۰۔ ۲۳۰ ــ ۳۰۰)	معلم انگریزی سنٹرل ماڈل اسکول لاہور	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کہروڑ پکا۔ ضلع ملتان بمشاہرہ سابقہ۔	″	م۔ طالع مند کی جن کا تبادلہ ہو چکا۔
۲۴ر فروری سنہ ۴۹ء 4164-E	م۔ محمد خان	معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال (۵۰۔۳۔۸۰/۴ــ۱۰۰)		۲۱ر جنوری سنہ ۴۹ء سے	اپنے تقرر اور درجہ شاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں
۲ر مارچ سنہ ۴۹ء 4681-E	س۔ عاشق حسین نمبر ۹ (۹۰ــ۱۵۰)	معلم انگریزی جونیئر ماڈل اسکول لاہور	نائب ناظم مدارس ضلع لاہور بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	س۔ نذر محمد بخاری کی جگہ جو گورنمنٹ ہائی اسکول [illegible]
۳ر مارچ سنہ ۴۹ء 4933-E	م۔ محمد دین (۵۰ ــ ۱۰۰)	معلم تربیت جسمانی گورنمنٹ ہائی سکول میانوالی		۴ر فروری سنہ ۴۹ء سے	اپنے تقرر اور درجہ شاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے
۷ر مارچ سنہ ۴۹ء 5265-E	م۔ حبیب اللہ ایس وی زراعت تربیت یافتہ (۵۰ــ۱۰۰)	قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول پنیالہ خرد	قائم مقام معلم زراعت گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ بمشاہرہ سابقہ۔	تاریخ حاضری سے	عملہ تحتانی میں معلم زراعت ایک خالی اسامی کی جگہ
۱۰ر مارچ سنہ ۴۹ء 5749-E	س۔ اقبال حسین بی۔ اے نمبر ۶۹ : ۲۳۰ــ۳۰۰	ناظم مدارس۔ ضلع میانوالی	ناظم مدارس ضلع جہلم بمشاہرہ سابقہ۔	۸ر فروری سنہ ۴۹ء قبل از دوپہر سے	م۔ عبدالرحیم خان بی [illegible] کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا۔
۱۲ر مارچ سنہ ۴۹ء 5944-E	م۔ مختار صادق بی ایس سی بی ٹی نمبر ۹۰ (۲۳۰-۳۰۰)	معلم انگریزی سنٹرل ماڈل اسکول لاہور بحیثیت صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول کہروڑ پکا تبدیلی کے احکام صادر ہو چکے ہیں	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب۔ بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ مشتاق عبدالرشید [illegible] کی جگہ جن کا تبادلہ ہو چکا
۱۶ر مارچ سنہ ۴۹ء 6153-E	م۔ عبدالرحمٰن [illegible] نمبر [illegible] ۵۰ [illegible] ۱۰۰	معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول پنیالہ خرد		۱۵۔ اگست [illegible] سے	اپنے تقرر اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار

کتابیں اور رسالے

پاک جیومیٹری

مصنفہ۔ محمد حسن راٹھور بی اے (آنرز) بی ٹی و ڈاکٹر ضیاؤالدین احمد ایم اے پی ایچ ڈی (دہلی)
ناشر:۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ (قیمت:۔ تین روپے)

جیومیٹری پر اردو میں قابل داد تالیف ہے۔ مصنفین نے کمال محنت و جانفشانی سے کام لیا ہے۔ ہائی اسکولوں کے نصاب کی مطابقت خاص طور پر مدنظر رکھی گئی ہے۔ مسائل کا حل واضح طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اشکال بھی مناسب اور واضح ہیں۔ یہ تصنیف کوئی ۲۶ بابوں پر مشتمل ہے۔ ابتدائی دو بابوں میں جیومیٹری کے بنیادی تصورات اور چند عام اصطلاحات کی وضاحت کی گئی ہے۔ بقیہ ابواب میں جیومیٹری کے مختلف مسائل کی بحث ہے۔ اور صورت بحث یہ ہے کہ پہلے اثباتی مسائل پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان کے عمل کے مدارج کو واضح کیا گیا ہے اور شکلیں ساتھ ساتھ دے دی ہیں۔ اس کے بعد اثباتی مسائل کے اختتام پر بکثرت مشقی سوالات دئے ہیں۔ اور اگر کہیں مشکل سوالات ہیں۔ تو سہولت عمل کی خاطر مختصر اشارات بھی دے دیئے گئے ہیں۔ تدریج اور تسلسل کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔ آخر میں طلبا اور اساتذہ کی آسانی کی خاطر فرہنگ اصطلاحات بھی شامل ہے۔ پچھلے آٹھ سال کے پرچے بھی دے دئے ہیں۔ تاکہ طلبہ کو امتحان کی نوعیت و صورت کا پتہ چلے۔ امید ہے کہ یہ کتاب میٹرکولیشن کے طلبہ کے لئے بہت مفید ثابت ہو گی۔ یہ کتاب پانچسو چھہتر صفحات پر مشتمل ہے۔ طباعت و صورت بھی مناسب و دیدہ زیب ہے جلد بھی اچھی ہے۔

ہائی سکول کیمیا

مصنفہ۔ چودھری طفیل محمد بی اے (آنرز) بی ٹی
ناشر:۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔
قیمت:۔ دو روپے چار آنے

اردو زبان میں کیمیا کے مبادی بیان کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ چوبیس بابوں میں کیمیا کے متعلق ہائی اسکول کے طلبہ کی ضروریات کے مطابق آسان زبان میں تمام چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ تجربات کی تفصیلات اور اشکال واضح ہیں۔ ہر باب کے اختتام پر سبق کے اعادے اور ذہن نشین کرانے کی خاطر مناسب مشقی سوالات دئے گئے ہیں۔ آخیر میں فرہنگ اصطلاحات بھی شامل ہے۔ اور چند سالوں کے یونیورسٹی کے پرچے بھی دئے ہیں۔ اصطلاحات کو آسان تر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہائی اسکول کے طلبہ اس کتاب کو آسان اور مفید پائیں گے۔ طباعت دیدہ زیب۔ کتابت اگرچہ باریک ہے۔ لیکن صاف اور واضح ہے۔

پاک حساب

مصنفہ:۔ محمد حسن راٹھور بی اے (آنرز) بی ٹی و ڈاکٹر ضیاؤالدین احمد صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (دہلی)
ناشر:۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز (قیمت:۔ تین روپے آٹھ آنے)

میٹرکولیشن کے طلبہ کے لئے حساب پر اردو میں نہایت کارآمد اور مفید کتاب ہے۔ اس میں نصاب کی تمام ضروری چیزیں وضاحت کے ساتھ آگئی ہیں۔ یہ کتاب چھبیس ابواب اور ۷۹۶ صفحات پر مشتمل ہے جلد، طباعت، کتابت ہر...دیدہ زیب، سوالات کی ہر ممکن طرز کی مثالیں حل کی گئی ہیں۔ زبان آسان ہے مشقی سوالات کافی تعداد میں دئے گئے ہیں۔ اور اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ کہ ایسی باتیں آئیں جن سے طلبہ کو روزمرہ زندگی میں واسطہ پڑتا ہے۔ بے جا الجھنوں اور دقتوں سے احتراز کیا گیا ہے۔ اشکال بھی حسب ضرورت واضح اور صاف دئے گئے ہیں۔ آخر میں اصطلاحات کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ اور چند سالوں کے یونیورسٹی کے پرچے بھی دئے گئے ہیں۔ ہائی اسکولوں کے حساب پر یہ ایک فائدہ بخش چیز ہے۔ طلبہ اس کے طرز اور اس کی زبان سے مانوس ہونگے۔ اور اس کتاب کو بہت مفید پائیں گے۔

(۱) ابتدائی جغرافیہ (۲) دوسرے ملکوں کے بچے

(۳) ہمارا صوبہ (۴) نیا جغرافیہ عالم حصہ اوّل تا چہارم

مصنفہ:۔ پروفیسر محمدؐ ناظر۔
ناشر:۔ ایسٹرن پبلشرز۔

پاکستان کی جدید ضرورتوں کے مطابق جغرافیائی ماحول میں جس قدر معنوی انقلاب آیا ہے۔ اس کی اہمیت سے ہمارے بچے کو واقفیت ہونی ضروری ہے۔ نیز اس بات کی بھی اشد ضرورت ہے۔ کہ علم جغرافیہ کے مذکور و بحث کے دوران میں پاکستانی بچہ اپنے قومی نقطۂ نگاہ سے اپنے ماحول کو تنگ اور وسیع فشو و نما پائے۔ اور ساری دنیا پہ اپنے قومی نظرئے سے نگاہ ڈالے۔ پروفیسر محمدؐ ناظر صاحب بحیثیت ماہر جغرافیہ دان محتاج تعارف نہیں۔ آپ کی قابلیت سے ہر معلم و متعلم واقف ہے۔ آپ نے بچوں کے لئے اس جدید قومی نقطۂ نگاہ سے یہ چاروں جغرافیہ کی کتابیں لکھی ہیں۔ زبان نہایت صاف اور سلیس ہے۔ پاکستانی طلبہ ان کتابوں سے بہت فائدہ اٹھائیں گے۔

زنانہ امراض کا علاج

مصنفہ

پروفیسر حکیم محمد مظہر الدین اجنلی۔
صفحات وقیمت:۔ $\frac{18 \times 22}{8}$ سائز کے ۶۳۳ صفحات
قیمت تین روپے آٹھ آنہ (۳ روپے)
ملنے کا پتہ: دفتر مسیح الملک پوسٹ بکس ۵۹ - دہلی

مخصوص زنانہ امراض کی تشخیص اور انکا صحیح علاج ایک معمہ سا بن چکا ہے۔ ہر شہر و قصبہ میں سینکڑوں حکیم ڈاکٹر وید بڑے بڑے بورڈ لگائے اس چیز کے دعویدار ہیں کہ صرف وہی ان بیماریوں کا علاج کر سکتے ہیں۔ اور حالت یہ ہے کہ مریضوں کی کمی کی بجائے تعداد بڑھ رہی ہے۔ عورت ہماری سوسائٹی کا ضروری جزو ہے۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ عورت کے بغیر دنیا کا یہ دھندا ہی ادھورا ہے۔ چنانچہ تومند اور صحت ور عورت ہی آئندہ قوموں کی بلند حوصلگی خوش اخلاقی اور ترقی و عروج کی ضامن ہے۔ پروفیسر مظہر الدین صاحب اجنلی قابل مبارکباد ہیں۔ کہ وہ انتھک جدوجہد سے عورتوں کی مخصوص بیماریوں کی تحقیق میں مصروف رہتے ہیں۔ چنانچہ زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ کتاب اصل میں "مسیح الملک" کا خاص نمبر ہے۔ جو "زنانہ امراض کے علاج" سے متعلق کر دیا گیا تھا۔ اسمیں فاضل مرتب نے صنفِ نازک کے ہر جزو کی ان بیماریوں کے متعلق بڑی تفصیل سے بحث کی ہے جنکو عورتیں ظاہر کرتے ہوئے ہچکچاتی ہیں۔ اور بعض اوقات اسی تردد کی بدولت جان کھو بیٹھتی ہیں۔ ہر بیماری کے اسباب، نوعیت، محلِ وقوع اور اس کے علاج کو آسان اردو زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ تشریح کے لئے تصاویر دی گئی ہیں۔ اعضاء، بیماریوں اور علاج کے انگریزی۔ عربی۔ یونانی اور ویدک نام بھی ساتھ ساتھ دئے گئے ہیں۔ سہولیت کے لئے حروف ابجد کے لحاظ سے تمام بیماریوں کی فہرست معہ صفحہ دی گئی ہے۔

فاضل مرتب نے بارہ سالہ ذاتی تجربات نیز مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کے طریقۂ علاج اور مجربات کی روشنی میں کافی محنت سے یہ مواد جمع کیا ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں کاروباری نقطۂ خیال بھی سامنے آگیا ہے۔ لیکن علاج معالجہ میں یہ ایک ضروری جزو قرار پا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب ہر دایہ، ڈاکٹر، حکیم کے زیر مطالعہ رہنی چاہیئے۔ اس کی توسیع اشاعت میں کارپردازانِ "مسیح الملک" کا ساتھ دینا چاہیئے۔

تارے

(پندرہ روزہ)

ایڈیٹر:۔ سید منیب بی۔ ایم۔ اے
سالانہ چندہ:۔ چھ روپے۔ فی پرچہ:۔ پانچ آنے
ملنے کا پتہ } اردو محل معظم جاہی مارکیٹ حیدر آباد (دکن)

"تارے" بچوں کا پندرہ روزہ رسالہ ہے جس کی دوسری جلد کے ابتدائی پرچے ہمارے سامنے ہیں۔ پرچہ کا معیار قابل توجہ ہے۔ زبان بہت شستہ۔ مضامین دلچسپ۔ کہیں کہیں تصاویر بھی ہیں اگرچہ کہانیاں اور نظمیں چھوٹی چھوٹی ہیں لیکن بچوں کی تسلی کے لئے کافی ہیں۔ طباعت و کاغذ مناسب۔ ٹائٹل رنگین ؂

"اچھی کشیدہ کاری"

مرتبہ:۔ صالحہ خاتون۔
قیمت:۔ تین روپے چار آنے۔
ملنے کا پتہ:۔ شیدا پبلشنگ ہاؤس دہلی

ماہنامہ "شیدا" دہلی کا تازہ پرچہ بابت ماہ فروری "اشاعت خاص" کی صورت میں "اچھی کشیدہ کاری" کے نام سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۵×۱۰ کے بڑے سائز پر چھاپا گیا ہے جس کی وجہ سے بعض بڑی بڑی بیلیں اور پھول بوٹے آسانی سے ایک ایک صفحہ پر آگئے ہیں۔ تقریباً ۱۶۲ قسم کے ڈیزائن ہیں۔ جو ۱۰۴ صفحات پر چھپے ہوئے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ جدید طرز کے ڈیزائن بھی اسمیں آجائیں۔ چنانچہ ایک ہی چیز سے متعلق مختلف قسم کے ڈیزائن یکجا جمع نہیں کئے گئے۔ صرف عوام کی پسندیدگی کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اسی وجہ سے یہ ضروری پہلو نظر انداز ہو گیا ہے۔ مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو بعض ڈیزائن بہت خوبصورت ہیں۔ اور بہت سے بھرتی قسم کے بھی ہیں۔ کچھ انگریزی کے الفاظ اور سیٹریاں بھی دی گئی ہیں۔ اگر کاغذ اچھا لگا دیا جاتا تو شاید اس کی نوعیت کچھ اور ہو جاتی اس قسم کی روزانہ استعمال میں آنے والی چیز کو رسمی کاغذ لگانا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اغلباً قیمت کم کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے ہماری بچیوں کو ایسے ہنر سے بہرہ ور ہونا چاہیئے۔ سینا۔ پرونا اور کشیدہ کاری کا کام ان کا زیور ہے۔ لہذا ہم سفارش کرینگے کہ اسے ضرور خریدا جائے۔

- "آموزش" ہر ماہ شائع ہوتا ہے، سالانہ چندہ چھ روپیہ ہے
زرِ چندہ مینیجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور کے نام روانہ کریں۔

- مضامین ایڈیٹر "آموزش" سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور
کو ارسال کئے جائیں۔ اشاعت کے لئے منظور شدہ
مضامین کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

- "آموزش" تمام تعلیمی حلقوں میں مقبول اور جملہ تعلیمی اداروں
میں رائج ہے۔

- "آموزش" میں اشتہار دیکر آپ تعلیم یافتہ جماعت
میں مشہور و مقبول ہو سکتے ہیں۔

- اشتہارات اور دوسرے کاروباری معاملات کے لئے
مینیجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور سے مراسلت کریں۔

مئی ۱۹۴۹ء

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس، ہسپتال روڈ، لاہور میں چھپوا کر کشمیری بازار، لاہور سے شائع کیا۔

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

لاہور

ناشر و مدیر "آموزش" کی تسلیم کے ساتھ

محمد ناصر

ناشر

کتاب منزل

لاہور

مئی سنہ ۱۹۴۹ء

جلد:- ۲

شمارہ:- ۲

قیمت فی پرچہ دس آنے

سالانہ چندہ:-

پاکستان کیلئے: ۶ روپے

غیر ممالک کیلئے: ۸ روپے

رموز

اصلاحات و تعمیر نو کے اس دور میں سب کی نگاہیں تعلیم کی اصلاح پر مرکوز ہیں
کیونکہ یہ حقیقت سب پر عیاں ہے کہ قوم کی تمدنی، معاشری، اخلاقی غرض ہر قسم کی ترقی
کا انحصار تعلیم ہی پر ہے، چنانچہ نصاب بھی جدید تقاضوں کے مطابق بدلے جا رہے
ہیں۔ تعلیمی سہولتیں بھی حسب ضرورت مہیا کرنے کے اقدامات ہو رہے ہیں اور اساتذہ
کے وقار کو قائم کرنے کی بھی حتی الوسع کوششیں کی جا رہی ہیں۔ تاکہ وہ اپنے آپ کو
کچھ فارغ البال محسوس کر کے اطمینان و خلوص کے ساتھ قومی خدمت کے اس اہم فریضہ
کو کما حقہٗ سر انجام دینے میں سعی بلیغ کر سکیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی ترقی و اصلاح کے لئے تعلیم کی اصلاح
ضروری ہے۔ اور تعلیم کی اصلاح کے لئے نصاب میں مناسب تغیر و تبدل، تعلیمی
سہولتیں اور اساتذہ کا وقار بھی ضروری امور ہیں۔ لیکن ایک چیز جو خود تعلیم کا محور اعظم
ہے۔ اور جو اساتذہ کا وقار، تعلیمی سہولتوں اور نصابی اصلاح کے باوجود اپنے نقص
و عیب سے سارے نظام تعلیم کو صحیح تعلیم کے ناقابل بنا دیتی ہے۔ جو اعلے نصاب
کو بے روح کر دیتی ہے۔ اور قابل سے قابل استاد کو میکانکی سا بنا دیتی ہے۔

اس کی طرف ابھی کہیں توجہ نہیں ہوئی تعلیمی مذاکرات کے امور تنقیح میں ابھی تک کہیں اس کا نام نہیں دیکھا گیا۔ یہ قابلِ توجہ چیز امتحان ہے۔

امتحان کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا؛ مدارج مختلفہ کو طے کرنے اور امتیازات حاصل کرنے کی خاطر آزمائش ضروری ہے۔ لیکن یہ ضرورت اس بات کی متقاضی نہیں ہے کہ غیر مفید نوعیت کے امتحانات لئے جائیں۔ آج تک جس طرز کے امتحانات جاری رہے ہیں۔ ان کے نتائج ہمارے سامنے ہیں خاص طور پر مدرسی جماعتوں کے نصاب میں ہزار اعلےٰ مقاصد مقرر کئے جائیں؛ اور استادوں کو تربیت گاہوں میں ہزار اصول و طریق تعلیم کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ لیکن یہ سب کچھ دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ جب تعلیمی ترقی کی جانچ اس سے کی جاتی ہے کہ امتحان میں پاس کتنے طلبہ ہوئے اور فیل کتنے۔ استاد ہزار قابلیت سے صحیح تعلیم دے لیکن جب نتائج ہی پر قابلیت کا مدار رہ جائے۔ تو اس کے سوا اور بیچارہ کے لئے کیا چارہ رہ جاتا ہے کہ بے سود سردردی چھوڑ دے اور ایسے طریق اختیار کرے کہ جس سے طلبہ پاس ہو جایا کریں۔ یہ طریق کار اُسے امتحانات کی نوعیت خود سمجھا دیتی ہے۔ جو امتحانات اب تک رائج رہے ہیں۔ اُن میں چند قباحتیں ہیں۔

(۱) امتحان کے لئے باقاعدہ کتابیں یا کتابوں کے حصے مقرر ہوتے ہیں۔ طلبہ بغیر اس کے کہ پورے موضوع پر کافی مہارت حاصل کریں۔ انہیں مخصوص مقررہ مقامات کو رٹ لیتے ہیں۔ جو مقررہ نصاب میں انہیں اہم نظر آتے ہیں۔ یا استاد اہم بتاتے ہیں۔ اور پھر یہی رٹا ہوا امتحان میں اُگل دیتے ہیں۔ کامیابی سے سرخروئی تو ہو جاتی ہے لیکن دماغ کورے کا کورا رہتا ہے مگر انہیں کامیابی سے غرض ہے نہ کہ دماغی نشو و نما سے۔

(۲) ممتحن اکثر سوالات دُہراتے رہتے ہیں۔ اور عموماً ان کی ممتحنی کا دائرہ پھیلے

پانچ سالوں کے پرچوں تک ہی پھیلا ہوتا ہے۔ اور اکثر دیکھا جاتا ہے۔ کہ سوالات کے الفاظ بھی نہیں بدلے جاتے۔ ایسے ممتحن اساتذہ اور طلبہ کا تعلیمی کام اور بھی ہلکا کر دیتے ہیں۔ استاد اکثر حالات میں گذشتہ چند سالوں کے پرچوں میں سے سوچ کر نئے سال کا پرچہ بنا لیتے ہیں۔ جسے گیس پیپر کہا جاتا ہے۔ اور پھر ان پرچوں کے جوابات طلبہ کو لکھا دیتے ہیں۔ اور بزور بازو یا بزور قمچی طلبہ کو یاد کرا دیتے ہیں۔ وہ امتحان میں رٹا ہوا لکھ کر اپنا مقصود حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات جب کہ ممتحن کی عادت یہ بھی ہو۔ کہ وہ انتخاب بھی دیتا ہے۔ تو پھر طلبہ اور اساتذہ کی "پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں"۔ چند سوالات کے جواب اچھی طرح رٹ لئے۔ اور کامیابی کے نمبر حاصل کر لئے۔

(۳) پرچوں کے منتخبہ سوالات کے جوابات سوچ کر لکھانے کا کام بھی ہو۔ تو اساتذہ کو کچھ عرق ریزی کرنی پڑے۔ لیکن حل شدہ گیس پیپروں کی وبا عام ہے۔ اور تجارتی و اقتصادی لٹیروں نے امتحانی کامیابی کی ان صورتوں سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے کئی قسم کے جوابات لکھوا کر چھپوا رکھے ہیں۔ تاکہ نہ اُستاد کو سوچنے اور کتابیں دیکھنے کی تکلیف ہو نہ طلبہ کو۔ چنانچہ کئی اساتذہ کے ہاں یہ معاملہ ہوتا ہے۔ کہ نہ طلبہ نے اصلی درسی کتاب کے ورق اُلٹے ہوتے ہیں۔ اور نہ استاد مہربان نے۔ البتہ دونوں نے گیس پیپر ضرور دیکھے ہوتے ہیں۔ اور نتیجہ ان کا سو فیصدی رہتا ہے۔

(۴) نہ موضوع تدریس میں کچھ توسیع کی ضرورت محسوس ہوتی ہے نہ طریق تعلیم میں محنت و مشقت کی۔ بڑے بڑے لائق اساتذہ ان امتحانوں کی مہربانی سے چند سالوں میں کاہل اور سطحی سے ہو کے رہ جاتے ہیں۔

(۵) عام عقیدہ سا پیدا ہو چکا ہے۔ کہ جو امتحان میں پاس ہو جائے وہ قابل ہے

اور جس استاد کے طلبہ زیادہ کامیاب ہوں۔ وہی زیادہ ہوشیار ہے۔ ہزار قابلیت ہو لیکن امتحان میں فیل ہو گیا تو نالائق ہے۔ ماں باپ کی پھٹکار بھی اسی پر ہے۔ مدرسے کی بھی اور عوام کی بھی لعنت اُسی پر۔ استاد بھی اُسی کو بیٹھا بددعائیں دیتا ہے کہ میرا نتیجہ خراب کر دیا۔ ہزار علمیت ہو۔ لیکن اگر اس استاد کے کامیاب طلبہ کی تعداد کم ہے بہت سے فیل ہیں یا کچھ تعداد فیل ہے۔ تو بس وہ بالکل نالائق استاد ہے۔ استادی کے قابل نہیں۔ اربابِ معائنہ بھی عام طور پر نتائج پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ اور اسی سے استاد کی قابلیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ ایسا ماحول ہو۔ تو علمیت و قابلیت کی کون پروا کرے۔ استاد کو اپنی ہستی برقرار رکھنے کی خاطر اور طلبہ کو اپنے مستقبل کے لئے امتحانوں کی روش کی چوکھٹ پر سر دھرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے بغیر بیچاروں کے لئے چارہ نہیں۔ کہ کامیابی کی جائز و ناجائز تدابیر سوچیں اور بیہودہ سردردی چھوڑیں۔

(۶) ایک قابل طالب علم جس کا تعلیمی عرصہ خوب گذرا ہے۔ امتحان کے وقت بیمار ہو جاتا ہے اور اس کی ماؤف طبیعت کی بنا پر اس کی طرف سے خیالات کا صحیح اظہار نہیں ہو سکتا۔ بس وہ جہنم رسید ہوا۔ اس کا سال بھی ضائع اور عوام کی نظروں میں اس کی لیاقت بھی معدوم۔ ایسے کا دل ٹوٹے نہیں تو کیا ہو؟

تعلیمی اصلاح مقصود ہے۔ تو جہاں نصاب کی ترمیم اور اُستاد کی تربیت پر زور دیا جا رہا ہے۔ وہاں امتحان کی نوعیت بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔ امتحان کی صورت کچھ ایسی ہونی چاہیئے۔ کہ

(۱) قابل طلبہ کی وقتی بیماری وغیرہ کی وجہ سے اُن کی عمر گرانمایہ کا کچھ حصہ بھی ضائع نہ ہو۔ ان کی ہمت نہ ٹوٹے۔ اور اُن کی قابلیت کو ٹھیس نہ لگے۔

(۲) امتحان صحیح قابلیت و علمیت کی آزمائش ہو۔ سطحی معلومات کی طرف راغب نہ کرے۔

(۳) اساتذہ صحیح علمی توسیع و تبلیغ کی طرف مائل ہوں۔ قابلیت سے پڑھائیں۔ اور موضوع تعلیم پر طلبہ کو حاوی کر دیں۔ خود بھی محنت کریں۔ اور دوسروں کو محنت کرنا سکھائیں۔

(۴) ممتحن صحیح قسم کے علم افروز، معلومات آنما، اور قابلیت کو جانچنے والے پرچے بنائیں۔ (ممتحنی کی باقاعدہ ٹریننگ دی جائے۔ جس کا مختصر سا نصاب ہو۔ اور یہ پانچ سالہ سوالات دہرانے کی بدعادت یک قلم موقوف کر دی جائے۔ ممتحنوں کو اس بات کا معاوضہ دیا جائے۔ کہ وہ نئے سوال بنائیں۔ نہ یہ کہ پُرانے سوال نقل کریں)

(۵) گیس پیپر، خلاصے، جوابات اور گائیڈیں اور چابیاں وغیرہ لکھنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ایسی چیزیں بحکم سرکار ممنوع ہوں تاکہ تجارتی فروغ میں علم رسوا نہ ہو۔

(۶) صحیح اور مستقل علم حاصل کرنے کے لئے شوق اور حالات پیدا ہوں۔ امتحان کے بعد پڑھی ہوئی چیز بھول نہ جائے۔ وہ فقط اُگلنے کے لئے یاد نہ کی گئی ہو۔

(۷) طلبہ میں مطالعہ سے صحیح معلومات اخذ کرنے اور اساتذہ کی علمی تقاریر کو بغور سننے اور ذہن نشین کرنے کی عادت پیدا ہو۔ اُمید ہے کہ ارباب تعلیم اس اہم چیز کی اصلاح کی طرف جلد توجہ دیں گے۔

معائنے بھی امتحانات کی صورتیں ہیں۔ لیکن یہ معائنے صحیح راہوں میں اقدامات نہ کریں۔ تو بجائے مفید ثابت ہونے کے عام امتحانات کی طرح مضر ثابت ہوتے ہیں اس بات کی ضرورت ہے کہ صحیح قسم کے معائنوں کی صورت قائم ہو جس کا مقصد اساتذہ کی ہدایت اور طلبہ کی ہمت افزائی ہو۔ نہ کہ تخریبی اور تنبیہی تبصرے۔ اس کا بچوں پر اور تعلیم پر نہایت خوشگوار اثر پڑے گا۔

---

۱۴ اپریل ۱۹۴۹ء کو صبح ۸ بجے ابتدائی مدارس کے اساتذہ کے لئے سنٹرل

ٹریننگ کالج لاہور میں تجدیدی اسباق (ریفریشرز کورس) کے سلسلے کا آغاز ہوا۔
افتتاحی اجلاس میں مولوی ظفر اقبال صاحب آئی۔ ٹی۔ آئی نے عالمانہ تقریر فرماتے ہوئے
چند نہایت مفید اور لطیف باتیں بیان فرمائیں۔ آپ نے سب سے پیشتر کلام پاک و
حدیث نبوی کی رو سے علم، تحصیل علم اور اشاعت علم کی فضیلت بیان فرمائی۔ اور بتایا
کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تحصیل علم اور اشاعت علم کی کس طرح فکر رہتی تھی۔
کس طرح آپ جنگوں کے غیر مسلم اسیروں کو آزادی کے وعدے سے مسلمانوں کے پڑھانے
پر آمادہ فرمایا کرتے تھے۔ کس طرح آپ عابدین کے حلقے کو چھوڑ کر متعلمین و معلمین کے حلقے
میں جا کر بیٹھتے تھے۔ اور کس طرح متعلمین کو دونوں جہان کی رستگاری میں کوشان ظاہر
فرماتے تھے۔ اس تمہید کے بعد آپ نے آئین میں مسلمانوں کی علمی حالت پر روشنی ڈالی او
پھر ہندوستان میں مسلمانوں کا علمی جلال دکھایا۔ اور بتایا کہ کس طرح یہاں غیر مسلموں کو
جو لور علم مسلمانوں ہی سے حاصل کیا کرتے تھے۔ سکھایا گیا۔ کہ مسلمانوں سے پڑھنا چھوڑ
علم کی فضیلت و وقعت بیان کر لینے کے بعد آپ نے اس کی تجدید کی ضرورت بتائی او
واضح الفاظ میں فرمایا کہ ہر معلم کے لئے تجدید کے بغیر گذارہ نہیں۔ آپ نے یورپ اور ام
میں تجدیدی کارروائیوں کا ذکر کیا۔ اور بتایا کہ جو معلم وہاں تجدیدی اسباق نہیں لیتا ا
ملازمت سے جواب مل جاتا ہے۔ وہاں تجدید کی خود معلموں کو فکر رہتی ہے۔ مندرجہ ذیل
One who ceases to مقولے کی آپ نے شاندار الفاظ میں تشریح فرمائی کہ
قابل معلم کی جا be a student ceases to be a teacher
کا یہ گر بتایا کہ اُس کا ہر دوسرا سبق پہلے سے بہتر ہوتا ہے۔ ان توضیحات کے بعد آ
ابتدائی مدارس کے اساتذہ کو بتایا کہ آپ سب سے زیادہ قابل احترام ہیں۔ کیونکہ آ
کے ہاتھوں میں قومی مستقبل کے سانچے ہیں۔ تجدیدی اسباق کے پروگرام میں آ
ہی کو مقدم رکھنا بھی اس حقیقت کا ثبوت ہے۔ کہ ٹریننگ کالج کے ارباب کی نظر

میں آپ احترام کے لحاظ سے مقدم ہیں۔ آپ کو تجدیدی اسباق میں بہت سی نئی چیزیں معلوم ہوں گی۔ جو اب ہماری قومی تعمیر کے لئے ضروری ہو گئی ہیں۔ ان میں سے آپ نے چند کا ذکر کیا۔ مثلاً: "اُردو زبان کی اہمیت اور اس کا فروغ"۔ "بچوں سے شفقت کا سلوک"۔ "قومی جذبہ" وغیرہ۔

ابتدائی مدارس کے اساتذہ کے تجدیدی اسباق کا یہ سلسلہ ۱۴ اپریل کو منتہی ہوا یقین ہے کہ ابتدائی مدارس کے یہ اساتذہ دورِ جدید کی تعمیر میں۔ اب صحیح طور پر پورے جوش و خروش سے ساتھ سرگرم عمل ہوں گے۔

۲۱ اپریل کو یومِ اقبالؒ منایا جا رہا ہے۔ یوم منانے کا صحیح مقصد یہ ہے۔ کہ مرحوم کی تعلیمات کے نکات قوم کے سامنے از سرِ نو پیش ہوں۔ اور وہ ان چیزوں کو نہ بھولیں۔ جو بحیثیت قوم و ملت ان کے لئے نہایت کارآمد ہیں۔ اقبالؒ مرحوم نے قوم کو انفرادی و اجتماعی تعمیر کا نہایت اہم پروگرام بتایا ہے۔ اور یہ حقیقت میں انہی کے تخیل کا عملی جامہ ہے۔ کہ ہم پاکستان کو قائم دیکھتے ہیں۔ اور بحیثیت آزاد قوم اب اس پر ناز کر رہے ہیں۔ اخلاقی تعمیر کے سلسلے میں انہوں نے مومن کو ایک بہترین نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس قسم کا اخلاق جس قوم کے افراد میں پیدا ہو جائے۔ وہ قوم دنیا کی سرتاج نہ ہو گی تو کون ہو گی؟ ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ	غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات	ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل	اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

اقبالؒ امن عامہ اور خلافت الٰہیہ کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک اہلِ عالم کی مجموعی بہتری اتحاد میں ہے۔ وہ اتحادِ عالم کے علمبردار تھے۔ اور انہیں یہ اتحاد صرف مذہب

اسلام ہی کی وساطت سے حاصل ہونا ممکن نظر آتا ہے۔ انہیں مغربی اقوام کے سب نظریئے تقسیم عالم کے تبر دکھائی دیتے ہیں ؂

مردمی اندر جہاں افسانہ شد — آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند — آدمیت گم شد و اقوام ماند

وہ اسلام کو سراہتے ہیں۔ اور امن عالم کو اسی کے جھنڈے تلے دیکھتے ہیں ؂

مسلم استی دل باقلیمے مبند — گم مشو اندر جہانِ چون و چند
عقدۂ قومیت مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملت گیتی نورد — بر اساس کلمۂ تعمیر کرد
ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم — اہلِ عالم را پیام رحمتیم

وقت کی تمام قباحتیں جن سے اقوام عالم پریشان ہیں۔ اور افراد ہوش و حواس باختہ، یہ تمام قباحتیں اسلامی تعلیم سے ہی دُور ہو سکتی ہیں۔ اقبالؒ اِسی تعلیم کا علمبردار تھا، وقت کی ضرورتوں کے مطابق اسی تعلیم کے رواج کی ضرورت ہے۔ اور اس کے مطابق عمل اور جد وجہد کی، تاکہ موجودہ قباحتوں کے سیلاب پر اطمینان نصیب ہو۔ موجودہ انفرادی اخلاق کا انحطاط، معاشرہ کی زبوں حالی اور امنِ عالم کی متزلزل و خطرناک صورت اس بات کی متقاضی ہے کہ ہر فرد میں مردِ مومن کے اوصاف پیدا ہوں، اسلامی اصولوں پر معاشرے کی تشکیل ہو۔ اور باطل سے مغلوب دنیا کو حق کے پیامِ رحمت سے آشنا کیا جائے۔ یہی اسلام ہے۔ یہی اسلامی تعلیم اور اسی تعلیم کا مبلغ اقبال ہے۔ خدا کرے یومِ اقبال کا اثر صحیح طور پر قائم ہو اور اس کے مقاصد اعمال کے سانچوں میں ڈھل جائیں۔ اقبال کے متعلق عقیدت کیشوں کے ان مظاہروں کی بدولت اقبال کی تمام تمنائیں بر آئیں۔ انفرادی اور معاشری حالت سدھر جائے۔ دنیا جنت کدہ بن جائے اور اقبال کی جنت مقام رُوح خوش ہو

"ثانوی تعلیم"

عبدالباری ایم۔ اے

وقت کے تقاضا کے مطابق ثانوی تعلیم کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ اربابِ علم و فہم اس مسئلہ کو زیرِ بحث لاکر قوم و ملت کے لئے کوئی فوری عملی قدم اٹھائیں۔ میں چند موٹی موٹی باتیں پیش کروں گا۔

سب سے پہلے میں نصاب کو لیتا ہوں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اب انگریزی کی اہمیت وہ نہیں جو دو سال پہلے تھی۔ انگریزی راج کے ختم ہونے سے پہلے ہمیں انگریزی یوں پڑھائی جاتی تھی کہ ہم اپنے خیالات کا اظہار انگریزی زبان میں بلا تکلف کرسکیں۔ یہی نہیں۔ ہماری دلی خواہش یہ ہوتی تھی کہ ہم انگریزی بالکل انگریزوں کی طرح بول سکیں۔ اس کا جو کچھ اثر ہماری زبان پر پڑا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انگریزی ہمارے لئے ایک غیر ملکی زبان ہے۔ پاکستان میں اس کی اہمیت بالکل وہی ہونی چاہیئے جو کسی غیر ملکی زبان کو آزاد ملکوں میں میسر ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ کہ ابھی انگریزی کی اہمیت ہمارے لئے کافی ہے۔ تجارت کے سلسلہ میں ہمیں اس زبان کی ضرورت ہے۔ اعلےٰ تعلیم کے ذخائر ابھی ہمیں اسی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں میں ملیں گے۔ سائنس کی جدید ترین معلومات اسی زبان کے رسالوں کے ذریعے ہم تک

پہنچیں گی۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ انگریزی ہمارے لئے غیر ملکی زبان ہے۔ اب ہم اس کو پڑھیں گے تو غیر ملکی زبان سمجھ کر۔ اب ہم اس کو پڑھائیں گے تو غیر ملکی زبان سمجھ کر۔ رہا یہ سوال کہ انگریزی کا نصاب کیا ہو۔ یہ مسئلہ ماہرین تعلیم کے زیر غور ہے۔ اس کے فیصلہ میں شاید ابھی کچھ وقت لگے۔ اس وقت انگریزی کو زیر بحث لانے کا میرا مقصد یہ ہے کہ وہ پانچویں جماعت جو چند دنوں میں شروع ہونے والی ہے۔ وہ پرانے قاعدے کے مطابق ہفتے میں کیوں ۱۴ گھنٹے انگریزی پڑھے۔ جب تک یہ بچے دسویں جماعت تک پہنچیں گے۔ انگریزی کی موجودہ صورت کبھی کی بدل چکی ہوگی۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس جماعت کے مضامین کے اوقات میں فوری تبدیلی کی جائے۔ انگریزی سے جو وقت بچے وہ کسی اچھے مصرف میں لایا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انگریزی کے ۱۴ گھنٹوں کو گھٹا کر فوراً ۸ گھنٹے فی ہفتہ کر دیا جائے۔ اور اس پر عمل درآمد فوراً شروع ہو جائے۔ یہاں گھنٹے سے میری مراد اسکول کی گھنٹی ہے جو ۴۵ منٹ کی ہوتی ہے۔

اب میں آپ کی توجہ ایک اہم مضمون کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ سائنس ہے۔ مجھے اس امر کے واضح کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کہ ملک کی خوشحالی بہت حد تک اس مضمون سے وابستہ ہے۔ یہی نہیں ملک کا تحفظ بھی ایک حد تک اسی مضمون کا مرہون منت ہے۔ ایسی صورت میں کیا ہم پر یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اپنے بچوں کو شروع ہی سے سائنس پڑھوائیں۔ ابتدا میں سائنس پڑھنے والوں کی تعداد اگر لاکھوں پر مشتمل ہو گی تو آخر میں چل کر کہیں چند ایسے سائنس دان پیدا ہوں گے جو ملک کے لئے مایۂ ناز ہوں۔

موجودہ صورت میں سائنس اختیاری مضمون ہے لازمی نہیں۔ میرا خیال ہے کہ کم از کم آٹھویں جماعت تک سائنس کو لازمی مضمون قرار دیا جائے۔ نویں

جماعت میں بچوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ بطور خود سائنس کو انتخاب کریں۔
اور پڑھیں۔ ان بچوں کے لئے مناسب مضامین کے گروپ بنانا بھی ضروری ہے۔
موجودہ صورت تسلی بخش نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت دسویں جماعت کا
جو امتحان یونیورسٹی لے رہی ہے اس میں لڑکوں نے یہ مضامین لے رکھے ہیں :—
فزیالوجی ہائی جین اور فارسی۔ زراعت اور ڈرائینگ وغیرہ وغیرہ۔ مضامین
کے گروپ کا مسئلہ اہم ہے اور ہماری فوری توجہ کا محتاج ہے۔

مَیں سائنس کا ذکر کر رہا تھا۔ سائنس کی تعلیم کا مقصد اس وقت تک حاصل
نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ہم عملی سائنس پر پُورا پُورا زور نہ دیں۔ عملی سائنس
تعلیم سائنس کی جان ہے۔ جب تک ہر سکول میں تجربہ گاہ کا معقول انتظام نہ
ہوگا۔ اور اس میں کافی سامان مہیّا نہ کیا گیا ہوگا۔ سائنس کی صحیح تعلیم ناممکن ہے۔
سامان کا کافی ہونا ہی اچھی تعلیم کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ اُستاد کا قابل ہونا بھی ضروری
ہے۔ اُستاد کو B.Sc. ضرور ہونا چاہیئے۔ تجربہ گاہوں کا اچھا ہونا اور قابل استاد
کا مقرر ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ سکول کی انتظامیہ کمیٹی سائنس پہ روپیہ فراخ دلی
سے خرچ کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں۔

ہر سکول کی یہ کوشش ہونی چاہیئے۔ کہ سائنس کا استاد B.Sc. ہو خواہ
وہ چھوٹی جماعت کو پڑھا رہا ہو یا بڑی جماعت کو۔ جب تک اُستاد کا دائرہ نگاہ
وسیع نہ ہوگا۔ بچے سائنس کی تعلیم سے پورا پورا فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے۔ استاد
قابل ہوگا تو بچوں کو سکول کے بعد سائنس کے اچھے مشاغل میں لگائے رکھے گا۔ یہی
وہ مشاغل ہیں۔ جو بچوں میں وسعت نگاہ پیدا کرتے ہیں اور ان کو سائنس کی شاہراہ
پر ڈالنے میں ہمارے ممد ہوتے ہیں۔

مختصراً میری یہ عرض ہے کہ سائنس کو لازمی مضمون قرار دیا جائے تجربہ گاہوں

کے لئے معقول سامان مہیا کیا جائے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ استاد اس مضمون کے لئے مقرر کئے جائیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو۔ سائنس کی تعلیم پر روپیہ فراخ دلی سے خرچ کیا جائے۔

انگریزی راج میں موجودہ تعلیم پر عام طور پر یہ نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ کہ یہ تعلیم ہمیں لامذہبیت کی طرف لے جا رہی ہے۔ اب جب کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں۔ اور پاکستان قائم ہو چکا ہے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس نقص کو فوراً دور نہ کر دیں۔ مذہبی تعلیم فوراً شروع ہونی چاہیئے۔ مگر اس میں تنگ نظری سے کام نہ لیا جائے اگر ایسا ہؤا تو نتائج بجائے اچھے نکلنے کے بُرے نکلیں گے۔ تعلیم مذہب ایک وسیع مضمون ہے۔ اس کی وسعت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ ضروری مذہبی ارکان کا جاننا ناگریز ہے مگر یہ مذہب کا اولیٰ حصہ ہے۔ تعلیم مذہب میں بانیٔ اسلام اور بزرگانِ دین کی سوانح کو کافی اہمیت دی جائے۔ رسول اکرمؐ کی پاک زندگی کما حقہٗ واقفیت کو لازم قرار دیا جائے۔ آپ کی زندگی کے حالات mcentric Zines پر پڑھائے جائیں۔ تاکہ بچہ جب ثانوی تعلیم سے فارغ ہو تو اس آپ کی زندگی کے حالات پر اتنا عبور ہو کہ اس کو زندگی میں جہاں کہیں کوئی مشکل درپیش آئے وہیں آنحضرتؐ کی زندگی کا کوئی پہلو مشعل ہدایت بن کر اس کی رہنمائی کرے۔

قابل قدر اسلامی ہستیوں کا تعلق تاریخ سے بھی ہے اور مذہب سے بھی دونوں کی نوعیت جداگانہ ہے۔ تاریخ میں محض واقعات سے بحث ہوتی ہے۔ ا مذہب میں اسلامی کیریکٹر سے۔ مذہب بچوں کو بتائے گا۔ کہ غلامانِ رسول کیسی زندگی بسر کرتے تھے اور اس کے باعث ان میں کیا کیا جوہر پیدا ہوتے تھے۔ تاریخ میں بچہ پڑھے گا کہ حضرت خالد بن ولید اعلیٰ جنرل تھے۔ دلیر تھے۔ شجاع

ر انہوں نے فلاں فلاں فتوحات حاصل کیں۔ لیکن حضرت خالد بن ولید کے
الات بچہ جب مذہب کی روشنی میں پڑھے گا تو اس کو معلوم ہوگا کہ آپ کی بہادری
ر شجاعت آپ کے نورِ ایمان کا ایک پرتو تھی۔ آپ نے ایک سچے مومن کی حیثیت
ے اپنے جان و مال کا سودا اپنے خدا سے کیا ہوا تھا۔ آپ کو اپنے خدا پر پورا پورا
بھروسہ تھا۔ آپ کو یقین کامل تھا۔ کہ آپ کی جان کا محافظ وحدہٗ لاشریک ہے۔
پھر آپ کو کسی خطرے میں کودنے سے کس چیز کا ڈر ہو سکتا تھا۔ بچہ کو پتہ لگے گا۔ کہ
زتِ ایمان کس قسم کی زندگی بسر کرنے سے میسر ہوتی ہے۔ بچوں میں اسلامی کیریکٹر
اسی قسم کے واقعات پڑھنے سے پیدا ہوگا۔ اور یہ ایک بے نظیر چیز ہے۔ بچہ جب
اسلامی کیریکٹر اپنے میں پیدا کرلے گا تو وہ یقینی طور پر حق حلال کی روزی کمائیگا۔ اس کے
سینہ میں بے باک صداقت ہوگی۔ اور بے لوث محبت۔ پاکستان کی بھی بچے
سچی خدمت کر سکیں گے۔

مذہبی تعلیم کا نصاب کیا ہونا چاہیئے۔ اس کا فیصلہ نہ صرف علماء دین
ریں اور نہ ہی ماہرین تعلیم۔ بلکہ یہ دونوں سر جوڑ کر بیٹھیں اور کافی غور و خوض
اور بحث مباحثہ کے بعد ایک نصاب تیار کریں۔ یہ نصاب پھر مختلف انجمنوں
کے زیرِ بحث آئے۔ اگر کہیں مناسب تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو تو نصاب مرتب
کرنے والوں کی اجازت سے اس میں تبدیلی کر دی جائے۔

مَیں انگریزی دور کا تعلیم یافتہ ہوں۔ مذہب سے دُور اور ایک حد تک اس
سے بے بہرہ۔ اس لئے میرا اور کچھ کہنا مناسب نہیں۔ مَیں اتنا ہی عرض کروں گا۔
اگر مذہبی تعلیم کا نصاب درست ہو اور پڑھانے والے اصحاب نیک ہوں تو یقینی طور پر
مذہبی تعلیم کے ذریعے ہمارے بچوں میں اعلےٰ جوہر پیدا ہو سکتے ہیں۔

ثانوی تعلیم کے متعلق دو اور ضروری باتیں عرض کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ ثانوی

تعلیم کی مدت کیا ہو۔ دوسری یہ کہ اس زمانے میں بچّے کون کون سے مضامین پڑھیں اور ہر مضمون کی وسعت کیا ہو۔ ابتدائی تعلیم کا منشاء یہ ہے کہ بچے میں نوشت و خواند کی پختگی آجائے۔ لکھنے پڑھنے کے معمولی روزمرہ کے کام وہ بلا تکلف کر سکے۔ اور اگر بچہ اپنی تعلیم اس کے بعد ترک کر دے تو وہ پھر جاہل مطلق نہ بن جائے۔ اسی طرح ثانوی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے۔ کہ لڑکا یا لڑکی اس تعلیم کے حاصل کرنے کے بعد زندگی کے جس شعبہ میں جانا چاہے جا سکے۔ جس لائن کو اختیار کرنا چاہے اختیار کر سکے۔ اور اس میں اس کو کوئی خاص دِقّت در پیش نہ آئے۔ اگر ثانوی تعلیم کا مقصد یہ رکھا جائے تو یقینی طور پر موجودہ مدت کافی نہیں ہے۔ اس میں ایک سال کا اور اضافہ کر دیا جائے۔ اور آخری جماعت بجائے دسویں کے گیارویں ہو۔ اس گیارویں جماعت کی تعلیم تقریباً اسی معیار کی ہو جو اس وقت Inter- mediate کی ہے۔ یہ مشکل نہیں کیونکہ اول تو مدت میں ایک سال کا اضافہ ہو دوسرے یہ کہ لڑکے اُس دِقّت سے بچے رہتے ہیں جو ان کو موجودہ صورت میں اپنے مضامین ایک غیر ملکی زبان میں سیکھنے کی وجہ سے درپیش آتی ہے۔ انگریزی کے ذریعے تعلیم ہونے کی وجہ سے بہت سا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ بچّے جتنی توجہ نفسِ مضمون کی طرف دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ توجہ انہیں انگریزی طرف دینی پڑتی ہے۔ چونکہ انہیں ایک غیر ملکی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہوتا ہے

رہا مضامین کی تعداد کا سوال۔ یہاں اگر آزاد ملکوں کی تقلید کی جائے تو بُرا نہ ہوگا۔ سینئر کیمبرج اور لندن کے میٹرکولیشن کے امتحانات میں بچّے چھ سے آٹھ مضمون تک لیتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے بچّے بھی اِتنے مضامین پڑھیں۔ ان امتحانات میں Physics جُدا مضمون ہے اور Chemistry جُدا۔ اِسی طرح حساب کے دو ٹکڑے ہیں۔ ایک ادنٰے اور ایک اعلٰے۔ اور

مضامین کے بھی ضرورت کے لحاظ سے ٹکڑے کئے ہوتے ہیں۔ یہ مسئلہ ہماری فوری توجہ کا محتاج ہے۔ اور ہمیں اس کی طرف اپنی پوری توجہ دینی چاہیئے۔

قبل اس کے کہ میں یہ بحث ختم کروں میں ایک چھوٹی سی عرض اور کرنا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ موجودہ ورنیکلر اور اینگلو ورنیکلر استادوں کا جو فرق ہمارے اسکولوں میں ہے وہ مٹا دینا چاہیئے۔ یہ فرق بچوں پر بُرا اثر ڈالتا ہے۔ تنخواہ کے لحاظ سے کسی استاد کی عزت ہو۔ اس سے بڑی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

آخر میں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں اور کہتے ہوئے ڈرتا بھی ہوں۔ وہ یہ کہ ثانوی اسکولوں کو تعلیمی فیکٹریاں نہ بنایا جائے۔ ایک ہائی اسکول میں طلبا کی تعداد اتنی ہونی چاہیئے۔ جتنی نگرانی ایک ہیڈ ماسٹر آسانی سے کر سکتا ہے۔ اگر کسی اسکول میں ۱۲ سو لڑکے ہوں تو اس کو توڑ کر اس کے دو اسکول بنا دینے چاہئیں۔ تعداد کی کثرت کی وجہ سے اُستاد اور شاگرد میں جو شخصی رابطہ ہوتا ہے وہ قائم نہیں رہتا یہ ایک قیمتی چیز ہے۔ اس کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

انیس الدین انصاری

زمانۂ قدیم سے آج تک نئی نسل اپنے بزرگوں سے نقّالی کے ذریعے زندگی گذارنے کے طریقے سیکھتی آرہی ہے ۔ یعنی جس طرح حیوانات کے بچّے فطری طور پر اپنے لئے خوراک حاصل کرنے کا طریقہ جانتے ہیں یا اپنی جان کو ہلاکت و تکالیف سے محفوظ رکھنے کی تدابیر سمجھتے ہیں ۔ اور ان پر عمل کرتے ہیں ۔ اسی طرح انسان کے بچّہ میں بھی جبلّی طور پر اپنے لئے خوراک حاصل کرنے ۔ اپنے آپکو ہلاکت سے بچانے یا اپنے آرام کے لئے اشیاء کو فراہم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے ۔ اگر انسان کے بچّے کا مقابلہ کسی جانور کے بچے سے کیا جائے تو فوراً یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ انسانی بچّہ جانوروں کے بچے کے مقابلہ میں زیادہ پرورش کے لئے مجبور و معذور رہتا ہے ۔ یہ مثل مشہور ہے کہ "پانی کے جائے کن ترائے" یعنی مچھلی کے بچّے پانی میں تیرنا کسی سے سیکھتے نہیں ہیں ۔ وہ تو فطری طور پر تیرنا جانتے ہیں ۔ لیکن انسان کے لئے بے حد ضروری ہے کہ وہ اپنے بچّوں کو زندگی گذارنے کے طریقے سکھائے ۔ مکمل زندگی گذارنے کے طریقے سکھانے کا نام "تعلیم" ہے ۔ اس لئے تعلیم کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بچّہ کی پوری زندگی ایسے ماحول میں گذارنے کا انتظام کیا جا

کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اچھی عادات اختیار کرے۔ تعلیم کے اِس وسیع مفہوم کی روشنی میں بچہ کی پوری زندگی "تعلیم" ہو جاتی ہے یعنی ہر بچہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں کچھ عادتیں اختیار کرتا رہتا ہے۔ اور اُس کے خیالات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے اسی لئے ماہرینِ تعلیم کا خیال ہے کہ تعلیم زندگی ہے اور ہر انسان کی زندگی اُس کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ جس طرح ایک انسان کی زندگی اچھی یا بُری ہو سکتی ہے اسی طرح تعلیم بھی اچھی یا بُری ہو سکتی ہے۔ اِس کے علاوہ یہ ممکن نہیں کہ ایک انسان کے لئے یہ کہا جائے کہ وہ چوبیس گھنٹہ میں صرف ۶ گھنٹے زندہ رہتا ہے۔ اور باقی وقت نہ زندہ نہ مُردہ۔ اِسی طرح بچہ بھی چوبیس گھنٹہ میں ہر وقت تعلیم حاصل کرتا رہتا ہے۔ اگر ایک بچہ چھ گھنٹے کے لئے مدرسہ جاتا ہے تو یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ اُن چھ گھنٹوں میں تو تعلیم حاصل کرتا ہے اور باقی وقت نہ تعلیم ہے اور نہ تربیت۔ بچہ تو زندگی کے ہر لمحہ میں غلط یا صحیح تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ماہرین نفسیات نے ثابت کیا ہے کہ بچہ کی حقیقی تعلیم اُس وقت ہوتی ہے جب بچہ سوتا ہے یعنی جاگنے کی حالت میں تو اُس کے دماغ پر تاثرات پیدا ہوتے ہیں اور سونے کی حالت میں وہ تاثرات منظم ہوتے ہیں اور پھر وہ پائدار یا غیر پائدار ہونے کی کیفیت سے گذرتے رہتے ہیں۔ اور نیند کے اختتام پر یہ تنظیم اور پائدار بننے کا کام ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ مختصراً بچہ کی تعلیم زندگی کے ہر لمحہ میں ہوتی رہتی ہے۔ اور والدین و اساتذہ کا فرض ہے۔ کہ وہ اس حقیقت کی روشنی میں بچہ کی تعلیم و تربیت کے لئے وسائل اختیار کریں۔ آج کل جدید نظریات تعلیم میں اِس اصول کی وضاحت بے حد کی جا رہی ہے۔ کہ "تعلیم اور زندگی" ایک چیز ہیں۔ نئی تعلیم میں اس اصول کے پیش نظر گھر اور مدرسہ کا تعلق بہت قریبی ہوتا جا رہا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مدرسہ میں ایک قسم کی تعلیم ہے اور گھر میں دوسری قسم کی۔ تو بچہ کے لئے یہ متضاد طاقتیں دماغی اُلجھن کا باعث بن جاتی ہیں۔ اور ذہنی اور دماغی اعتبار سے بچے پست درجہ کے ہو جاتے

ہیں مثلاً مدرسہ میں یہ تعلیم دی جاتی ہو کہ قوم کے مفاد کو اپنی ذات کے مفاد پر مقدم رکھ جائے۔ گھر پر بچہ یہ دیکھے کہ والدین ذاتی مفاد کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ تو بچہ ذہنی اعتبار سے اُلجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی تربیت بے حد ناقص ہو جاتی ہے۔

جب یہ امر تسلیم کر لیا جائے کہ تعلیم زندگی کے ہر لمحہ میں ہوتی رہتی ہے تو سوسائٹی کے لئے یہ نہایت ضروری ہو جاتا ہے کہ بچوں کی تعلیم کے لئے صرف مدرسوں کا قیام کافی نہ سمجھے بلکہ مدرسہ کے علاوہ بچوں کا جو وقت صرف ہو وہ بہترین تعلیمی ماحول میں ہو۔ نئی تعلیم کے نظریوں کے مطابق تعلیم مسرت آگیں تخلیقی اور دلی ہونا چاہیئے یعنی صحیح تعلیم وہ ہے جو بچّہ میں جذبات مسرت ولطف پیدا کرے۔ بچّہ ایسے مشاغل میں وقت صرف کرے۔ کہ اُن مشاغل سے اُس کو زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل ہو۔ اور اُن مشاغل سے اُس کے اندر خوبیاں بھی پیدا ہوتی جائیں۔ اُن مشاغل میں اُس کی ایجادی قوتیں بھی ظاہر ہوتی رہیں۔ اور وہ مشاغل خود تجویز کرے۔ وہ مشاغل اُس پر ٹھونس نہ دئے جائیں سماجی تعلیم اور تخلیقی تعلیم کی ضروریات پورے طور پر حاصل ہو سکیں۔ ہر دو مقاصد کی تکمیل صرف اُس صورت میں ممکن ہے کہ مدرسہ کے بعد اُن محلوں میں جہاں بچّے رہتے ہیں بچّوں کے کلب قائم کئے جائیں۔ مدرسہ کے بعد اپنے مکان کے قریب تفریح کا وقت کسی کلب میں صرف کرے جہاں اُس کے کھیل کا انتظام ہو۔ نیز ایسے تفریحی انتظامات ہوں جن میں مصروف رہ کر وہ تفریح بھی کرے اور تعلیم بھی ہوتی رہے۔ اُن کلبوں میں تفریحی مشاغل کا زیادہ سے زیادہ انتظام ہونا چاہیئے۔ دستی مشاغل مثلاً لکڑی کا کام۔ دھات کا کام۔ دفتی اور مٹی سے مختلف اقسام کی اشیا بنانا وغیرہ۔ بچوں کے بنائے ہوئے جغرافیہ کے چارٹ اور ماڈل۔ سائینس کے چارٹ اور ماڈل غرضیکہ تمام وہ اشیا جو تعلیمی نمائش میں دکھائی گئی ہیں۔ کلب میں رکھی جائیں

اور اُن کے پڑھنے کا انتظام وہاں ہو۔ اس کے علاوہ بچوں کی سوسائٹیاں کلب کے زیر اہتمام ہوں اور اُن کے جلسے و دیگر تقریبیں اُن کلبوں کے زیر اہتمام ہونا چاہئیں۔ کلب کے نگران اُسی محلہ میں رہنے والے ایک یا دو اُستاد ہوں۔ والدین کی جماعت یا حکومت کی جانب سے ایسا انتظام ہو کہ وہ استاد جو کلب میں وقت صرف کریں کچھ الاؤنس بھی پائیں۔ اگر اُس محلہ میں کوئی اُستاد نہ رہتا ہو۔ تو کوئی ایسا شخص جو اِس قسم کے کام کے لئے موزوں ہو اُس کا تقرر کیا جائے اور والدین کی جماعت چندے کے ذریعے اُن صاحب کو کچھ الاؤنس دیں تو بہتر ہے۔ بغیر الاؤنس ادا کئے کلب کی کامیابی دشوار ہے۔ کلب کے منتظمین کی ایک کمیٹی ہو جو والدین اور بچوں کے سرپرستوں پر شامل ہو۔ اِن کلبوں کے انتظام کے لئے وہی سب کچھ کرنا ہوگا جو مدرسہ کے انتظامات کے لئے کرنا ہوتا ہے۔ یعنی کلب کے لئے والدین یا حکومت سے چندہ یا امدادی رقم حاصل کی جائے اور انتظامی جماعت اُس کا انتظام کرے۔ کلب میں ایک کتب خانہ اور دارالمطالعہ لازمی ہے۔ یہ مختصر اُ خاکہ ہے۔ اصول یہ ہے کہ مدرسہ کے بعد بھی طلبہ کی تفریح کے اوقات ایک منظم صورت سے صرف کرنے کا انتظام بہت ضروری ہے۔

انگلستان میں ایک جماعت ہے جس کا نام " لڑکوں کے کلبوں کے لئے قومی انجمن "

ملک کے مختلف حصوں میں

اب سے دس سال پہلے ۱۵۸ کلب تھے۔ جن کے ممبران کی تعداد تقریباً ایک لاکھ تھی جن میں دس گیارہ برس سے ۱۸-۱۹ برس تک کے لڑکے شامل ہوتے تھے۔ اِسی طرح ایک اور جماعت انگلستان میں ہے جس کا نام " لڑکیوں کے کلبوں کی قومی کونسل "

اِس میں بھی ممبران کی تعداد تقریباً

ڈیڑھ لاکھ تھی۔

ہندوستان کے بعض شہروں میں بھی یہ کلب جاری کئے گئے ہیں۔

اور بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔
ہمارے ملک میں بھی بچوں کے کلب قائم کرنے کے لئے توجہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ مدرسہ سے واپس آکر کلبوں میں بچے بہتر طریقے سے وقت صرف کرسکیں ؏

بچّوں کی "افتاد طبیعت"

(اور اس کی پیمائش)

مفتاح الدین ظفر

یوں تو مغربی ممالک میں روزانہ زندگی کے ہر شعبہ میں نئی نئی ایجادیں اور اختراعیں ہوتی رہتی ہیں لیکن غالباً ان سب میں بچّوں کی تعلیم کا مسئلہ سب سے زیادہ توجہ حاصل کرتا ہے۔ اور اس اہم مسئلہ پر روزانہ ایسی ایسی مفید تحقیقات کے نتائج منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں کہ ہم اساتذہ اور والدین جب ان ماہرینِ تعلیم کی کاوشوں اور حکومتوں کی دلچسپیوں کا مقابلہ اپنی "بے کسی کے عالم" سے کرتے ہیں تو سرِ ندامت جھکانے کے سوا اور کچھ بن نہیں پڑتا۔ یورپ اور امریکہ میں بچّوں کی تعلیم پر جس قدر توجہ دی جاتی ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں ممالک متحدہ امریکہ میں ۲۴ لاکھ اسکول اور کالج تھے اور وہاں کی حکومت نے کروڑوں روپے ان درسگاہوں پر خرچ کئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ ملک دنیا کے سب ممالک میں، دولت میں، صنعت و حرفت میں اور تہذیب و تمدن میں پیش پیش ہے۔ اور وہاں ۹۵ فی صدی آبادی خواندہ اور تعلیم یافتہ ہے۔

طلبا کی تعلیم کے سلسلے میں مغربی ممالک نے جو اہم ترین قدم اُٹھایا ہے وہ غالباً یہ امر ہے کہ انھوں نے جابجا ایسے ادارے قائم کردئے ہیں۔ جن سے بچوں کی "افتادِ طبع" سے پوری پوری واقفیت حاصل ہو جاتی ہے یعنی اس امر کا پتہ چل جاتا ہے کہ کون بچہ کس کام کے لائق ہے۔ کس کام میں وہ لگایا جائے کہ اپنی صلاحیتوں کو پورے طور پر کام میں لاسکے۔ اپنی فطری تحریکات اور رُجحانات سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھا سکے اور اس طرح نہ صرف تعلیم ہی حاصل کرسکے بلکہ سوسائٹی میں اپنی زندگی انتہائی کامیابی کے ساتھ گذار سکے۔ اور اس طرح ملک و قوم کے لئے باعثِ نازش و اطمینان بن سکے۔ اس کے معنی صاف طور پر یہ ہیں کہ بچے کو اس کے حال پر نہیں چھوڑ دیا جاتا بلکہ اس کی دماغی قوتوں کا پتہ لگا کر اُس کو اُسی لحاظ سے تعلیم دی جاتی ہے یا کاروبار میں لگایا جاتا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس طرف مطلق توجہ نہیں دی گئی۔ توجہ دینا تو درکنار میرا خیال ہے کہ اس مسئلہ کی ابجد سے بھی بہت کم لوگوں کو اور خاص کر اساتذہ کو واقفیت ہے۔ گذشتہ غیر ملکی حکومت کی حکمتِ عملی کے زیرِ اثر مسلمان استاد (دوسرے ماہرینِ فن کی طرح!) اپنی خدمت کو کمائے ہوئے پیسے کی نسبت سے تولنے لگا۔ اس گذشتہ اثر کے مغلوب اُستاد کو اس امر کا احساس تک نہیں ہوتا کہ قوم کا ایک خادم ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض یہ ہی نہیں ہے کہ وہ مدرسہ اور کالج میں پہنچ جائے اور ایک بازیگر یا شعبدہ باز کی طرح اپنا فن نوخیز دماغوں کے سامنے پیش کردے اور داد تحسین لے کر گھر واپس آجائے اور بس۔ آپ ذرا ٹھنڈے دل سے غور تو فرمایئے کہ کیا ہمارا فرض صرف یہی ہے! کیا ہم اپنے بچوں کی زیادہ سے زیادہ یہی خدمت سرانجام دے سکتے ہیں۔ کہ ان کو بُرا یا بھلا کتابی سبق پڑھا دیں اور پھر "تعلیم" سے کوئی دلچسپی نہ لیں۔ جب تک آشنا

اپنے وجود کی اہمیت کو قوم کے دلوں میں جاگزین نہ کردے گا۔ قوم اس کا شمار اہم ترین معمارانِ قوم میں کرنے سے گریز کرتی رہے گی! خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔

ممالک مغرب میں جیسا عرض کر چکا ہوں ماہرین تعلیم و نفسیات اپنے تجربے سے بچے کی افتادِ طبیعت کا اندازہ لگا لیتے ہیں۔ اور یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ ایک بچہ کس قسم کی تعلیم سے مستفید ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ وہ یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے موزوں ہے یا تیکنکی تعلیم کے لئے۔ وہ فوج میں اچھا ثابت ہو سکتا ہے یا تجارت میں کامیابی حاصل کر سکتا ہے! اور اس طرح وہ بچے کو نہ صرف تضیع اوقات سے بچاتے ہیں۔ بلکہ اپنی قوم کی صحیح معنی میں خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ چنانچہ پچھلے چند سالوں میں اس طرح انہوں نے بڑی کامیابی سے اپنے یہاں کے ہزاروں بچوں کی قسمتیں بدل ڈالیں اُن بچوں کی جو اگر غلط راستہ پر ڈال دئے جاتے تو شاید اپنی زندگی تباہ اور برباد کر ڈالتے!!

"افتادِ طبع" کی آزمائش کے سلسلے میں گذشتہ جنگ عظیم کے دوران میں امریکہ، فرانس، انگلستان، اور جرمنی وغیرہ ممالک نے بڑا کام کیا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی نوجوان فوج میں کسی آسامی کے لئے درخواست دیتا ہے لیکن جب اس کا نفسیاتی امتحان لیا جاتا ہے۔ تو وہ اس کام کے لئے نہیں بلکہ فوج میں کسی دوسرے کام کے لئے زیادہ موزوں ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض مرتبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی نوجوان یا اس کے سرپرست یہ سمجھتے ہیں کہ لڑکا فلاں کام کے لئے موزوں نہیں ہے لیکن اس کی آزمائش کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت اس کام کے لئے بہت موزوں ہے۔ چنانچہ جب نفسیاتی امتحانات کی رو سے نوجوان کو مناسب کام میں لگا دیا جاتا ہے تو وہ اس میں غیر معمولی اور غیر متوقعہ کامیابی اور کامرانی حاصل کر لیتا ہے اور اس طرح ان نفسیاتی امتحانوں کی اہمیت کا عملی ثبوت پیش کر دیتا ہے۔

ہمارے ملک میں فوج میں بھرتی کے لئے جو سپاہی اور افسر لئے جاتے ہیں ان کا

بعض بعض حالتوں میں نفسیاتی امتحان لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ابھی ابتدائی مراحل کا منظر ہے۔ ابھی بہت کچھ ترقی کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں واقعی نفسیاتی تجربوں سے فائدہ اُٹھانا ہے تو ضرورت اِس امر کی ہے کہ اس علم میں اعلیٰ تربیت حاصل کئے ہوئے ماہرینِ فن کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اور ان کے ذریعے نفسیات سے حقیقی معنی میں دلچسپی رکھنے والے اشخاص کو نفسیاتی تجربوں اور آزمائشوں میں مکمل ٹریننگ دی جائے اور اس طرح ان کو ملک کی خدمت کے لئے تیار کیا جائے۔ یا یہ کہ ہم اپنے یہاں کے طلبا کو ولایت بھیجیں۔ اور ان کو اس علم میں مہارت بہم پہنچائیں۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ پہلا قدم ملک اور قوم کے لئے بہتر اور مؤثر ثابت ہو سکتا ہے۔

لیکن آپ یہ دریافت فرماسکتے ہیں کہ یہ "افتادطبیعت" کی آزمائش ہے کیا؟ جیسا عرض کیا جاچکا ہے یہ ایک قسم کا امتحان ہے۔ جس میں نفسیاتی اصولوں کو مدنظر رکھے ہوئے تجربات اور مشاہدات کے ذریعے بچہ کی صلاحیتوں کو دریافت کیا جاتا ہے کہ بچہ کے لئے کون سی تعلیم مناسب ہوسکتی ہے اور کون سی نہیں۔ وہ کس کام میں لگایا جائے کہ وہ اس میں اپنی فطرت کے مطابق دلچسپی لے۔ اور ترقی کرے۔ تقریباً ۴۰۰ ق۔م میں فلاطون نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "ریپبلک" (Republic) میں اِس امر کی توجہ مبذول کرائی تھی۔ ہمیں ایسے امتحانات اختراع کرنا چاہئیں۔ جن سے ایک شخص کی خفتہ صلاحیتوں کا پتہ لگ سکے۔ اسی نے سب سے پہلے یہ محسوس کیا تھا کہ "ہر شخص کو وہی ایک کام کرنا چاہئے جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہو"۔ لیکن فلاطون کا یہ خواب انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ ۱۸۷۹ء میں ولیم وونٹ (William Wundt) نامی ماہر نفسیات نے سب سے پہلا نفسیاتی دارالتجربہ لیپزگ میں قائم کیا۔ اور اس طرح فلاطون کے خیالات کے مطابق اشخاص کی فطری خوبیوں کو آزمانے کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن اس زمانہ کے ماہرینِ نفسیات کا کام بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ ان لوگوں نے بجائے یہ دریافت

نے کے کہ مختلف اشخاص کن کن باتوں میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ یہ
معلوم کرنے میں وقت گذار دیا کہ مختلف اشخاص کن کن باتوں سے ایک دوسرے سے
مماثلت رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی تحقیقات سے دماغی افعال کے عام قوانین تو اخذ ہوئے
لیکن ان سے ذہنی امتحانات کے مسئلہ پر کوئی روشنی نہ پڑ سکی۔ پھر بھی ان فلسفیوں کے
کاموں سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ ان کی تحقیقات سے ذہنی آزمائشوں کے طریقے دریافت ہو گئے
اور عملی نفسیات کی داغ بیل پڑ گئی۔ رجحان طبع یا افتاد طبع کی آزمائشوں کا تعلق زیادہ تر
اسی عملی نفسیات سے ہے!

وونٹ کے دارالتجربہ میں دُور دُور سے شائقین علم آکر اکتساب علم کرتے تھے۔ ان ہی لوگوں
میں امریکہ کا ایک شخص جے۔ ایم۔ کیٹل (J. M. Cattle) نامی تھا۔ ۱۸۹۰ء میں کیٹل
نے ایک قسم کے امتحانات شائع کئے۔ جو اس نے اپنے طلبا اور دیگر اشخاص پر آزمائے تھے۔
اسی زمانے میں ایک انگریز ماہر علم النفس فرانسس گالٹن (Francis Galton)
نے کیٹل کے چند تجربات کو دوہرا دیا۔ ان آزمائشوں میں آسان قسم کی ذہنی آزمائشیں تھیں
نیز چند طبعی آزمائشیں بھی شامل تھیں۔ اس کے بعد کچھ اور نفسیاتی امتحانات میدان
میں آئے۔ اور وہ کیٹل کے امتحانات کے مقابلے میں زیادہ نفسیاتی بھی تھے۔ لیکن ان سے
ماہرینِ فن کو اطمینان کلّی حاصل نہ ہوا۔ یہاں تک کہ موجودہ صدی عیسوی کے ابتدائی
سالوں میں بینے اور سائمن (Binet & Simon) نامی ماہرینِ علم النفس نے
اپنے مشہور و معروف نفسیاتی امتحانات اختراع کر کے دنیا کے سامنے پیش کئے۔ ان امتحانات
نے دنیا بھر کے ماہرینِ فن سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ان
کے ذریعے مختلف عمروں کے بچّوں کے ذہن کی آزمائش ہو سکتی تھی۔ اور یہ معلوم کیا جا سکتا
تھا کہ ایک بچّہ معمولی طور پر ذہین ہے۔ یا کُند ذہن ہے۔ سب سے پہلے امریکہ میں ۱۹۱۰ء
میں ذہنی امتحانات کے اصولوں پر "افتادِ طبع" کو ناپنے کے لئے امتحانات وضع کئے گئے۔

ان کا نام "کولمبیا ٹیسٹ" (Columbia Test) تھا۔ لیکن یہ سب امتحانات الگ الگ افراد کی آزمائش کے لئے تھے۔ یعنی یہ "انفرادی امتحانات" تھے۔ جب دنیا کی پہلی جنگِ عظیم چھڑی تو امریکہ والوں نے اس امر کی ضرورت کو محسوس کیا۔ کہ تھوڑے وقت میں بہت سے افراد کا امتحان لینے کا طریقہ معلوم کیا جائے۔ چنانچہ "اجتماعی سوالات" (Group Tests) اختراع کئے گئے۔ ان سوالات سے اُمیدواروں کو جانچنے میں ایک گھنٹہ سے زیادہ صرف نہ ہوتا تھا۔ یہ امتحانات دو قسم کے تھے۔ یعنی الفا اور بیٹا۔ ان میں بیٹا زیادہ اہم نہیں تھے۔ کیونکہ یہ اَن پڑھ اور انگریزی زبان سے بے بہرہ لوگوں کے لئے ایجاد کئے گئے تھے۔ اور وہ زیادہ تر تصاویر پر مبنی تھے۔ الفا امتحانات زیادہ اہم تھے۔ کیونکہ یہ خواندہ لوگوں کے لئے بنائے گئے تھے۔ ان میں مندرجہ ذیل قسم کے سوالات شامل تھے

(۱) سمت معلوم کرنا۔ (۲) علم الحساب۔

(۳) بہترین جواب یا قوت فیصلہ کا عملی امتحان۔

(۴) مماثل اور متضاد باتیں۔ (۵) غیر مرتب جملے۔

(۶) اعداد و شمار کی تکمیل۔ (۷) اشیاء کی نسبت۔

(۸) عام معلومات۔

ان امتحانات کے ذریعے ایک وقت میں ۵۰۰ سپاہیوں کا امتحان لیا جا سکتا تھا ان کی کامیابی کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے۔ کہ لڑائی کے زمانے میں تقریباً ۵ لاکھ اشخاص کا امتحان لیا گیا۔ اور بڑے اچھے نتائج حاصل کئے گئے۔ اس طرح لوگوں کو ان کے عملی فوائد کا احساس ہو گیا۔ جب جنگِ عظیم ختم ہو گئی تو یہ خیال عام ہو تا گیا۔ کہ ان امتحانات کو فوج سے سول طبقات کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ اور ان سے صنعت و حرفت، تکنکی تعلیم اور ملازمتوں میں مدد لی جائے۔ اس لئے نئی ضرورتوں کے مطابق نئے امتحانات وضع کئے گئے تاکہ ان کی مدد سے طلبا اور نوجوان افراد کا تعلیمی رجحان اور طبیعت کی افتاد کا اندازہ لگایا جائے

لیکن یہ سب امتحانات فوجی امتحانات سے اپنی صورت شکل میں اور دوسری باتوں میں ملتے جلتے تھے۔

ہر چند زمانہ حال کے ماہرین نفسیات نے افراد کی ذہنی پیمائش میں بڑی جدوجہد کی تھی لیکن "ذہنی قسمت" (I.Q) معلوم کرنے کے بعد وہ یہ تو معلوم کر لیتے تھے کہ کوئی شخص ذہین ہے یا طباع، غبی ہے یا کند ذہن، لیکن وہ یہ نہ بتا سکتے تھے کہ آخر وہ شخص کس کام کے لائق ہے یا یہ کہ اس کی طبیعت کس کام کی طرف زیادہ مائل ہے۔ اس لئے ماہرین نفسیات کی توجہات کا مرکز یہ اہم مسئلہ بن گیا کہ وہ ایسے سوالات اور امتحانات ایجاد کریں جن سے انواع و اقسام کے تعلیمی اور غیر تعلیمی فنون کے متعلق کسی شخص کی افتاد طبیعت کا صحیح صحیح پتہ دے سکیں۔ چنانچہ ان علما کی محنت ٹھکانے لگی اور انہوں نے ایسے امتحانات ایجاد کر لئے جن سے وہ ایک شخص کے متعلق صاف اور یقینی طور پر بتا سکتے ہیں۔ کہ اس کی طبیعت کس کام کے لئے موزوں ہے۔ اس وقت تک جن کاموں کے لئے ہزاروں افراد کو آزمایا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں:-

کاریگر	آگ بجھانے والا	تار (ڈاک خانے) بابو
آٹو۔میکنک	ہوا باز	ٹیلیفون بابو
موٹر مین	دوکان دار	استاد
پولیس مین	زمین کی پیمائش کرنے والا	چھاپہ خانہ کا کمپوزیٹر
ڈرائیور	ہوٹل پر کام کرنے والا	دفتری
سپاہی	کارخانہ دار	پیغام لے جانے والا
قید خانے کا محافظ	سلائی کی مشین کا	عام کلرک
ڈرافٹ مین	مرمت کرنے والا	آلات کا مرمت کرنیوالا
	گویا	

امتحانات کا تنوّع:

جیسا عرض کیا جا چکا ہے۔ افتادِ طبع کے امتحانات کا خاص مقصد یہ ہے کہ ان کے ذریعے سے افراد کی خفتہ صلاحیتیں معلوم کی جائیں۔ یعنی یہ دریافت کیا جائے کہ کوئی شخص کس کام کے یا کس قسم کی تعلیم کے لائق ہے۔ ان امتحانات کے علاوہ اور بھی اقسام کے امتحانات ایجاد کئے گئے ہیں۔ جن میں خاص طور پر معیاری امتحانات (Professional Tests) ہیں۔ ان امتحانات سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ کسی خاص کام یا پیشہ میں ایک شخص کی قابلیت کا معیار کتنی ہے، چاہے اس کو اس کام یا پیشہ میں پہلے تربیت نصیب ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ صنعت و حرفت میں ان امتحانات کو تجارتی امتحانات (Trade Tests) کہتے ہیں۔ اور اسکولوں میں معیارِ قابلیت کے امتحانات (Achievment Tests) کہا جاتا ہے۔ پچھلے چند سالوں کے اندر اندر ان آخرالذکر امتحانات میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ آج کل مدرسوں میں پڑھائے جانے والے سب مضامین کے لئے یہ "معیاری امتحانات" بن گئے ہیں۔ اور ان سے بڑا کام لیا جاتا ہے۔ "تجارتی امتحانات" پہلی جنگِ عظیم کے زمانے میں ہی اختراع کئے گئے تھے۔ فوج کو فوری طور پر ایسے لاتعداد نوجوانوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی جو مختلف قسم کے پیشوں میں مہارت رکھتے تھے۔ رنگروٹ عام طور پر اپنی لیاقت اور قابلیت کی داستان بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے اور اس بات کی ضرورت تھی کہ ان کی لیاقت اور قابلیت کا صحیح اندازہ لگایا جائے۔ اس لئے فوجی محکمہ نے چند تکنیکی ماہرین کے سپرد یہ خدمت کی۔ کہ وہ فوج کے اہم پیشوں کے واسطے "تجارتی امتحانات" ایجاد کریں ان اشخاص کے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر جو امتحانات اختراع کئے گئے ان سے پیشہ ور لوگوں کو ان کی قابلیت کے چار معیاروں کے لحاظ سے تقسیم کیا گیا یعنی (۱) پیشہ سے بالکل بے بہرہ (۲) تھوڑا بہت کام سیکھے ہوئے (۳) دورہ کا کام کرنے والے۔ اور (۴) ماہرینِ فن۔

ہم اس موقعہ پر ان معیاری امتحانات یعنی معیار قابلیت کے امتحانات اور تجارتی امتحانات کی تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔ ہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ان امتحانات سے کسی شخص کی پیشہ ورقابلیت یا علمی معلومات کا اندازہ لگانے میں بہت مدد لی گئی ہے۔ جس شخص کا معیاری امتحان لیا جاتا ہے اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اسے اپنے مخصوص مضمون میں دستگاہ حاصل ہو' اور اصل میں یہی وہ چیز ہے جس کا امتحان لینا مقصود ہوتا ہے۔

تجارتی امتحانات اور افتاد طبع کی آزمائش:

تجارتی امتحانوں اور افتاد طبع کی آزمائشوں میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ تجارتی امتحانوں میں کسی خاص تجارت کے متعلق معلومات حاصل ہونا ضروری ہے۔ لیکن افتاد طبع کی آزمائش میں اس کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی شخص کی فطری طبیعت کی صلاحیت کا صحیح اندازہ لگائیں تو یہ ضروری ہے کہ اس شخص نے کسی پیشہ ورفعل میں کوئی تربیت حاصل نہ کی ہو۔ ایسی حالتوں میں جب کہ اُمیدوار نے کسی پیشہ میں پہلے ہی سے ٹرینگ حاصل کر لی ہو تو افتاد طبع کے امتحانات میں جتنے نمبر وہ حاصل کرتا ہے ان میں سے کچھ نمبر وضع کر لئے جاتے ہیں جو اس کے حاصل کردہ علم کی نسبت سے معین کئے جاتے ہیں۔ اِس طرح ایک قسم کی تصحیح کر لی جاتی ہے۔ لیکن یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے۔ کہ اکثر "طبیعتوں کی افتاد" اِتنی پیچیدہ ہوتی ہے۔ کہ اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے بعض دفعہ کئی کئی امتحانات لینے پڑتے ہیں۔ چنانچہ اسی سلسلے میں ایک ساتھ سات آزمائشیں لی جاتی ہیں۔ جن کو "بیٹری سٹ" کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایسے امتحان کو *Omnibus Test* کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا پنسل اور کاغذ سے کئے جانے والا امتحان ہے جس میں بہت سے امتحانی سوالات ہوتے ہیں۔ جو متعدد اقسام کے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک *Omnibus Test* میں جو سوالات رکھے گئے وہ اس

قسم کے ہیں جن میں مندرجہ ذیل قسم کی آزمائش شامل ہیں (۱) معمولی عقل کی باتیں - (۲) متضاد باتیں (۳) نسبت (۴) عام معلومات (۵) ہم معنی الفاظ — پورے امتحان کے پہلے پانچ سوال ایسے ہوں گے جو مندرجہ بالا اقسام میں پہلی قسم کی آزمائش پر مشتمل ہوں گے۔ اگلے پانچ سوال دوسری قسم کی آزمائش پر مبنی ہوں گے اور اسی طرح کل سوالات مرتب ہوں گے۔ عموماً اس قسم کے ایک درجن یا اس سے زیادہ سوالات کے مجموعے ہوتے ہیں -

ہم ذیل میں اسی قسم کے ایک Omnibus Test کے مجموعہ کی ایک مثال تحریر کرتے ہیں -

۱- بلیاں مفید جانور ہیں کیونکہ (۱) وہ سیدھی ہوتی ہیں (۲) وہ پنجے مارتی ہیں - (۳) وہ چوہے پکڑتی ہیں (۴) وہ کتوں سے ڈرتی ہیں -

۲- بلند کا تضاد ہے (۱) اونچا (۲) نیچا (۳) نفیس (۴) عمیق -

۳- بندوق اور نشانہ بازی میں وہی نسبت ہے جو چاقو میں اور (۱) کاٹنے (۲) دوڑنے (۳) پرند (۴) لوہے میں ہے -

۴- امریکہ کا پتہ لگایا تھا (۱) ڈریک (۲) ہڈسن (۳) بالبوآ (۴) کولمبس نے -

۵- وہ لفظ جس کے معنی وہی ہیں جو سچ کے ہیں (۱) اچھا (۲) جھوٹ (۳) درست (۴) خوبصورت -

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ تمام امتحانات میں Omnibus Test کو کام میں لانا سب سے آسان ہے لیکن اِن سے جو نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ زیادہ قابل اعتماد نہیں ہوتے اِس لئے اور بھی اقسام کے امتحانات اختراع کئے گئے ہیں - اس امر کی ضرورت ہے کہ ایسے تجربات کئے جائیں اور سوالات کو پاکستان کے ماحول کے مطابق بنایا جائے اور پھر ان کو آزمایا جائے اور دیکھا جائے کہ ہماری فضا میں ہمارے بچوں کی استعداد کی جانچ پرکھ میں وہ کہاں تک مفید ثابت ہو سکتے ہیں

تربیتِ جسمانی

نذیر احمد

ہمارے مُلک کے دفاع کا تقاضا ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں ایک بنیادی
تبدیلی وقوع پذیر ہو۔ ہمیں اب دفتری حکومت کے ایسے بے حقیقت پُرزوں کی
ضرورت نہیں جو اپنے ضمیر کو چند روپہلی ٹکلیوں کے عوض بیچ ڈالیں۔ اور نہ ہی ہمیں
ایسے کثیرالمشاہرہ عالی منصب عمّال کی ضرورت ہے جن کے دل میں مُلک و ملّت کے
لئے کوئی تڑپ نہ ہو۔ برعکس اُس کے ہمیں ایک ایسا جمہوری نظام برپا کرنا ہے کہ ہمارے
ملک کا ہر ایک شہری جذبہ سرفروشی سے سرشار ہو کر اپنے آپ کو دنیا کی تمام کٹھن
آزمائشوں کے لئے تیار کرے۔ اِس مقصدِ وحید کا حصول ناممکن ہوگا۔ اگر ہم نئی پَود کو
جسے کل مُلک کی جُملہ ذمہ داریوں سے نپٹنا ہے اِس قابل نہ بنا دیں کہ وہ سیلِ تند رَو کی
طرح کوہ و بیاباں سے گذر جائے۔ وہ آج اُن تمام مردانہ صفات کا حامل ہو جو اُسے
سہل انگاریوں، عافیت کیشیوں اور مصلحت اندیشیوں کی اوٹ نہ لینے دیں۔ وہ

شاہیں صفت ہو۔ کارِ آشیاں بندی میں اُلجھ کر نہ رہ جائے۔ تن آسانی اس کا شعار نہ ہو۔ جلبِ منفعت اس کا مقصد اور حصولِ جاہ اس کا مُدعا نہ ہو۔ وہ بحیثیت ایک فرد کے یکتائے روزگار ہو لیکن ملّی سربلندی اس کا مطمحِ نظر ہو۔ وہ مشتِ غبار سے ایک تنِ سنگین پیدا کرے۔ اور اپنی انفرادیت کو ربطِ ملّت میں کھو دے۔ اس میں وہ کس بل ہو کہ جھجک اس سے کوسوں دُور اور تذبذب اس سے گریزاں رہے۔ وہ فاتحِ سندھ سا جواں ہمت ہو تو جرأت و شجاعت میں سیف اللہ۔ تدبّر میں عمر فاروقؓ ہو۔ تو استغنا میں عمر بن عبدالعزیز۔ اس کا عملِ پیہم اس کی کامرانی کا ذریعہ ہو تو اس کا یقینِ محکم اس کے حصولِ مقصد کا ضامن۔ زمانہ اس سے مساعدت نہ کرے تو وہ اسے دعوتِ مبارزت دے۔ خارِ راہ اور منزل کی صعوبتیں اس کے سمندِ شوق کے لئے مہمیز کا کام دیں۔ وہ فرزانۂ دہر ہو اور اس کی عالی حوصلگی دوسروں کے لئے مشعلِ راہ بنے۔ وہ کمزوروں اور اپنوں کا سہارا ہو تو طاغوتی قوّتوں کے لئے شمشیرِ برّاں۔ دوستوں کے لئے سراپا حلم ہو تو اغیار کے لئے مجسّمۂ قہاریت۔ اِن صفات کی تخلیق ناممکن ہو گی اگر دینی و اخلاقی تربیت کے پہلو بہ پہلو ہم اپنی نئی پود کی جسمانی نشو و نما کو ایک بلند معیار پر نہ لے جائیں۔ تن ہائے سنگیں ہی عزمِ آہنی کے حامل ہو سکتے ہیں۔ قیامِ پاکستان نے ہماری تعلیمی قدروں کو یکسر بدل دیا ہے۔ بدلے اور بدلتے ہوئے حالات شدّت سے اس امر کے متقاضی ہیں کہ ہم اپنے جسمانی تربیت کے پروگرام کو فی الفور اس نہج پر ترتیب دیں کہ ہم میں دفاعِ ملک کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اِس قسم کے لائحۂ عمل کی ترتیب جس سے ہماری جملہ دفاعی ضروریات تکمیل پذیر ہو سکیں۔ نہ محض وقت کی محتاج ہے بلکہ صرفِ کثیر کی بھی۔ لیکن ہماری نوزائیدہ مملکت کے گوناگوں مسائل متقاضی ہیں کہ ہماری منصوبہ بندیاں ہماری ضروریات کی کفیل تو ہوں لیکن ہماری مالی مشکلات میں اضافہ نہ کریں۔ اِسی خیال کے پیشِ نظر ایک ایسا منصوبہ پیش کرنا چاہتا

ہوں جو ہماری پیش پا افتادہ ضروریات کے تقاضے کو بلا مزید صرف کے کافی حد تک
پورا کر دے۔

ہمیں چاہیئے کہ عسکری تربیت کو سکولوں اور کالجوں کے نصاب میں ایک ممتاز
جگہ دیں۔ فوجی ڈرل۔ فوری طبّی امداد۔ سکاؤٹنگ۔ ہوائی حملوں سے بچاؤ کی تدابیر اور
استعمالِ اسلحہ کا اجراء بالالتزام ہو جائے۔ طالبات کی عسکری تربیت میں بالخصوص
فوری طبّی امداد اور نرسنگ کا شمول ضروری ہے۔ اس سکیم کے فوری نفاذ کی راہ میں صحیح
قسم کے پی۔ ٹی اساتذہ کا فقدان سب سے سنگین رکاوٹ ہے۔ لاکھوں طالب علموں اور
ہزاروں طالبات کی عسکری و جسمانی تربیت کی ذمہ داری کا بوجھ موجودہ پی۔ ٹی سٹاف پر
نہیں ڈالا جا سکتا۔ تا وقتیکہ اُنہیں خود اس قسم کی تربیت سے استفادہ کرنے کے مواقع
بہم نہ پہنچ جائیں۔

اگر ہم اس لائحۂ عمل پر گامزن ہونے کا فیصلہ کر لیں تو اس سرزمین میں ہمارا
پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ اساتذہ کی تربیت سے متعلق اداروں میں ایسے پی۔ ٹی اساتذہ
کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ جو عسکری تربیت سے آراستہ ہو چکے ہوں۔ تاکہ زیرِ تربیت
اساتذہ کو فوراً فوجی ڈرل و استعمالِ اسلحہ کی مشق کروائی جا سکے۔ اعلیٰ پی۔ ٹی سٹاف
کی محکمہ میں اِس وقت قلّت ہے۔ اور ایسی متعدد اسامیاں خالی پڑی ہیں۔ اس لئے
نئے اساتذہ کا تقرر کسی مزید بار کا باعث نہ بنے گا۔

اِس اقدام سے موجودہ تربیت گاہوں کے تمام زیرِ تربیت اساتذہ پی۔ ٹی کے علاوہ
فوجی ڈرل سیکھ لیں گے۔ ٹریننگ کالج سے فارغ التحصیل ہونے والے اساتذہ جس
فوقانی یا وسطانی درسگاہ میں تعلیم و تعلّم کی خدمت پر مامور ہوں گے۔ وہاں وہ عسکری تربیت
کے سلسلہ میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دے سکیں گے۔

اِسی طرح اگر تمام زیرِ تربیت جے۔ وی و ایس۔ وی اساتذہ پی۔ ٹی کے علاوہ

جوان کے نصاب میں شامل ہے۔ فوجی ڈرل میں مہارت حاصل کرلیں تو وہ اپنے اپنے مقامات پر مراکزِ تحفظ قائم کرسکتے ہیں۔ اگر اساتذہ سے متعلق تمام تربیت گاہوں میں صحیح قسم کے پی۔ ٹی اساتذہ کا تقرر بلا کسی تاخیر کے عمل میں لایا جاسکے اور موجودہ زیرِ تربیت اساتذہ کے معیارِ ٹریننگ میں چند ہفتوں کا اضافہ کردیا جائے۔ تو نئے مالی سال سے ایک ہزار کے لگ بھگ نئے اساتذہ اپنی اپنی جگہوں پر عسکری تربیت کا کام شروع کرسکیں گے۔ کالجوں کے پی۔ ٹی اور ضلعوں کے وہ نائب مہتمم جن کا تعلق جسمانی تربیت کی نگرانی سے ہے فی الفور کسی چھاؤنی میں بھیج دئے جائیں۔ جہاں وہ تین چار ماہ میں عسکری تربیت حاصل کریں۔ حصولِ تربیت کے بعد کالجوں کے پی۔ ٹی ہمارے نوجوان طلبہ کی عسکری تربیت سے متعلق ذمہ داریوں کو بوجہِ احسن سرانجام دے سکیں گے جبکہ نائب مہتمم حضرات ان دیہاتی مراکزِ تحفظ کی نگرانی کرسکیں گے۔ جو متعدد جے۔ وی اور ایس۔ وی اساتذہ کی کوششوں سے عالمِ وجود میں آئیں گے۔

اسی اثنا میں ہائی سکولوں میں کام کرنے والے پی۔ ٹی اساتذہ کی عسکری تربیت کے لئے مناسب مقامات پر متعدد مراکز جاری کئے جائیں۔ اور کم و بیش چھ ماہ میں انہیں اس قابل بنادیا جائے کہ وہ اِس ملّی و مُلکی خدمت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوسکیں۔ اور اپنی اپنی درسگاہوں میں عسکری تربیت کا کام شروع کردیں۔ کالجوں اور ضلعوں کے پی۔ ٹی سٹاف کو تھوڑی سی مدد اگر فوجی سٹاف سے مل جائے تو وہ ہر ضلع یا تحصیل میں ایسے مراکز کھول سکیں گے جہاں مڈل سکولوں یا اچھے ابتدائی سکولوں کے جواں سال اساتذہ کو تربیت دی جاسکے۔ تاکہ یہ لوگ بھی اپنے حلقہائے اثر میں اس ملّی پروگرام پر عمل پیرا ہوسکیں۔

عسکری تربیت سے باقاعدہ استفادہ کرچکنے کے بعد ہائی سکولوں کا پی۔ ٹی سٹاف ان اساتذہ کے تعاون سے جو ٹریننگ کالج سے ہی تربیت حاصل کرکے

آئے ہوں گے۔ اُٹھنے والی پَود میں صحیح عسکری سپرٹ پیدا کر سکے گا۔ ہائی سکول بالعموم قصبوں یا کافی بڑے دیہاتوں میں پائے جاتے ہیں۔ جب ایسے مراکز میں کسی عسکری تربیت کے مظاہرے منظرِ عام پر آئیں گے۔ تو عوام پر اس کا بڑا خوشگوار اثر پڑے گا۔ اور ان علاقوں کے نوجوانوں میں بالخصوص اور دیگر افراد میں بالعموم ایک خاص قسم کا جذبہ بیدار ہوگا۔ اور لوگ رضاکارانہ انداز میں جوق در جوق عسکری تربیت کے لئے میدان میں نکل آئیں گے جو بذاتہ ایک مستحسن نتیجہ ہوگا۔

تربیت یافتہ نائب ناظر مدارس بشمول سینیئر پی۔ ٹی سٹاف متعلقہ کالج اپنے مخصوص حلقوں میں نگرانی کے فرائض پر مامور کئے جا سکتے ہیں۔ اگر وہ گاہے ماہے دیہاتی و قصباتی مراکز میں کام کرنے والے اساتذہ کی امداد و اعانت کے لئے دیہات کا دورہ کریں تو اس سے معتدبہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ جب اِس قسم کے مراکز متعدد مقامات پر مصروفِ عمل ہوں گے تو اسلحہ کی بہم رسانی اور اس کے استعمال کے بارے میں حکومت کو کوئی انتظام کرنا پڑے گا۔ دَورانِ تربیت میں طلبہ و عوام لکڑی کی رائفلیں استعمال میں لا سکتے ہیں۔ جب وہ ڈرل میں طاق ہو جائیں ۔ اور اصل رائفل کا استعمال سیکھنے کی منزل آ پہنچے تو ایک اعلےٰ آفیسر رائفلیں۔ بم اور اسی قبیل کے اسلحہ سے لیس ہو کر اس مرکز میں پہنچ جائے گا۔ اور عسکری تربیت کی تکمیل اس کی زیرِ نگرانی عمل میں آئے گی۔ محکمۂ تعلقاتِ عامہ کی لاریاں اس مقصد کے لئے استعمال کی جا سکتی ہیں۔ ایسے فوجی افسر کا کسی مرکز میں قیام خواہ کتنے ہی قلیل عرصہ کے لئے کیوں نہ ہو نہایت خوشگوار نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوگا۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں وہ خاکہ جس میں یہاں وہاں تھوڑی بہت تبدیلیوں اور رنگ آفرینیوں سے ہم ایک خاصا اچھا مرقع تیار کر سکتے ہیں۔ جو بلا ایسے مصارف کے جن کے ہم متحمل نہ ہو سکیں۔ ہماری فوری اور وقتی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے

خدائے مسبب الاسباب ہمیں توفیق دے۔ سازگار فضا پیدا ہو۔ حالات مساعدت کریں۔ تو ہم کسی ایسی جامع سکیم کو زیر عمل لا سکتے ہیں جو ہماری تمام قومی اور دفاعی ضروریات کی حامل ہو۔ اور پاکستان کے شہریوں میں وہ کس بل پیدا کرے جس سے نہ صرف عدوئے بد نہاد پر لرزہ طاری ہو۔ بلکہ خیر سگالانِ مُلک و مِلّت کے لئے قوّت و توانائی بنے ؛

اسلامی دور میں معلّم کے آداب و فرائض

سلیم فارانی

غلامانہ پددو ماند کا سب سے بڑا غضب جو ہم پر ہؤا یہ تھا کہ عربی زبان سے ہمیں عملاً تنفر پیدا ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہؤا۔ کہ ہم اپنی ثقافت، کلچر، تہذیب و تمدن اور شاندار قومی روایات و حقائق سے مطلق نا آشنا رہ گئے۔ کیونکہ ان تمام چیزوں کے معلومات کے ماخذ سب عربی زبان میں تھے۔ یورپ کی تقلید نے ہمیں مذہب سے تو متنفر کر ہی دیا تھا، لیکن ساتھ ساتھ جو ہماری جڑیں کاٹنے کو بڑے ظلم کی بات ہوئی۔ یہ بھی کہ ہمارے دل و دماغ میں یہ غلط چیز سما گئی۔ کہ جو کچھ عربی میں لکھا ہوتا ہے۔ وہ صرف ہمارے مُلّائے دین کے محدود حلقے کی بے ہنگم باتیں ہیں۔ اور کچھ نہیں۔

اسلامی تہذیب و تمدن اور ثقافت کے اس بڑے تاریخی دفتر کے اوراق جو عربی میں ہیں۔ پلٹ کر دیکھیں تو آپ تعجب سے پکار اُٹھیں گے۔ کہ ہیں، ہم آج جو اپنے آپ کو مغربی اقوام سے بہت پیچھے دیکھتے ہیں۔ صدیوں پہلے موجودہ مغرب سے بھی بہت سی باتوں میں بہت آگے تھے۔ ہماری ثقافت میں کیا کچھ نہ تھا۔ کہ ہم

گداگری پر مجبور ہوئے، ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہمیں نابینا و محتاج کر دیا
گیا ۔ کہ دوسرے کے سہارے بغیر چل نہ سکیں۔ "خود ناشناس" رہے ہیں
تو در در کی ٹھوکریں نصیب ہوتی ہیں، ہائے افسوس کہ ہم کم از کم اتنے خود شناس
تو ہوتے۔ کہ ہمیں احساس ہوتا۔ کہ ہماری آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ لیکن قوم غالب
کی جادوگری اور اپنی ذلیل عقیدت اور غلامانہ جاہ پسندی کچھ اس انتہا تک پہنچ چکی
تھی، کہ یہ احساس تک بھی نہ ہو سکا۔

یہ بات بھی کلیتہً قابلِ تسلیم نہیں کہ ہر کام کے لئے حکومت ہی کی امداد چاہیئے
یا جو کام ہوتے ہیں حکومت ہی کے التفات سے ہوتے ہیں، اس میں سے غلو اور مبالغے
کی بُو آتی ہے۔ کام تو کام کرنے والے کی نیت سے زیادہ وابستہ ہے بہ نسبت حکومت
کے التفات سے متعلق ہونے کے۔ حکیم بو علی سینا کی جان حکومت کی طرف سے مسلسل
خطرے میں رہی۔ لیکن انہی خطرات کے زمانے کا نتیجہ کیا تھا۔ اس کی معرکۃ الآراء تصنیف
"القانون" جس کا ایک ایک فقرہ جدید ترین ترقی یافتہ یورپ کے سینے میں بھی گڑ کے
رہ گیا ہے۔ اور مغرب و مشرق کا ہر حکیم انگشت بدنداں ہے۔

کام کے لئے توانائی طبیعت چاہیئے، ولولہ و شوق پیہم کی ضرورت ہے۔ نہ کہ
التفات و داد کی۔ جزا کی خاطر کام پورے انہماک سے نہیں ہو سکتا۔ اور تو اور عبادت
میں بھی کچھ جزا کا خیال آ جائے۔ تو خلل پڑ جاتا ہے ؎

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے (اقبال)

جزا تو بے عملوں کو عمل کی طرف راغب کرنے کی چیز ہے۔ صحیح عامل
کے نزدیک عمل کی زیادہ اہمیت ہوتی ہے بہ نسبت جزا کے۔

قیام پاکستان کے بعد اب ہماری آنکھوں سے پٹی ہٹنی چاہیئے، اور ہمیں

پنی ثقافت سے آشنا ہونے کی کوشش کرنی چاہیئے اور کوشش بھی ایسی
ہ جو مانیائی قسم کی ہو۔ جزائی احتیاج کے ماتحت نہ ہو۔

ہم اب دورِ اصلاح سے گذر رہے ہیں۔ اور ہمیں اپنے تمام نقائص
ی اصلاح اصلاحِ تعلیم میں نظر آ رہی ہے۔ مغرب کی نقالی اور فرمائش کے
طابق ہم نے اصلاحی اقدامات میں مختلف پہلو بدلے۔ لیکن تعلیم کا حال وہی
رہا۔ ظاہریت باطنیت کے بغیر دیرپا نہیں ہوتی، نصاب کی اصلاح اور نظام
کی اصلاح تو اکثر و بیشتر مدِنظر رہی۔ اور اس پر خاص زور رہا۔ کہ استاد کو تربیت
دی جائے۔ جسے یہ نظام چلانا ہے۔ وہ ایک علمی و عملی سند کا حامل ہو۔ تب
مدرسے میں تدریس کا کام انجام دے۔ لیکن علم و عمل کی اس تربیت اور اصلاح نصاب
و نظام کے باوجود تعلیم کا جو حال رہا۔ اس سے کبھی اطمینان نصیب نہ ہوا۔ تاریخی
اوراق پلٹ کر اپنے شاندار ماضی کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسلامی دور میں تعلیم
سے کبھی بے اطمینانی نہیں ہوئی۔

اِسلامی دَور میں اساتذہ اور طلبہ دونوں میں خلوص تھا، ان کی نیت صرف علم
تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ انہیں اس علم سے وہ مفاد بھی پہنچتے تھے۔ جن کی خاطر اب
علم سکھایا جاتا ہے۔ موجودہ دَور کے اساتذہ اور طلبہ کی نیت اوّل تو اقتصادی بہبودی
کے سوا کچھ نہیں۔ اور اگر کوئی نیت اس کے علاوہ ہوتی بھی ہے۔ تو متغیر الحال۔ لیکن
"علم برائے علم" کبھی نیت نہیں رہی۔ متغیر الحال نیت تو کیا پوری ہوگی۔ علم جو نیت
میں شامل ہی نہیں رہتا۔ اس کا صحیح حصول تو ممکن ہی نہیں۔ جہاں تک غرض
پوری ہوئی وہاں تک کچھ علم آیا۔ اور جب تک غرض رہی وہ تھوڑا بہت علم ذہن میں مجبوراً
رہا۔ غرض پوری ہو جانے پر اس کا دماغ میں رہنا بے سود۔ ہزاروں کی تعداد میں
تعلیم یافتہ ایسے موجود ہیں۔ جنہوں نے صرف امتحانات پاس کرنے کی غرض سے مختلف

علوم پڑھے۔ لیکن امتحان میں کامیابی کے بعد ان کا شمہ تک اُن کے دماغ میں باقی نہ رہا۔

اِسلامی دَور میں اساتذہ کو اِس طرح کی ٹریننگ نہیں ملتی تھی، جو تعلیم و تربیت مغربی میں مروّج ہے۔ لیکن ان کے مقررہ اوصاف کچھ ایسے تھے۔ کہ نظام کتنا ہی بگڑا ہُوا ہو، تعلیم کو ٹھیس نہیں لگتی تھی، ہم اگر بنظرِ غائر دیکھیں۔ تو معلوم ہو کہ باوجود مختلف قسم کی اصلاحی کوشش کے ہماری تعلیمی بے اطمینانی کا باعث یہی ہے۔ کہ ہم اُس قسم کے اوصاف نہ اپنے اساتذہ میں پاتے ہیں۔ نہ اُن کی تخلیق کیلئے کوشاں ہوتے ہیں۔

اِسلامی دَور میں اساتذہ کا فرض تھا۔ کہ وہ چند امور و آداب کا خاص لحاظ رکھیں۔ اور اپنے اندر مقررہ اوصاف پیدا کریں۔ ورنہ وہ مسندِ اُستادی کے قابل نہیں رہتے تھے اُستاد نہیں بن سکتے تھے۔ ان آداب و اوصاف کو غزالی، ابن خلدون اور دیگر اسلامی علماء نے اپنی تصنیفات میں جو عربی میں ہیں مخصوص بابوں اور فصلوں میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ذرا ان اوصاف پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ ہمارے استادوں میں اگر یہ اوصاف موجود ہوں۔ تو ان کے طلبہ تعلیم و تربیت میں کس قدر نفیس نشو و نما حاصل کر سکتے ہیں۔ اور قومی مستقبل کی تعمیر کس قدر نفیس ہو سکتی ہے۔ ذیل میں یہ اوصاف بیان کئے جاتے ہیں۔ ہر ایک وصف کا ساتھ ساتھ جائزہ لیتے جائیے۔ اگر "شماریات" کی خاطر ملک بھر کے اساتذہ میں ان اوصاف کی تلاش کا استفسار یہ بھیجا جائے۔ تو شائد ہمیں ندامت ہو۔

۱۔ مذہب و اخلاق

سب سے پہلا اور بڑا اہم فرض ہر معلم کا خواہ وہ دینوی علوم کی تعلیم دیتا تھا یا دنیاوی کی۔ یہ تھا کہ وہ شریعت کا ہر طرح پابند ہو۔ اس کا کوئی عمل اسلامی شعائر و احکام سے گریزاں نہ ہو۔ کلام پاک کی روزانہ تلاوت اس کا شعار ہو۔ اور اس کلام کے

معانی ومطالب پر غور وخوض کرنا اور امر ونواہی، وعد و وعید کو سمجھنا اور سمجھاتے رہنا اس کا وظیرہ ہو۔ یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر اس کا اصول زندگی ہو۔ برائیوں سے روکے اور نیکیوں کی تلقین کرے۔ مصائب و شدائد کا صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کرے۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو۔ اس کے دماغ میں کافرانہ نخوت نہ ہو۔ بلکہ اسلامی تواضع ہو۔ سلام کا متوقع نہ ہو بلکہ خود سلام کرنے میں پیش دستی کرے۔ شریعت مطہرہ کی روشنی میں اپنے ذاتی اخلاق کو منوّر کرے۔ اور زندگی کو مجموعہ محاسن بنائے۔ غصّہ کو پینے کی عادت ڈالے۔ خیرات وصدقات کا عامل ہو۔ اپنے اثر و رسوخ سے غریبوں اور بیکسوں کو فائدہ پہنچانے پر آمادہ ہو۔ کسی سے سختی سے پیش نہ آئے۔ بلکہ مصائب میں دوسروں کا ہمدرد ہو۔ حریص نہ ہو بلکہ قانع ہو، باطن صاف رکھے۔ بدظنی کی طرف کبھی مائل نہ ہو۔ بلکہ ہمیشہ حُسنِ ظن سے کام لے۔ شرم وحیا کا مجسمہ ہو۔ بے حیا اور غیر شرعی رسوم واعمال میں منہمک نہ ہو۔ دل و دماغ میں جذبۂ اخلاص ویقین موجزن ہو۔ رذیل قسم کے اخلاق سے قطعی پرہیز کرے۔ بغض وحسد کو دل میں جگہ نہ دے۔ کینہ پرور نہ ہو۔ غرور وتکبر نہ کرے۔ غیبت وچغل خوری کو ایسا سمجھے جیسے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ ہمیشہ سچ بولے۔ کذب و افترا کی کمینہ عادات اس میں گھر نہ کرنے پائیں، زبان سے کوئی فحش یا فضول لفظ نہ نکالے۔ ہزل پسند نہ ہو۔ ٹھٹھے مخول سے پرہیز کرے۔ حقیقت پر نگاہ رکھے۔ اپنے باطن کا نگہبان ہو۔ نمود ونمائش کا دلدادہ نہ ہو۔ منافق نہ ہو، حق گو ہو، حق پسند ہو۔

بھلا جس استاد میں یہ خوبیاں ہوں وہ قوم کے لئے باعث ناز نہیں ہوگا تو کیا ہوگا اب ذرا اپنے دور کے مدارس کے اساتذہ پر نگاہ ڈالئے اور جائزہ لیجئے کہ مندرجہ بالا اوصاف میں وہ کس وصف کے حامل ہیں۔ شریعت کی پابندی کا تو سرے سے دعویٰ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کلام پاک کی تلاوت اور پھر اس کا سمجھنا تو ایک امر موہوم سا ہے۔ برائیوں سے روکنا اور نیکیوں کی تلقین کرنے کے فرائض کس طرح سرانجام پا سکیں۔ جب خود برائیوں میں

کامیابی اور نیکیوں میں نقصان کا اعتقاد ہو، مصائب و شدائد میں صبر و استقلال کی ضرور
ہی محسوس نہیں ہوتی جب ہنگامہ خیزی اور بے راہ روی کی راہیں کھلی ہوں۔ اِسلا
تواضع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب عہدہ و مراتب، رعب و جلال کا قیام ہی کافرانہ نخو
پر ہو۔ اس نخوت کی خاطر سلام ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ سے نہ خریدا جائے۔ تو کیا ہو۔ خ
و صدقات تو تب ہوں، جب خود دست احتیاج دراز نہ ہو۔ قناعت کس طرح نصیب ہو
سارا جہاں بڑھتا ہُوا نظر آئے۔ کذب و افترا، حسد و بغض تو کامیابی اور خود افزائی ۔
ضروری عناصر ٹھہرے۔ ہزل و استہزا زندگی کا اہم عنصر قرار دیا جاتا ہے فحش الفاظ کے ل
اطاعتِ تلامذہ کی حصول کی کوئی صورت ہی نہیں۔ ایسی حالت میں بھلا تعلیم سے ہم او
نتیجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ اسی قسم کے قومی افراد پیدا ہوں جو چغل خوریاں ک
دھوکے دیں، بُرائیوں کو اُچھالیں۔ نیکیوں کی تضحیک و تحقیر کریں۔ تشدد کو روا رکھ
نخوت و تکبر سے کام لے کر ماتحتوں کا خون چوسیں۔ حریص جاہ و دولت رہیں۔ اور آخر
تک ان کا طماع شکم سیر نہ ہو۔ بلکہ وہ دستِ احتیاج برائے اہل من مزید پھیلائے
اور رشوتیں لیتے رہیں۔ ہزل و فحاشی سے جی بہلائیں۔ نمود و نمائش سے اپنا و
قائم رکھیں۔ بغض و حسد کو نوازیں اور حق گوئی کو دبائیں اور کچلیں۔ اسلامی دَور کے ا
کے فریضۂ اوّل کی پابندی ہمارے موجودہ معاشرے اور تعلیم کی ان تمام قباحتوں کو دُو
میں اکسیر کا کام دے سکتی ہے۔

۲۔ احترام

پابندی شریعت و اخلاق حسنہ کے بعد اسلامی دَور کے اساتذہ پر جو چیز فر
وہ احترامِ علم تھا۔ ان کا فرض تھا۔ کہ علم کا احترام کریں۔ اور خود اپنے آپ کو بھی محترم بنا
اور اس قسم کی تمام چیزوں سے گریز کریں۔ جن سے علم کے وقار کو کسی قسم کی ٹھیس لگے
اپنی صورت، وضع قطع، رہن سہن، طرز بود و ماند، سلیقہ، سلوک، معاشرت اور لیا

اس قسم کا رکھیں۔ کہ اس سے علم کا جلال ظاہر ہو۔ نہ کہ علم کی توہین یا تضحیک ہو۔ چنانچہ اس احترام میں انہیں یہاں تک پابند ہونا پڑتا تھا۔ کہ کسی مجبوری یا مصلحت کے سوا کسی معلم کا کسی طالب علم کے گھر پر جا کر تعلیم دینا علم کے لئے کسرِ شان سمجھا جاتا تھا (اس میں مصلحت کی بنا پر خلفا کی اولاد اکثر مستثنےٰ رہی ہے۔) علم کی شان اس قدر بلند سمجھی جاتی تھی کہ اس کے طالب کے لئے اس کے آستان تک پہنچنا ضروری تھا۔ نہ یہ کہ اس قدر رفیع چیز اپنے طالب کے در پر پہنچے۔ چنانچہ امام زہری کا قول ہے۔ کہ یہ علم کی تذلیل ہے۔ کہ اسے اس کے طالب کے گھر خواہ وہ کتنا ہی عالی مرتبہ اور ذی دولت و وسعت کیوں نہ ہو۔ پہنچایا جائے۔ زرنوجی کے رسالہ تعلیم المتعلم سے پتہ چلتا ہے کہ اس احتیاج و تذلیل سے معلمی کو محفوظ کرنے کی خاطر اسلامی دَور کے دستورِ تعلیم میں معلمی کے لئے دینوی نام و نمود و عزت و جاہ کو مقصد قرار دینا گویا بدترین اخلاقی جرم قرار دیا جاتا تھا۔ امام شافعی تو نام و نمود سے اس حد تک گریزاں تھے۔ کہ فرماتے تھے۔ میری خواہش ہے کہ اہلِ عالم مجھ سے اس طرح علم حاصل کریں کہ ایک حرف بھی مجھ سے منسوب نہ ہو۔ اس احترام و وقار کو قائم رکھنے کی خاطر اساتذہ کے لئے بعض پیشے اختیار کرنا بھی ممنوع قرار دئے گئے تھے۔ مثلاً حجام، رنگ ساز، دبّاغ اور صراف وغیرہ ہونا معلمی کے لئے بدنما داغ تھا۔ ان پیشوں سے دُور رکھنے کی وجہ یہ تھی۔ کہ یہ پیشے عوام کی نظروں میں کم پایہ تھے۔ جو چیز عوام کی نظروں میں پہلے حقیر ہو۔ اُس قسم کے پیشے والے انسان کی قدر و منزلت کا قیام دشوار ہے۔ چنانچہ اس قدر احتیاط منظور تھی، کہ کسی نسبت سے علم یا عالم کم پایہ و حقیر نہ سمجھا جائے اسی مقصد کے پیش نظر یہ بھی ہدایت تھی۔ کہ معلم ایسے حالات سے بھی گریز کرے کہ اس کے متعلق کسی قسم کی بدگمانی یا تہمت کا موقع کسی کو میسّر آئے۔ متانت و سنجیدگی کو بہت ضروری قرار دیا جاتا تھا۔ اور معلم کے لئے ہر اس چیز سے پرہیز ضروری تھی۔ جس سے اس کی متانت میں فرق آئے۔ متانت کے اثر سے معلم کی موجودگی میں کوئی بے جا بات

نہیں ہوسکتی۔ امام مالک کے متعلق مشہور ہے کہ ان کی مجلس میں ان کی متانت و وقار کا اتنا اثر تھا۔ کہ ذرا سا شور نہیں ہوسکتا تھا۔ اور کوئی بے جا آواز بلند نہیں ہوسکتی تھی
ذرا ان ضوابط پر نگاہ ڈالئے اور پھر اپنے زمانہ کے معلموں کی حالت پر غور کیجے زمین و آسمان دگرگوں نظر آتا ہے۔ احترام علم تو شاید ہی کہیں قائم ہو۔ البتہ علم کی توہین و تضحیک کے مناظر تو بہت نظر آئیں گے۔ ٹیوشنوں کا بے پناہ سلسلہ اور اس کے اسباب و مقاصد کا جائزہ لیجے۔ تو تعلیم اچھی خاصی بنئے کی دکان نظر آتی ہے۔ گو بے توجہ اور ناقدر شناس طالب علم کو ٹکے سیر نام نہاد علم گھر پہنچ جاتا ہے۔ اور معلم

وہ دن گئے کہ خدمت استاد کے عوض ؛ جی چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق ؛ کہتا ہے ماسٹر سے بل پیش کیجے

کے مصداق کے مطابق اچھا خاصا ہوٹل کا انچارج یا دبّاغ و حجام سے بھی گیا گذرا ایک چھابڑی والے کے درجہ کے لگ بھگ ہستی معلوم ہوتا ہے۔ وقار کے قیام کی خاطر مواقع تہمت سے پرہیز کرنا الگ رہا۔ کتنے ہیں۔ جو تہمتوں سے محفوظ ہیں۔ یا ان کی پروا کرتے ہیں۔ متانت تو بہت دور کی چیز ہے۔ جہاں لغوگوئی، بڑیں ہانکنا اور ہزل مذاق شعار ہو جائے۔ اور اس کا نام آزاد منشی رکھا جائے۔ تو وہاں علم کے صحیح اقتدار کی تلاش کس طرح ہوسکتی ہے؟

۳۔ توسیع و تبلیغ علم

تیسری چیز جو اسلامی دور کے اساتذہ پر فرض قرار دی گئی تھی۔ وہ توسیع تبلیغ علم تھی، ان پر واجب تھا کہ مسلسل مطالعہ سے اپنے علم و معلومات میں اضافہ کرتے رہیں۔ اور پھر تصنیف و تالیف کے ذریعے اس علم کی تبلیغ و توسیع کرتے رہیں ان کے نزدیک عالِم اسی وقت تک عالِم تصوّر کیا جا سکتا تھا جب تک کہ وہ طلب علم میں کوشاں ہے۔ مطالعہ نہ کرنے والا ان کے نزدیک جاہل تھا۔ پڑھنا ترک کر دینا

لینا کہ جو کچھ علم حاصل ہو چکا ہے کافی ہے اور اب مطلقاً بے نیازی حاصل ہو چکی
جہالت کے مترادف تھا۔ توسیع علم کی خاطر علمائے اسلام نے اپنی کوششیں جاری
ں۔ اور وہ اس بات کو باعث حقارت نہیں سمجھتے تھے۔ کہ اپنے سے کم تر درجہ کے
ں یا کم عمر لوگوں سے علمی فائدہ اٹھائیں۔ وہ اس استفادہ کے لئے بیتاب رہتے تھے
ہر اس ہستی کی قدر کرتے تھے جس سے انہیں اس قسم کا استفادہ ہو۔ توسیع علم کی
اور امتحان علم کے لئے ان میں مذاکرہ و مناظرہ کا خوب رواج تھا۔ مذاکرہ و مناظرہ میں
رح سے عہدہ برآئی استاد پر فرض تھی۔ ورنہ اس کی خفت ہوتی۔ تصنیف و
یف کا فرض جو اساتذہ پر عائد تھا۔ اس کے چند لوازمات بھی تھے۔ جن کا پورا کرنا
ری تھا۔ تصنیف و تالیف کی استعداد، حقائق کی تفتیش اور اس کی خاطر
یع مطالعہ، غور و فکر کی عادت، قوت انشا، بحث و تکرار، توجہ و خلوت اور
ائل و مباحث کا پورا علم۔ ظاہر ہے کہ تصنیف و تالیف کے فرض کو نباہنے کے
ان لوازمات کی تکمیل معلم کو کس پائے کا محقق بنا دیتی ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس
ر کے تقریباً ہر مصنف کی تصنیف سے آج کے اربابِ علم انگشت بدندان ہیں۔ تصنیفی
ستعداد کی انتہا کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کئی کئی اساتذہ نے کئی کئی سو رسائل
تب تصنیف کر ڈالیں۔ اور ہر ایک کتاب و تصنیف معتبر درجہ حاصل کر گئی۔
رِ حاضر کے معلمین کا ذرا اِس نقطۂ نگاہ سے بھی جائزہ لیجئے، جلبِ زر کی خاطر
اصوں اور معمولی درسی انتخابوں کے مصنف تو شائد ان میں اکثر نظر آئیں لیکن
یقی و تدقیقی علمی تصانیف خال خال نظر آئیں گی۔ اور وہ بھی یہ کہ اگر ایک دو تصنیفیں
ی کی جا چکی ہیں۔ تو گویا علامۃ العصر اور فہامۃ الدہر ہو گئے۔ اب ان کے پائے کا کوئی
دی نہیں۔ اساتذہ اس کام کو فرض نہیں سمجھے۔ ورنہ شائد موجودہ دور میں لائبریریوں
ے اعلیٰ انتظامات کے باوجود اساتذہ کی طرف سے علمی کتب کی پیداوار میں قحط نظر

نہ آتا۔ اور شائد یہ بھی وجہ ہو کہ اب معلّمی کی شرائط میں یہ چیز داخل نہیں جس زمانے میں معلّمی کی شرائط میں تصنیف وتالیف شامل تھی۔ اس زمانے میں شائد آج کی طرح دنیا کے باقی تمام کاموں کا واماندہ معلّمی کے پیشہ کو اختیار کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بلکہ اس میدان میں دل وگردے والے ہی اُترتے ہوں گے۔ آج کل معلّمی آسان ترین کام ہے۔ اور تصنیف وتالیف اس سے بھی آسان تر۔ کیونکہ ان میں سطحی معلومات کی ضرورت ہے۔ دقت نظر کی نہیں۔ انتخابات واقتباسات کو جمع کر کے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اختراع کی نہیں۔ پُرانے خیالات کو نیا جامہ پہنا دینا ہی اُپج اور جدّت ہے۔ لیکن باوجود اس کے بہت کم معلّم ہی مصنّف نظر آتے ہیں۔

۴۔ پابندیٔ اوقات

چوتھی چیز جو اساتذہ پر لازم تھی وہ یہ تھی۔ کہ اپنا ایک باقاعدہ لائحۂ عمل تیار کر کے انتہائی خلوص وپابندی کے ساتھ اسے نباہتے رہیں۔ اور اس لائحۂ عمل کے سلسلے میں اِتنے محتاط رہیں۔ کہ کوئی سلسلہ منقطع نہ ہونے پائے۔ پابندی شرع میں بھی خلل نہ آئے۔ صوم وصلوٰۃ باقاعدہ ادا ہوتے رہیں۔ پڑھنے پڑھانے میں بھی باقاعدگی رہے۔ تصنیف وتالیف کا کام بھی نہ رُکے۔ اور غور وخوض، فکر وتدبر کے لئے بھی لمحاتِ فرصت میسّر آتے رہیں۔ اور کسی ایسی قسم کی مصروفیتیں اختیار نہ کریں۔ جن سے اس لائحۂ عمل میں نقص آئے۔ چنانچہ خورد ونوش، خواب واستراحت اور غیر علمی مشاغل میں وہ بہت ہی کم وقت صرف کرتے تھے۔ امام شافعی کے متعلق مشہور ہے۔ کہ انہیں دن کے وقت کھاتے اور رات کے وقت سوتے ہوئے کم دیکھا جاتا تھا۔ ان کا زیادہ وقت تصنیف میں صرف ہوتا تھا۔ امام محمد بن حسن رات کا زیادہ حصّہ جاگتے۔ پانی کا پیالہ بھر کر رکھ لیتے۔ نیند آنے لگتی تو مُنہ پر چھینٹے مارتے۔ اور

سائل حل کرتے رہتے اور کہتے کہ "یہ لذتیں شاہزادوں کو کہاں نصیب ہیں"۔ آج کل
علیم کے علاوہ علمی مشاغل تو برکنار خود تعلیم کے وقت کی پابندی بھی اساتذہ پر بار
ی معلوم ہوتی ہے۔ البتہ خورد و نوش اور غیر علمی مشاغل کے لئے اوقات کا بیشتر
حصّہ صرف کرنے میں کسی کو دریغ نہیں ہوتا۔

۵۔ خلوص

پانچویں چیز جس پر زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ وہ خلوص تھا، پڑھنے پڑھانے
میں اور تصانیف میں۔ استاد پر فرض تھا۔ کہ جو کچھ پڑھائے نیک نیتی سے
پڑھائے یعنی موضوع تعلیم پر خود پوری طرح سے پہلے بذریعہ مطالعہ حاوی
ہو جائے۔ تاکہ اس کا کوئی حصّہ تشنۂ تکمیل نہ رہے۔ پھر مکمل علم خلوص
کے ساتھ طلبہ تک وضاحت سے پہنچائے اور کوئی چیز اس موضوع کے
سلسلے میں بخل یا تکبر کی بنا پر طلبہ سے مخفی نہ رکھے۔ بلکہ سب کچھ ان تک
پہنچا دے۔ اور بخل و تکبر کی بدعادات کا مرتکب نہ ہو۔ تصنیف و تالیف میں بھی
خلوص سے کام لے۔ ایسے موضوع پر قلم اُٹھائے۔ جس پر خود پوری طرح حاوی
ہو۔ اور پھر خوب وضاحت کے ساتھ کسی چیز کو چھپائے بغیر خلوص کے ساتھ
لکھے بعض مختلف فیہ یا متنازع فیہ نکات کو مصلحتاً نظر انداز کرنا بُرا نہ تھا۔
لیکن کسی ضروری امر کو اس لئے چھپانا کہ اس کے لئے وہ صرف خود ہی آشنا
رہیں۔ ناجائز بلکہ گناہ قرار دیا جاتا تھا۔ یہ بھی اُستاد پر لازم تھا۔ کہ موضوع
پر پورے طور پر حاوی ہونے کی خاطر اسے مصائب برداشت کرنا پڑیں۔ اور
سفر کی زحمت اُٹھانی پڑے تو اس سے گریز نہ کرے۔

زمانِ حال میں تو تعلیم و تعلم میں اس قسم کا خلوص بہت کم پایا جاتا ہے
موضوع تعلیم پر حاوی ہونا اور بذریعہ مطالعہ اس کے تمام نکات سے آشنا

ہونا تو درکنار اس موضوع کا سطحی علم بھی کم ہوتا ہے۔ اور اسی سطحی علم کو لفاظی کے ساتھ طلبہ کے اذہان پر اس طرح ٹھونسا جاتا ہے۔ کہ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ یا اگر کچھ پلّے پڑے تو یہ کہ ع جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی۔ کسی موضوع کے متعلق اول تو مکمل علم دینا ہی ممکن نہیں۔ کیونکہ خود استاد کو مکمل علم پر یقین نہیں۔ یا وہ اپنے "مکمل علم" کی حقیقت سے آشنا ہے لیکن اگر کہیں واقعی مکمل علم ہو بھی سہی۔ تو سب کچھ بتا دینا گویا کشتی کے سب داؤ پیچ حریف کو بتا دینا ہے۔

۶۔ طلبہ سے شفقت

اساتذہ پر سب سے اہم فرض جو تعلیم کے خاص فرائض میں سے ہے یہ تھا کہ وہ طلبہ سے مشفقانہ سلوک رکھیں۔ استاد کی حیثیت روحانی باپ کی سی تھی۔ اور اس کا تعلق طلبہ سے شفقت و محبت کا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں۔ کہ طلبہ کو ہر طرح کی آزادی تھی۔ اور انہیں غلط شعاری پر کسی قسم کی تنبیہ نہیں ہوتی تھی۔ نہیں بلکہ استاد مشفق باپ کا سا سلوک کرتا تھا۔ جہاں تنبیہ کی ضرورت ہوتی تھی۔ مناسب طریق پر تنبیہ بھی کرتا تھا۔ لیکن یہ تنبیہ اکثر اوقات اشاروں اور کنایوں سے ہوتی۔ جب زیادہ وضاحت کی ضرورت ہوتی۔ تو صریح الفاظ میں تنبیہ کی جاتی۔ استاد کا فرض تھا۔ کہ طلبہ کے اخلاق کی کڑی نگرانی کریں۔ اور طلبہ کے لیئے اخلاق سکھانے کا سب سے بہتر طریق یہی تھا۔ کہ استاد اخلاق کا بہتر نمونہ تھا۔ اس کی ساری زندگی حُسنِ اخلاق کے سانچے میں ڈھلی تھی۔ اس لئے ہر کام میں استاد کا طرزِ عمل طلبہ کی ہدایت کرتا جاتا۔ کسی طالب علم کا حلقہ درس سے غیر حاضر ہو جانا استاد کے لئے باعثِ تشویش ہوتا۔ اس کا فرض ہوتا۔ کہ اس کی غیر حاضری کا صحیح سبب معلوم کرے۔ بیمار ہو تو اس کی عیادت کو جائے۔ کوئی عزیز فوت

ہوگیا ہو۔ تو تعزیت کو جائے۔ اور اگر کسی اور قسم کا حادثہ ہوا ہے تو مناسب طور پر ہمدردی کا اقدام کرے۔

استاد کا یہ بھی فرض تھا کہ طالب علم کی تمام قسم کی ضرورتوں کا خیال رکھے۔ اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کی امداد کرے۔ اور تمام قسم کے ایسے موانعات کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ جو طالب علم کی تعلیمی کوشش میں حائل ہوں۔ تاریخ میں بے شمار مثالیں ہیں۔ کہ طلبہ کے افلاس اور کس مپرسی کی حالت میں استادوں نے ان کی پوشیدہ مالی امداد بھی کی۔ اور پڑھایا بھی۔ اور اس سلسلے میں کسی قسم کا ڈھنڈورا اپنی سخاوت و استادی کا نہیں پیٹا۔

طلبہ پر سختی کرنا کسی طرح روا نہیں تھا۔ کیونکہ سختی کو تربیت کے لئے سخت مضر خیال کیا جاتا تھا۔ اور اس سے کاہلی، سستی، کُند ذہنی، اور سزا سے بچنے کی خاطر جھوٹ، نفاق اور مکر و فریب کی سی بدعادات پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ تادیب میں جبر و استبداد کا طریقہ ممنوع تھا۔ اور بقول امام غزالیؒ استاد کا فرض تھا۔ کہ طالب علم کو بداخلاقی سے اشاروں اور کنایوں سے ہر ممکن حد تک روکے۔ اور مہربانی کا طریق اختیار کرے۔ اور اس وقت تک تصریح سے کام نہ لے۔ جب تک کہ باقی تمام تدابیر بے اثر ثابت نہ ہوں۔ ڈانٹ ڈپٹ اور تصریح سے ہیبت جاتی رہتی ہے۔ اور مخالفت پر طبیعت آمادہ ہوتی ہے۔ مقصد تو یہ ہے کہ طالب علم میں حسن تربیت پیدا ہو۔ اس کے اخلاق سنوریں۔ اور اس کی حالت درست ہو۔ نہ یہ کہ مخالفت کی بنا پر وہ گندہ عادات کی طرف مائل ہو۔

استاد کی زبان پر غیر مہذب الفاظ سرزنش کے طور پر آنا جرم عظیم تھا۔ استاد کی ہیبت اور اس کا وقار اس بات کی مطلق اجازت نہیں دیتا تھا۔ کہ

اس کی زبان تہذیب کے معیار سے گرے۔ یا بُرے الفاظ اس سے نکلیں۔

اسلامی دَور کے اساتذہ کے یہ آداب و فرائض اگر زمانِ حال کے اساتذہ پر بھی عائد ہوں۔ اور وہ خلوص کے ساتھ ان کی پابندی کریں۔ تو ہماری تعلیم کے اکثر نقائص دُور ہو جائیں۔ اور طلبہ کی سیرتیں اخلاقی سانچوں میں ڈھلیں۔ لیکن غلامانہ دَور کی پیدا کردہ بھوک اور افلاس نے استاد کو اسقدر حریص پیسے کا بندہ اور کام چور بنادیا ہے۔ کہ ان آداب کے ذکر پر وہ صرف ہنس ہی دے گا۔ اور اگلے وقتوں کے ناقابلِ توجہ خیالات سے زیادہ اسے کچھ وقعت نہیں دے گا ؎

ضعف نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ورنہ حقیقت یہ ہے۔ کہ ان آداب و فرائض سے اسلامی مدارس کے اساتذہ کی وہ اخلاقی بلندی نظر آتی ہے۔ جس تک مغربی متمدن اقوام کے اساتذہ بھی کیا پہنچیں گے ؛

(ا)

اصطلاحات

111. Calendar.

نظام تقویم، تقویم، جنتری، سیاہ، رجسٹر، کھاتہ، فہرست، ترتیب، دستاویز۔

Calendar عام طور پر جن معنوں میں مستعمل ہے۔ اس لحاظ سے سیاہ، رجسٹر، کھاتہ، فہرست، ترتیب اور دستاویز سب غیر موزوں و غیر صحیح ہیں۔ جنتری بھی جچتا نہیں۔ کیونکہ یہ بھی کتابی صورت میں ایک مخصوص طرز کی نجومی بحث اور دیگر مروّج تفاصیل پر مشتمل چیز ہے۔ تقویم اور نظام تقویم بھی اسی قبیل سے ہے۔ .Calendar کے لئے ہمارے نزدیک "تاریخ نامہ" موزوں ہے۔ ہاں .University Calendar کے لئے جس میں یونیورسٹی کے قواعد و ضوابط، امتحانات اور دیگر تفاصیل متعلقہ جامعہ درج ہوتے ہیں۔ اس کے لئے البتہ "دستور العملِ جامعہ" یا "منشورِ جامعہ" موزوں ترجمے ہوں گے۔

112. Matriculation Examination.

داخلہ جامعہ، امتحان داخلہ، امتحانِ درِ جامعہ، امتحان بابِ جامعہ۔

.Matriculation کا صحیح مفہوم جامعہ یا کالج میں داخلہ ہے۔ اس مفہوم کے مدِنظر مندرجہ بالا ترجمے صحیح تو ہیں۔ لیکن اصطلاحی لحاظ سے کچھ جچتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ البتہ ان سب میں "امتحانِ بابِ جامعہ" قابلِ ترجیح معلوم ہوتا ہے۔

113 Middle School Examination.

بیچ کا امتحان، درمیانی امتحان، وسطی امتحان، مرکزی امتحان، متوسط امتحان، اوسط درجے کا امتحان، متوسط طبقے کا امتحان، وسطیٰ امتحان، مابینی امتحان، لفظی ترجمے کے لحاظ سے تو سب الفاظ مفہوم کے قریب ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا جچتا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ جسے اصطلاح کے طور پر اختیار کیا جائے۔ یوں تو کئی حضرات "مڈل اسکول امتحان" ہی اصطلاح کو مروّج رکھنے کے حق میں ہوں گے۔ لیکن کیا ضروری ہے کہ ہم امتحان کے تمام درجات و منازل کے نام مغربی طرز پر ہی رکھیں۔ کیا ہی اچھا ہو۔ کہ ہم Middle School Examination. کیلئے "وسطی مدرسی امتحان" یا "امتحانِ وسطیٰ" رائج کر سکیں۔

114. S.L.C. Examination.

اس کے لئے "مدرسہ چھوڑنے کا سندی امتحان" ہی موزوں ہے۔ لیکن اگر مڈل کے امتحان کے لئے ہم "وسطی مدرسی امتحان" جائز قرار دیں۔ تو S. L. C. Exam. کے لئے "انتہائی مدرسی امتحان" ہی موزوں ہوگا۔

115. Degree Examination.

امتحان درجی، امتحان درجاتی، واسطی امتحان، سندی امتحان، درجہ تفصیل۔

درجی اور درجاتی کچھ عجیب ترکیب کے حامل ہیں۔ واسطی بھی غیر صحیح ہے۔
سندی امتحان کے مقابلے میں "امتحان درجہ تفضیل" اچھا ہے۔ لیکن انتساب
موزونیت کے اعتبار سے ہم "امتحان فضیلت" کو ترجیح دیں گے۔

116. Schedule.

فہرست، گوشوارہ، فرد۔

فہرست اور فرد کے مقابلے میں گوشوارہ اچھا ہے۔ عام مستعمل بھی ہے
موزوں بھی۔

117. Affiliation.

الحاق، تعلق، انضمام، نسبت، رشتہ

تعلق، نسبت، اور رشتہ تو بہت غیر موزوں ہیں۔ "انضمام" دشوار پسند
بالغ کو شاید پسند آئے۔ لیکن عام کے بس کی چیز نہیں۔ "الحاق" affiliation.
کے مفہوم کو موزوں طور پر ادا کرتا ہے۔ عام مستعمل بھی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں۔
اس مروّج لفظ کی جگہ کوئی اور لفظ اختیار کیا جائے۔

118. Extension.

توسیع، وسعت، فراخی، گنجائش، پھیلاؤ، اضافہ، زائد حصہ، جامعیت۔
جامعیت کے علاوہ باقی تمام ترجمے مختلف محل استعمال کے لحاظ سے صحیح
ہیں۔ جامعیت البتہ غیر صحیح اور غیر موزوں ہے۔ جامع وہ چیز ہے۔ جو سب
پہلوؤں پر حاوی ہو۔ لیکن Extension سے مراد ایک چیز میں بڑھاؤ ہے اس
کے لئے لفظ "توسیع" ہی زیادہ موزوں ہے۔ اور ہر محل میں استعمال کیا جا سکتا
ہے۔ اور مندرجہ بالا تمام قسم کے معانی پر بھی حاوی ہے۔

119. Inspection

ملاحظہ، معائنہ، جانچ، نظارت،

ملاحظہ اور معائنہ عام مستعمل ہیں۔ جانچ اِن مستعمل الفاظ کے مقابلے میں کچھ بے لُطف سا ہے۔ اگرچہ بہت سے اصحاب اس کو رواج دینے میں کوشاں ہیں .Inspector کے لئے ہم نے "ناظر" کے لفظ کو ترجیح دی تھی۔ اس لحاظ سے "نظارت" بھی بظاہر موزوں نظر آسکتا ہے۔ لیکن .Inspection کے لئے چونکہ عام استعمال میں معائنہ کا لفظ آتا رہتا ہے۔ اِس لئے اِسے بدلنا موزوں نہیں۔ اور دوسرے اس کے مقابل نظارت کا لفظ دشوار ہے۔ .Inspection کے لئے معائنہ ہی قابل ترجیح ہے۔ نظارت کو اگر .inspectorate کے لئے مخصوص کردیا جائے۔ تو موزوں اور بہتر ہوگا۔

120. Rector.

ریکٹر ابتدا میں حلقے کے پادری کے لئے استعمال ہؤا۔ آکسفورڈ کے بعض کالجوں کے صدر کا لقب بھی ریکٹر رہا ہے۔ اور بعض مغربی ممالک میں ثانوی مدارس کے صدر مدرس کے لئے بھی ریکٹر کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ استعمال ہوہو کر کسی جامعہ یا مدرسے کے صدر کے لئے عام طور پر مخصوص ہوگیا۔ اس صورت میں ہم اس کی دو صورتیں قرار دیں گے۔ اگر یہ لفظ کسی جامعہ کے سلسلے میں مستعمل ہو۔ تو اس کا ترجمہ "شیخ جامعہ" موزوں رہے گا۔ اور اگر کسی مدرسہ کے سلسلے میں استعمال کیا جائے۔ تو "صدر مدرس" بہتر ہوگا۔

(ب)

اصطلاحات زیر غور

(نوٹ) گذشتہ نمبر میں اصطلاحات زیر غور میں ۱۳۳ نمبر کی اصطلاح غلطی سے Substitute. چھپ گئی ہے۔ یہاں اصل میں Subvention. چاہیئے ؂

121. Convocation.
122. Substitute.
123. Initiative.
124. Mass - Drill.
125. Stamped.
126. Mandate.
127. Substantive.
128 Conference.
129. Balance - Sheet.
190. D. O.
131 Precedence.
132 Priority.
133 Subvention.
134 [illegible] Letter.
135. [illegible]
136 A[illegible]
137 Stan[illegible]
138 [illegible]
139 [illegible]
140 [illegible]
141. Athletics.
142. Tournament.
143. Sports.
144. Games.
145. Surplus.
146. Duplicate.
147. Head Clerk.
148. Enquiries.
149. Passport.
150. Ticket.

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ـــــــ شعبہ کالج

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تعین ہوا	تقرر یا تبادلہ کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۱۹ مارچ ۱۹۴۹ء E-۶۵۱۹	م۔ غلام جیلانی اصغر ایم۔ اے	لیکچرار ڈی مونٹ مورنسی کالج سرگودھا (۱۵۰-۳۵۰)				۱۸ نومبر ۱۹۴۸ء سے	اپنے تقرر اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں۔
۳۱ مارچ ۱۹۴۹ء E-۷۵۹۷	م۔ عبدالحق ایم۔ اے (۱۵۰-۳۵۰)	لیکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور	عملہ تحتانی (۱۵۰-۳۵۰)	عملہ فوقانی پی۔ ای۔ ایس درجہ دوم قائم مقام	قائم مقام اعلیٰ لیکچرار گورنمنٹ کالج لائل پور	۲۱ مارچ ۱۹۴۹ء سے ۲۰ جون ۱۹۴۹ء تک	شیخ غلام محی ال[illegible] ایم اے پی ای [illegible] کی جگہ جو رخص[illegible] پر ہیں۔
یکم اپریل ۱۹۴۹ء E-۷۶۶۳	م۔ نذیر احمد اوان	لیکچرار اقتصادیات گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان			لیکچرار اقتصادیات گورنمنٹ کالج لائل پور بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	م۔ افتخار احم[illegible] کی جگہ جو مستع[illegible] ہو گئے ہیں

صیغہ رجال ——— شعبہ اسکول

شمارہ حکم	نام	منصب	تقرر یا تبادلہ کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
رچ ۱۹۴۹ء ۷۰۷	چودھری سلطان علی بی ایس سی بی ٹی۔ نمبر۸۸ : ۲۳۰-۳۰۰	صدر معلم گورنمنٹ ہائی اسکول بڑانوالہ ۲۳۰ —— ۳۰۰		۲۸ رفروری ۱۹۴۹ء سے	اپنے تقرر اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں۔
چ ۱۹۴۶ء ۷۰۸	م۔ حفیظ الرحمٰن بی اے ایس اے وی نمبر۱۸۲: (۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی سنٹرل موڈل اسکول لاہور۔ جو اب گورنمنٹ انجنیرنگ اسکول رسول میں معلم تحتی ریاضی کی حیثیت سے کام کررہے ہیں۔	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ۔ بمشاہرہ سابقہ (وہ رسول میں کام کرتے رہیں گے)	یکم مارچ ۱۹۴۹ء سے	بھیرہ اسکول میں معلم انگریزی کی ایک خالی اسامی کی جگہ۔
〃	نور حسین بی اے بی ٹی	ایک اُمیدوار	قائم مقام معلم انگریزی سنٹرل موڈل اسکول لاہور بمشاہرہ ۹۰ روپے ماہوار (درجہ ۹۰-۵--۱۵۰)	〃	م۔ حفیظ الرحمٰن کی جگہ جن کا حق عود گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ کی طرف منتقل کردیا گیا ہے۔
ج ۱۹۴۹ء ۷۲۱	سید آل نبی پیرزادہ ایم اے- بی ٹی نمبر۲۱۵(۱۵۰-۲۲۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی اسکول سرگودھا		۲۴ رفروری ۱۹۴۹ء سے	اپنے تقرر اور درجہ مشاہرہ میں مستقل قرار دئے گئے ہیں
پریل ۱۹۴۹ء ۷۶۵	م۔ محمد نیروز الدین سلیم	قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ۔ جو محمد یوسف کی رخصت میں کام کر رہے ہیں اور جو سنٹرل ٹریننگ کالج میں بی ٹی کی جماعت داخل ہیں۔	قائم مقام معلم اردو گورنمنٹ ہائی اسکول بھیرہ۔ بمشاہرہ ۵۰ روپے ماہوار ۵۰-۳-۸۰/۴-۱۰۰	۳ رمارچ ۱۹۴۹ء سے	فرمان شاہ کی جگہ جو ۳ رمارچ ۱۹۴۹ء سے ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔
اپریل ۱۹۴۹ء ۷۸۰	م۔ محمد عالم بی اے نمبر۸: ۱۵۰-۲۲۰ جو اب ۲۳۰-۳۰۰ میں ہیں	معلم دوم گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ	صدر معلم گورنمنٹ نارمل اسکول کمالیہ۔ بمشاہرہ سابقہ	جس تاریخ سے وہ صدر معلمی کا عہدہ سنبھالیں	چودھری نذیر احمد بی اے بی ٹی (۲۳۰-۳۰۰) صدر معلم کی جگہ جو تبدیل ہو کر لائلپور ضلع کے ناظر مدارس مقرر ہو چکے ہیں۔

ہماری ادبی کتابیں

سٹینڈرڈ اُردو ڈکشنری (آغا محمد باقر ایم-اے-ایم-او-ایل-بی ٹی) بارہ روپے
اُردو زبان اور ہندو (ناظم سوہاروی)
رحمتہ العالمین (قاضی محمد سلیمان صاحب سلمان) ہر جلد
جلد اوّل مجلد چار روپے - دوئم ۶ روپے ۸ ر سوئم ۶ روپے ۸ ر
معاشیاتِ قومی (ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب) مجلد ۸ روپے
صبح بہار (اختر شیرانی) لالہ طور (اختر شیرانی)
اختر ستان (") طیور آوارہ (")
ہمارا قائد (جناب جہاں گرد صاحب)
کمال اتاترک مصنفہ محمد توفیق مصری (مترجم مرزا کرم الٰہی)
جدید اُردو شاعری (پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری)
مقالاتِ قرآنی (علامہ عبداللہ العمادی)
ماڈرن اُردو ڈکشنری (صاحبزادہ ابو نعیم عبدالحکیم خان نشتر)
دیس سے باہر (آغا محمد اشرف ایم-اے)
لندن سے آداب عرض (" ")
اتفاقات (مرزا فدا علی خنجر لکھنوی)
شیشہ و سنگ (" ")
مقالاتِ شیرانی (حافظ محمود شیرانی)
ادبستان (خلیقی دہلوی)
تاریخ انقلابِ روس (شیر جنگ)
اوراقِ پارینہ (")
کارل مارکس اور اس کی تعلیمات (")
دھڑکتے دل (اختر شیرانی)
دو قرآن (ڈاکٹر غلام جیلانی برق ایم-اے)
خطباتِ بدر (مولوی بدرالدین صاحب بدر)
اسلام میں امامت کا تصور (" ")

اِشاراتِ اقبال (عبدالرحمٰن صاحب طارق بی-اے)
کشکول (رئیس احمد جعفری) پانچ روپے
دِل "
درد "
دید و شنید "
مجاہد "
عورت "
عرفانِ اقبال اور افاداتِ نیازی (صاحبزادہ محمد بشیر مخفی)
سکھ عہدِ اسلامی میں (عباد اللہ گیانی)
انجامِ حیات (سید آلِ رسول قطبی)
آنسو (عارف جالندھری)
گورکی کے افسانے (سعادت حسن منٹو)
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھ (اختر شیرانی)
تحلیلِ نفسی (حزب اللہ ایم-اے)
تفسیر موضح القرآن (مولانا شاہ عبدالقادر)
نیلوفر (حسن عزیز جاوید)
سازِ فطرت "
قسمت "
صبر و ضبط "
اسلام کا تمدّنی و سیاسی نظام (نکہت شاہجہانپوری)
اسلام کے عالمگیر اصول (علامہ فرید وجدی مصری)
خون کے آنسو (اشفاق حسین مراد آبادی) ۱۲
قرآنی اخلاق (عبدالصمد صارم)
تذکرۂ حسینی (مولوی علم الدین صاحب القادری کمالپوری)
شہنانہ (اختر شیرانی)

کتاب منزل کشمیری بازار - لاہور

Regd. No. L. 5327

• "آموزش" ہر ماہ شائع ہوتا ہے، سالانہ چندہ چھ روپیہ ہے

زرچندہ مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور کے نام روانہ کریں

• مضامین ایڈیٹر "آموزش" سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور

کو ارسال کئے جائیں۔ اشاعت کے لئے منظور شدہ

مضامین کا معاوضہ دیا جاتا ہے

• "آموزش" تمام تعلیمی حلقوں میں مقبول اور جملہ تعلیمی اداروں

میں رائج ہے

• "آموزش" میں اشتہار دیکر آپ تعلیم یافتہ جماعت

میں مشہور و مقبول ہو سکتے ہیں

• اشتہارات اور دوسرے کاروباری معاملات کے لئے

مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور سے مراسلت کریں

جون ۱۹۴۹ء

شیخ نیاز احمد پرنٹر و پبلشر نے اپنے علمی پرنٹنگ پریس ہسپتال روڈ لاہور میں چھپوا کر کشمیری بازار لاہور سے شائع کیا۔

جامعہ نگر (دہلی)

تعلیمی ماہنامہ

آموزش

مدیر "آموزش" کی تسلیم کے ساتھ

محمد ناظر

ناشر

کتاب منزل

لاہور

جون ۱۹۴۹ء

جلد :- ۲

شمارہ :- ۳

قیمت فی پرچہ :- دس آنے

سالانہ چندہ :-

پاکستان کیلئے :- ۶ روپے

غیر ممالک کیلئے :- ۸ روپے

رموز

پاکستان کی آزاد مملکت کے قیام کے بعد اس مملکت کے ہر فرد کو یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ تعلیم سے مستفید ہو۔ اب تک جو حال رہا ہے۔ اس کی صورت یہی رہی کہ تعلیم کے لئے جو خود بخود کوشاں ہوئے۔ وہ تعلیم یافتہ ہو سکے۔ باقیوں پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں رہی۔ دماغی اور جسمانی طور پر ماؤف بچے تو اس قابل ہی نہیں سمجھے جاتے رہے۔ کہ تعلیم حاصل کر سکیں۔ بلکہ انہیں سراسر تعلیم کے نااہل قرار دیا جاتا رہا ہے۔ آزادی کی خوشگوار فضا میں ملک و ملت کی خاطر اس بات کی اشد ضرورت ہے۔ کہ معاشرے کے ہر فرد تک تعلیم کی روشنی پہنچے۔ تاکہ وہ جمعیت کے لئے مفید اور کارآمد فرد بنے۔

آزاد مملکتیں ہمیشہ اپنے تمام افراد تک تعلیم پہنچانے کا اہتمام کرتی ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی بچہ تعلیم سے بے بہرہ نہ رہ جائے۔ جو بچے جسمانی یا دماغی طور پر ماؤف ہوتے ہیں۔ ان کے لئے بھی خاص خاص اہتمامات کئے جاتے ہیں۔ تاکہ بجائے اس کے کہ وہ معاشرہ کے لئے ناکارہ ثابت ہوں۔ اور مملکت پر بوجھ ہوں۔ وہ تعلیم حاصل کر کے معاشرہ اور ملک کے لئے مفید ثابت ہوں۔ شہریت کی مشینری کا مفید پرزہ بنیں۔ وہاں کے ارباب طب

اور ارباب تعلیم ملکر کام کرتے ہیں۔ نفسیاتی ماہرین نقص کی تشخیص میں امداد دیتے ہیں طب کے ماہرین ان نقائص کو ہر ممکن حد تک دُور کرتے ہیں۔ اور ارباب تعلیم ان معیوب و ماؤف بچوں کے حالات کے مطابق انہیں تعلیم دینے کا پروگرام بناتے ہیں۔ اور بہت حد تک اس پروگرام میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ بہرے، گونگے، اندھے بچے بھی مفید قسم کی علمی اور صنعتی تعلیم حاصل کرکے اچھی زندگی گذارتے ہیں۔ معاشرہ بھی ان سے مستفید ہوتا ہے اور ملک بھی۔ دماغی خرابیوں والے بچوں کے لئے نفسیاتی ماہرین نفسیاتی معالجہ تجویز کرتے ہیں۔ اور اس سے وہ بہت حد تک درست ہو کر ارباب تعلیم سے مناسب تعلیم پاتے ہیں۔ مغربی ممالک میں اس قسم کی تگ و دو مدت سے جاری ہے۔ اور ان کے شاندار نتائج سے دنیا واقف ہے۔

ہمارے ہاں جسمانی اور ذہنی طور پر ماؤف بچوں کے لئے تعلیم کا اہتمام تو یک طرف۔ انہیں سرے سے تعلیم کے لئے ناقابل و نااہل قرار دیا جاتا ہے۔ ایسے بچے اگر کوشش بھی کریں تو ان کی کہیں ہمت افزائی نہیں ہوتی۔ ان کے مقابل جو بچے اچھے ہوتے ہیں۔ ان کی بھی بہت کم تعداد مدرسوں کو جاتی ہے۔ ملک و ملت کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ تعلیم عام ہو۔ اور کوئی فرد اس سے بے بہرہ نہ رہے۔ اس سلسلے میں جہاں ہمیں ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دینا اور تعلیم بالغان کے سلسلے میں پُرخلوص کوشش کرنا ہے۔ وہاں اس چیز کی طرف بھی توجہ دینا ہے کہ ہمارے وہ بچے جو کسی جسمانی نقص و عیب کی وجہ سے تعلیمی بارگاہوں میں جگہ نہیں پاتے۔ ان کے لئے بھی تعلیم حاصل کرنے کا سامان کیا جائے۔ اور وہ بچے جو دماغی یا نفسیاتی فتور کے باعث تعلیمی مشاغل میں صحیح طور پر منہمک نہیں ہوتے۔ اور جن کی بے توجہی۔ الھڑپن اور پس ماندگی کے باعث ان پر فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے۔ کہ وہ تعلیم کے قابل نہیں۔ انہیں تعلیم کی طرف راغب کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

بہرا بچہ اس لئے کہ استاد کی بات سُن نہیں سکتا، اندھا اس لئے کہ دیکھ کر پڑھ نہیں سکتا، گونگا اس لئے کہ بول نہیں سکتا، تعلیم جیسی بے بہا نعمت سے محروم نہیں رہنا چاہئے

اس کا حق ہے کہ اپنی بساط کے مطابق تعلیم سے مستفید ہو۔ لیکن اربابِ تعلیم یا معاشرہ اس کے لئے سدِّ راہ ہوتے ہیں۔ اُسے تعلیم کے علاوہ کسی اور مفید کام کے اہل بھی نہیں سمجھتے۔ کس قدر ظلم ہے کہ بینائی درست نہ ہونے کے باعث ایک بچّہ اُس قسم کے تعلیمی فوائد سے بھی محروم رکھا جائے۔ جو سماعت و گویائی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اس طرح جہالت کے باعث یا تو ملک کے لئے مصیبت بنے یا قوم پر بار ہو۔ ایک صلاحیت کی عدم موجودگی میں جس میں بچّے کا کوئی قصور نہیں۔ باقی تمام قسم کی صلاحیتوں کو بے سود اور ناقابل توجہ قرار دینا بہت بڑی بے انصافی ہے جو خود ناشناس معصوم بچّے کے سلسلے میں کی جاتی ہے۔ مترقی و متمدن اقوام نے جنہیں آزادانہ تحقیق و تدقیق کی سہولتیں ہمیشہ میسر رہیں۔ اس چیز کا احساس کیا۔ اور ان جسمانی طور پر معیوب بچّوں کو معاشرے کے لئے مفید بنانے کی خاطر تعلیم دینے کا اہتمام کرنا شروع کیا۔ اس اہتمام میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں اور جدید انکشافات ہوئے۔ جنہوں نے طرقِ تعلیم پر بحیثیت مجموعی گہرا اثر ڈالا۔ کئی نئے طریقے ایجاد ہوئے۔ لیکن ایک بڑی اہم بات یہ ہوئی۔ کہ معاشرے کے ماؤف پُرزے کو مفید اور کارآمد بنانے کا راستہ نکل آیا۔

قوم کا ہر بچّہ مفید اور قیمتی ہے۔ اس کے بھی حقوق ہیں۔ اور آزاد اقوام و ممالک میں اس کی قدر کی جاتی ہے۔ اس سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ اور اس کے حقوق کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ آزاد پاکستان میں بھی بچّے کی یہی منزلت ہونی چاہیئے۔ اس کی قدر کی جائے۔ اسے قیمتی سمجھا جائے۔ خواہ وہ ماؤف ہی کیوں نہ ہو۔ اسے معاشرہ کا مفید پُرزہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اس کا حق آزادی سلب نہ کیا جائے۔ اس کا حق ہے کہ تعلیم حاصل کرے اس کا حق ہے کہ اسے بھی تمام قسم کی سہولتیں میسر ہوں۔ کسی کو حق حاصل نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ اس پر تعلیم کے دروازے کو بند کر دے صرف اِس لئے کہ وہ جسمانی طور پر ماؤف ہے اور تعلیم کے اہل نہیں۔ یا اس لئے کہ وہ نفسیاتی طور پر بگڑا ہوا ہے اور تعلیم میں چل نہیں سکتا۔

دو قسم کے بچّے تعلیم سے عموماً محروم کر دئے جاتے ہیں۔ ایک وہ جن کے تن بدن میں

کسی قسم کا ایسا عیب ہو۔ جسے تعلیم کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جائے۔ دوسرے وہ جن کے دماغ میں کوئی ایسا نفسیاتی فتور ہو۔ کہ وہ تعلیم میں صحیح توجہ نہ دے سکیں۔ پہلی قسم کے بچوں کو تو اکثر درسگاہوں میں داخل ہی نہیں کیا جاتا۔ دوسری قسم کے بچوں سے عموماً اساتذہ یا والدین تنگ آ کر ان کی تعلیم چھڑانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ جدید تجربوں اور نفسیاتی تحقیقوں نے ثابت کیا ہے کہ اندھے، بہرے اور اپاہج بھی تعلیم پا سکتے ہیں۔ اور بگڑے ہوئے بچے بھی سدھر سکتے ہیں۔

جسمانی عیب جو دُور ہونے کے قابل ہیں۔ انہیں تو بہت آسانی کے ساتھ اربابِ طب و جراحت کی امداد سے دُور کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ دیوار بچوں کی تعلیم کی راہ سے ہٹائی جا سکتی ہے وہ نقص جن کا دُور کرنا آسان نہیں یا ناممکن ہے۔ اس کے لئے دوسری صحیح و درست صلاحیتوں سے مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً جو بچہ دیکھ کر کسی چیز کو پہچان نہیں سکتا۔ وہ لمس و سماعت سے اپنی اس کمی کو کسی حد تک پورا کر سکتا ہے۔ اس کا حق ہے۔ کہ اگر اس کے ساتھ کے دوسرے بچے تعلیمی سہولتوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ تو اس کے لئے بھی کوئی ایسا اہتمام ہو جس سے وہ اپنی باقی صلاحیتوں سے اپنے مستقل عیب کی کمی کو پورا کر سکے۔ اس قسم کی اصلاح و تدبیر کی ذمہ داری تعلیم کے اربابِ بست و کشاد پر عائد ہوتی ہے۔ ڈاکٹر، معلم اور ماہر نفسیات کے باہمی تعاون سے بہترین لائحۂ عمل تیار کیا جا سکتا ہے۔ مغربی متمدن و آزاد ممالک میں ایسے بورڈ قائم ہیں، جن میں ڈاکٹر، معلم اور ماہرینِ نفسیات بحیثیت رُکن شامل ہیں۔ اور جن کا کام یہی ہے۔ کہ تحقیق و تشخیص کے بعد ماؤف بچوں کے نقائص کو دُور کرنے کی تدابیر تجویز کی جائیں۔ اور ان کے لئے ایسا لائحۂ عمل تیار کیا جائے جس کے مطابق وہ حسب استطاعت مفید قسم کی تعلیم حاصل کریں۔ آزاد پاکستان میں بھی اس قسم کے بورڈ کے قیام کی اشد ضرورت ہے۔ اس ملک کے اربابِ بست و کشاد کو اس طرف فوری توجہ کرنی چاہیئے۔

بگڑے ہوئے بچوں کا سدھار بھی تشخیص و تعیینِ اسباب اور مناسب تدابیر سے ہو سکتا ہے۔

جو بچے گندہ عادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ گستاخیاں کرتے ہیں۔ چوریاں کرتے ہیں جھوٹ بولتے ہیں، شرارتیں کرتے ہیں۔ کام نہیں کرتے، توجہ نہیں دیتے، صحیح فکر و غور نہیں کرتے، اوقات کے پابند نہیں ہوتے۔ سست سے رہتے ہیں۔ یا غیر مفید اور نقصان دہ مشاغل میں منہمک سے رہتے ہیں۔ اُن پر ناکارہ ہونے کا فتویٰ صادر کر کے انہیں صحیح قسم کی تعلیم و تربیت سے روک دینا ملک و قوم کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ایسے بچے ناکارہ نہیں ہوتے۔ بلکہ اُن کی قوتیں اور جبلتیں غلط راہِ عمل اختیار کئے ہوئے ہوتی ہیں۔ اور اس کی وجہ بُری صحبت، نامناسب گھریلو ماحول، غیر موزوں پابندیاں یا غلط طریق تعلیم ہوتا ہے۔ بھلا جس کا بیٹھنا اُٹھنا اوباشوں کے ساتھ ہو۔ اُس سے کس طرح توقع کی جا سکتی ہے۔ کہ وہ اُن کا اثر نہ قبولے۔ جن کے والدین جھگڑالو ہوں یا شرابی ہوں یا بدعادات میں مبتلا ہوں، یا خود تو غلط کار ہوں اور بچوں کو تلقین کرتے رہیں۔ ایسوں کے بچے کس طرح بدعادات سے بچ سکتے ہیں؟ وہ بھی ضرور خلوص کے ساتھ اعمال میں اپنے والدین کے طرزِ عمل کی اطاعت کریں گے۔ جن بچوں پر کڑی اور بے ضرورت پابندیاں لگائی جائیں۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ ان کی دبی امنگیں اور خواہشات اور ان کی دبی طبیعتیں کسی بغاوت پر آمادہ نہ ہوں تعلیم و تربیت کا غلط طریق اختیار کیا جائے۔ تو بچہ کبھی مطمئن نہیں ہوگا۔ ایسے بچے کی بے اطمینانی مختلف شرارتوں کی صورت اختیار کرے تو وہ حق بجانب ہے۔ بچے کے بگاڑ کے اسباب اگر یہ ہوں۔ تو بچے کا کیا قصور۔ اُسے تعلیم چھوڑ دینے پر آمادہ کرنا یا اسے تعلیم و تربیت دینے سے انکار کرنا ناانصافی ہے۔ ایسے بچے کے لئے تو مناسب تدبیر یہ ہے۔ کہ اس کے بگاڑ کے صحیح اسباب معلوم کئے جائیں۔ اس کی نشست و برخاست پر نگاہ ڈالی جائے۔ اُس کے گھریلو ماحول کا جائزہ لیا جائے۔ اس بات کی تحقیق کی جائے۔ کہ اس پر کوئی بے جا کڑی پابندیاں تو نہیں؟ اس کی کوئی خواہش دبی دبی سی تو نہیں اس کی جبلتوں کی راہِ عمل میں بے جا رکاوٹیں تو نہیں۔ اس کے لئے جو طریق تعلیم اختیار

کیا گیا ہے۔ وہ نامناسب تو نہیں۔ اسباب کی تحقیق کرنے کے بعد ان اسباب کو دُور کرنے اور صحیح طریق تعلیم اختیار کرنے سے بگڑے ہوئے بچے کے سنورنے کے سَو فی صدی امکانات ہیں۔ مغربی متمدن ممالک میں ایسے کئی کامیاب تجربے ہوئے ہیں۔ اب وہاں بگڑا بچہ عقدۂ لاینحل نہیں سمجھا جاتا۔ اس بگاڑ کے اسباب معلوم کرنے میں ماہرین نفسیات ہی زیادہ ترممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بگڑے ہوئے بچوں کو نفسیاتی تشخیص و علاج کے لئے نفسیاتی دارالعلاج میں بھیج دیا جاتا ہے اور ایسے دارالعلاج حسب ضرورت ہر درسگاہ کے ساتھ ساتھ قائم ہیں۔

غلامانہ دَور میں ایسا بگاڑ تو اور بھی زیادہ ٹیڑھی کھیر بن جاتا ہے۔ ایسے دَور کے بگڑے ہوئے بچے تو ملک و قوم کے لئے مہلک ہوتے ہیں۔ پاکستان کو اس قسم کے عناصر پاک کرنے ہیں۔ اور آئندہ کے لئے بہتر تعمیر کرنی ہے۔ اس کے لئے اشد ضروری ہے۔ کہ اس کا ہر بگڑا ہوُا بچہ سنور جائے۔ اور آئندہ کو بگڑنے نہ پائے۔ یا بگڑنے لگے تو اسے مزید بگاڑ سے محفوظ کرکے سنوارنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس غرض سے پاکستان کی درسگاہوں کے ساتھ نفسیاتی علاج گاہوں یا نفسیاتی بورڈوں کا قیام جلد از جلد کرنا پڑے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ ارباب اہتمام یہ اہم چیز بھی پیش نظر رکھ کر مناسب اقدامات کریں گے۔

ملک میں تعلیمی ترقی کے لئے اس وقت چار قسم کے اقدامات ضروری ہیں۔ ہر مقام پر تعلیمی اداروں میں جاذبیت کا سامان پیدا کرنا، جگہ جگہ تعلیمی کانفرنسیں تعلیم بالغان، معلمین کا اتحاد عمل۔

"آموزش" میں ہم ایک سلسلہ اطلاعات و تجاویز جاری کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں۔ کہ ان چار قسم کے اقدامات کے متعلق صوبہ بھر میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کے معلومات تمام اداروں تک پہنچیں، تاکہ جو ایسی راہِ عمل میں

سست گام ہوں وہ تیز گام ہو جائیں۔ اور جو غیر متحرک ہیں۔ وہ متحرک ہو جائیں۔
چنانچہ اس سلسلے میں ایسے اربابِ تعلیم سے جو ضلعوں میں برسرِ اقتدار ہیں۔ التماس ہے
کہ وہ اپنے ضلع کی ہر تعلیمی ترقی کی ماہوار اطلاع "آموزش" کو بھیجتے رہا کریں۔

تعلیمی کانفرنسیں بہت مفید ہیں۔ ان سے تعلیمی تبلیغ بھی ہوتی ہے۔ تبادلہ
خیالات بھی، اور بعض اہم تعلیمی مسائل بھی باہمی بحث و مذاکرہ سے حل ہو جاتے ہیں
ضرورت ہے کہ ہر مقام پر یا کم از کم ہر ضلع میں اس قسم کی تعلیمی کانفرنسیں ہوں۔ اور
ان کے تعمیری کام کی روئداد "آموزش" تک پہنچے۔ این۔ ای۔ ایف
(نیو ایجوکیشن فیلوشپ) کی ضلعی شاخوں کے زیرِ اہتمام ایسی بے شمار کانفرنسیں
کی جا سکتی ہیں۔ ان کانفرنسوں کا سب سے زیادہ مفید اثر یہ ہوگا۔ کہ عوام میں تعلیمی
شوق پیدا ہو جائے گا تعلیم بالغان کے رواج میں اور ابتدائی تعلیم کے لازم کرنے
میں یہ اقدام بہت حد تک معاون ثابت ہوگا۔

تعلیم بالغان کے لئے ادارہ نے آموزش میں ایک سلسلہ جاری کرنے کا
ارادہ کر لیا ہے۔ اس میں تعلیم بالغان کے فروغ کے لئے تجاویز بھی زیر بحث
آئیں گی۔ اور بالغوں کے لئے مفید لٹریچر پیدا کرنے کی کوشش بھی کی جائے گی۔
ماہرینِ تعلیم، و قارئینِ آموزش اس سلسلے میں اپنی تجاویز مدیر آموزش کو ارسال
فرمائیں۔

معلّمین کے اتحادِ عمل کے لئے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کہ صوبے کی مرکزی تربیت گاہ
معلّمین (سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور) کو معلّمین کے تعلیمی مشاغل کا مرکز بنایا جائے۔
اور یہاں "ملّی انجمن اساتذہ" (نیشنل یونین آف ٹیچرز) قائم کی جائے۔ جس میں موجودہ
ڈسٹرکٹ بورڈ ٹیچرز ایسوسی ایشن، گورنمنٹ سبارڈینیٹ ٹیچرز ایسوسی ایشن اور دوسری
تمام ٹیچرز ایسوسی ایشنز شامل ہوں۔ اساتذہ کی اس مرکزی ملّی انجمن کے مختلف شعبے ہوں۔

(۱) شعبہ ابتدائی تعلیم (۲) شعبہ ثانوی تعلیم (۳) شعبہ نظارت (۴) شعبہ صدر معلمین۔ ایک ماہ میں ایک شعبہ کا اجلاس ہؤا کرے۔ اور ہر شعبہ کے اجلاس کی سال میں تین دفعہ باری آئے۔ اس قسم کے اجلاس میں ہر شعبے کے نمائندے شامل ہؤا کریں۔ اجلاسات ٹریننگ کالج میں ہوں۔ جہاں تعلیمی تحقیقات، نصاب اور دیگر تعلیمی مشاغل پر تبادلہ خیالات ہؤا کرے ٭

نفسیات اور معلّم

شمس بریلوی

اب سے نصف صدی پہلے تک ہمارے ملک میں معلّم اور نفسیات کے باہم
[illegible] و ملزوم ہونے پر شاید ہی کسی نے توجہ کی ہو! اس طویل عرصہ میں کبھی بھی اس
[illegible]رت کا احساس نہیں کیا گیا کہ معلّم کے لئے ضروری ہے کہ وہ موادِ درسی کی طرح
[illegible]یات" (Psychology) پر بھی دستگاہ کامل رکھتا ہو بلکہ مدرس کی اس صفت کو
[illegible] تصور کیا جاتا رہا کہ وہ مواد تدریسی پر کافی عبور رکھتا ہو، لیکن ظاہر ہے کہ ایسے مدرس اگر
[illegible] بصیرت سے بھی کام لیں تو زیادہ سے زیادہ وہ طلباء کو اپنی طرف متوجہ رکھ سکتے ہیں۔
[illegible] زیر تدریس سبق پر ان کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کا سامان فراہم کر سکتے ہیں۔ لیکن طلبہ کے
[illegible]ی اعمال کی رہنمائی وہ ہرگز نہیں کر سکتے! صرف طلبہ کی توجہ کو اپنی طرف مبذول و
[illegible]رار رکھنے والے مدرس بھی بغیر نفسیاتی دیدہ وری کے شاذ ہی دستیاب ہو سکتے ہیں۔
[illegible] لئے کسی مدرس میں صرف تدریسی قابلیت کا ہونا طلبہ کے لئے مفید ہونے پر دال نہیں
[illegible] سکتا۔

ہاں اگر اُستاد کو صرف تدریب (Instruction) کا ذریعہ بنانا ہی مقصود ہے

تو اس کا مواد تدریسی پر عبور رکھنا ہی کافی ہے لیکن ایسا خیال کرنا معلمین اور ان کے سرپرستوں کی خواہش کے قطعی خلاف ہے۔ ایک بچّہ کو استاد کی نگرانی میں دے دینے کے بعد والدین عام طور سے یہی سمجھ لیتے ہیں کہ اب معلّم ہی اس کی واقفیت فنون مطلوبہ، کردار، سیرت، قوائے اخلاقی، عقلی اور جسمانی تربیت کا ذمہ دار ہے۔ اور اب ہم اس سپردگی کے بعد اپنے ایک بڑے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ لیکن اسکول یا مدرسہ میں ایسے استاد کی زیر نگرانی پرورش پانے والے بچّہ کی یہ توقع محالات میں سے ہے۔ اس کا اصل باعث یہ ہے کہ تعلیم (Education) اور تدریب (Instruction) میں فرق نہ کرنے کی غلطی ان سے سرزد ہوئی ہے اور وہ تدریب ہی کو تعلیم سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ تعلیم کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے اور وہ تمام قوائے عقلی، اخلاقی اور جسمانی کی تربیت اور نشوونما پر محیط ہے۔ اور تدریب اس کا محض ایک جزو ہے۔

تدریب کا قدم محض اسباق اکتسابی یا درسی سے آگے نہیں بڑھتا۔ اور تعلیم میں اسباق اکتسابی، مدرسہ کا ماحول، ہم جماعتوں کا اثر، ان کی تقلید، دوسرے کے کردار سے اثرپذیری، سیرت کی تربیت، مدرس کا ذاتی نمونہ اور گھر کا ماحول اور اس کا اثر، یہ تمام چیزیں شامل ہیں۔ اس لئے ایک مدرس جو محض تدریب میں کامل دستگاہ رکھتا ہے اس سے یہ توقع بعید ہے کہ وہ بچّہ کی عقلی، اخلاقی اور جسمانی نشوونما کی فکر بھی اسی طرح کرے گا۔ جس طرح وہ اپنے مواد تدریسی کے ذہن نشین بنانے کی فکر میں رہتا ہے۔

بعض قارئین اور تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے حضرات شاید یہ اعتراض کریں کہ اب سے نصف صدی پہلے تو مدرسین "نفسیات" سے بالکل ناآشنا ہوتے تھے لیکن پھر بھی ان میں سے اکثر کامیاب مدرس ثابت ہوتے تھے اور آج کل کے مقابلہ میں ان کی تدریب قریب قریب تعلیم ہی کے مقاصد کو پورا کرتی تھی! ایسے حضرات کے اس اعتراض کو کسی حد تک تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن ان کو اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ پہلے مکتبوں ہی کو

بچّوں کی تربیت و تعلیم کا اولین مرحلہ بنایا جاتا تھا۔ مکتبی طریقہ تدریب میں وقت اتنا صرف ہوتا تھا کہ شاگرد استاد کی شخصیت اور اس کی انفرادی خصوصیات سے ضرور بہرہ ور ہوتا تھا اور استاد خود اعلیٰ کردار کا ایک نمونہ ہوتا تھا دوسرے بچّے کو مختلف اساتذہ کے گوناگوں اور متضاد کردار کی کشمکش سے دوچار نہیں ہونا پڑتا تھا۔ تیسرے خود طالب علم کا منزلی ماحول اس کے کردار اور سیرت کی تعمیر میں ممد و معاون ثابت ہوا کرتا تھا لیکن بایں ہمہ کبھی بھی مکتبی مدرس کے ذمہ والدین کی طرف سے ایسی گوناگوں ذمہ داریاں سپرد نہیں کی جاتی تھیں۔ بلکہ والدین خود بچّوں کی اخلاقی اور جسمانی نشو و نما پر اپنا وقت صرف کیا کرتے تھے، یہی سبب تھا کہ مکتبی تعلیم اس دور کی تعلیم کے مقابلہ میں زیادہ کامیاب رہتی تھی اگرچہ موضوعات اور فنون کے اعتبار سے وہ محدود ضرور ہوتی تھی۔

عصرِ حاضر میں تو اسکول یا مدرسہ ہی کو ایک بچّہ کے لئے معلّم اخلاق، جسمانی نشو و نما کا مرکز، عقلی اور ذہنی صلاحیتوں کے ارتقا کا رہبر و ہادی سمجھا جاتا ہے، ایسی صورت میں ایسے اداروں میں اگر صرف مواد تدریسی فراہم کرنے والے مدرسین کا انتخاب کر لیا جائے تو ظاہر ہے کہ سرپرستوں اور والدین کی ان توقعات کی بلند عمارت بالکل منہدم ہو جائے گی۔ اسی لئے اس دور میں جب کہ علوم و فنون کی شاہراہیں کھلی ہوئی ہیں، سائنس اور روز افزوں ایجادات اور متنوعہ علمی اور فنی تجربوں نے علم کے ہزاروں دروازے ایسے کھول دئے ہیں جو اس سے پہلے وہم و خیال میں بھی نہیں تھے؛ مشاہیر ماہرین علم نے ایک مدرس کے لئے "نفسیات" سے بہرہ ور ہونا بھی ضروری سمجھا ہے۔ "مرہل" جیسا بالغ نظر کہتا ہے کہ "استاد (مدرس) ایک باغبان ہے جس طرح ایک باغبان کے لئے ضروری ہے کہ موسمی اثرات، مختلف مٹّیوں کے خواص، گرد و پیش کے اثرات سے آگاہ ہو۔ اگر وہ ان چیزوں سے آگاہ نہیں ہوگا تو اس کے پودے کبھی سرسبز، شاداب اور تناور نہیں ہو سکتے؛ اسی طرح ایک مدرس، کمسن اور ناواقف شاگردوں کی ان پوشیدہ اور قابل اصلاح صلاحیتوں کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔ جب تک وہ نفسیات سے کماحقہٗ بہرہ ور نہیں ہے۔

ہر دور، ہر عہد اور ہر ماحول میں یہ امر بکثرت مشاہدہ سے گذرا ہے کہ ایک ناواقف نفسیات معلّم کی تربیت میں ایک ہونہار بچّہ کی اعلیٰ صلاحتیں بری طرح برباد ہو کر رہ گئی ہیں، ان کا وجدان، تجسس اور تفکر بالکل برباد ہو گیا اور وہ قوم کا ایک بہترین فرد بننے کے بجائے ایک ناقص معلّم کی رہنمائی سے اپنی معمولی صلاحیتوں کو بھی کھو بیٹھا اور وجدان کے بجائے ذہنی تساہل، تجسس کے بجائے ذہنی جمود اور تفکر کے بجائے بدعقلی کا شکار ہو گیا اور یہ غلط نقوش اس کی ذہنی سطح پر اس طرح مرتسم ہو گئے کہ آئندہ مٹانے کی کوشش کے باوجود نہ مٹ سکے۔

آج معاشی جدوجہد اور ہمارے قومی افلاس کی ضرورتوں نے بعض لوگوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ان کے بچّوں کے لئے تدریب (Instruction) تعلیم سے زیادہ اہم اور ضروری ہے لیکن ان کی یہ غلطی ہے وہ اپنی اس نادانی کا نتیجہ خود اپنی آنکھوں سے اس وقت دیکھ لیتے ہیں جب بدقسمتی سے بچّوں کو آئندہ زندگی میں اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ تعلیم جو مدعا، سیرت اور کردار کی اصلاح و درستی کا نام ہے کس طرح اس تدریب سے ثانوی درجہ میں رکھی جا سکتی ہے۔ جس کا مقصد صرف پیٹ پالنا ہے یا صرف چند کتابی معلومات اور بیرونی دُنیا کے کچھ حالات کا ذہن نشین کر لینا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں، عمدہ اور نیک کردار کا خوگر بنانے، دنیاوی امور میں اچھی طرح سے کاربرآری، اور ماحول کے مطابق ان کو اپنے کام میں لانے، بنی نوع انسان کے ساتھ اچھے اور عمدہ تعلقات قائم کرنے سے کس طرح برتر اور بلند ہو سکتی ہیں۔ اسی لئے ملٹن نے تعلیم کی اس طرح تعریف کی ہے "وہ جو انسان کو انصاف، صلاحیت اور فراخ دلی سے تمام فرائض خانگی اور معاشرتی، صلح اور جنگ سے متعلقہ امور سر انجام دینے کے قابل بنائے۔"

غرضکہ تعلیم بچّہ کو مکمل کردارِ حیات سکھانے پر مشتمل ہے اور تدریب زندگی کے صرف معاشی رخ کو کارآمد بنانے کا ذریعہ ہے۔ یہاں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا رہا ہے۔ کہ تدریب کی کچھ حیثیت ہی نہیں ہے ظاہر ہے کہ ایک فرد کے لئے تکمیل کردار و حیات کی

مہم سرانجام دینے کی بنا پر تدریب ضروری ہے اور بغیر اس کے کمالِ انسانی تک پہنچنا دشوار ہے لیکن اس خصوص میں بھی اس کی حیثیت ایک جزو سے آگے نہیں بڑھتی، یوں سمجھ لیجے۔ کہ تدریب وجود انسانی کا ایک عکس ہے جو آئینہ پر پڑ رہا ہے اور اس کے تمام خط و خال اس میں نمایاں ہیں اور تعلیم خود اس فرد کا وجود حقیقی ہے، ظاہر ہے کہ وجود حقیقی اور اس کے عکس میں کتنا عظیم فرق ہے۔

پس اگر تعلیم کا مقصد صرف تدریب بلکہ تعلیم اور ضمناً تدریب ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے تو ایک معلّم کے لئے ضروری ہے کہ وہ نفسیات سے آگاہ، عادتوں اور ان کی تربیت سے واقف، ادراک و احساسات کا جاننے والا اور ان کے اصولوں پر کافی دسترس رکھتا ہو۔ تاکہ وہ بچّوں کی تشکیل سیرت (Charactor Formation) کی مہم میں ناکامی کا منہ نہ دیکھے اور کامیابی کے ساتھ اس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکے۔

اگرچہ مجھے اس امر کا اعتراف ہے اور نہ صرف مجھے بلکہ ان تمام لوگوں کا اس پر اتفاق ہے جو تعلیمی اداروں سے وابستہ ہیں کہ آج ہمارے تعلیمی اداروں میں نفسیاتی طریقۂ تعلیم کو کما حقہٗ کامیاب بنانے کے ذرائع اختیار کرنے میں بہت کچھ دشواریاں ہیں۔ قطع نظر ان مادی موانع کے جو تعلیمی اداروں میں قدم قدم پر ایک معلّم کے مزاحم ہوتے ہیں۔ خود ان بچّوں کا جسمانی، ذہنی اور ماحول کا اختلاف ایک بڑا سنگِ راہ بن جاتا ہے۔

موجودہ طریقۂ تعلیم اور درسگاہوں کے تعلیمی نظام الاوقات کے باعث مدرس کو روزانہ سینکڑوں مختلف الطبائع بچّوں کے مطالعہ کا موقع ملتا ہے ناممکن ہے کہ وہ ان سب بچّوں کے نفسیاتی، جسمانی، ذہنی اور فکری قویٰ کا اندازہ کسی ایک اصول کے تحت کر سکے ہر ایک متعلّم میں انفرادی خصائص موجود ہوتے ہیں، کوئی سُست ہے مگر ذہین، کوئی شریر ہے مگر غبی! بعض شریر بھی ہیں اور ذہین بھی! کسی کا ماحول عشرت پسندانہ ہے اس کی عادتیں آرام کی خوگر ہیں، کوئی زود مشتعل ہے۔ اس لئے معلّم کے لئے ضروری ہے کہ وہ

تمام قوانین ترتیب اطفال یا نفسیات کے ساتھ ساتھ انفرادی اختلافات کا بھی مشاہدہ کرتا رہے ورنہ وہ ہر ایک شاگرد کی تربیت، سیرت و کردار میں کامیاب نہیں ہو سکے گا' ان کی سیرت و کردار کی تربیت میں اس کو مختلف نظریوں سے کام لینا پڑے گا؛ کہیں وہ "نظریہ سیری" سے کامیاب ہو سکتا ہے اور کہیں "نظریہ تادیب" پر عمل پیرا ہو کر کامیاب ہو سکتا ہے اگر وہ محض ایک نظریہ کو ہر موقع اور ہر ایک محل پر استعمال کرے گا اس کی کامیابی مشتبہ ہے ! معلم کا فرض ہے کہ انفرادی خصوصیات اور مقتضیات کا لحاظ رکھتے ہوئے ترتیب سیرت کی منزل میں قدم رکھے ۔

میں یہ کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کروں گا اور خود میرا مشاہدہ ہے کہ آج تربیت یافتہ (ٹرینڈ) مدرسین جن کے فرائض میں یہ سب کچھ شامل ہے اپنے فرائض کی ادائیگی سے جی چُراتے ہیں لیکن ان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ ایک اخلاقی امانت میں خیانت کے جرمِ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں ! آج تعلیمی اداروں میں اساتذہ نے اپنے کردار کو اتنا گرادیا ہے کہ وہ کبھی بھول کر بھی اپنے آپ کو طلبا کے سامنے نمونے کے طور پر پیش نہیں کرتے ! ان کو اپنا یہ فرض کبھی یاد نہیں آتا کہ ہم بچّوں کے اخلاق و کردار اور سیرت کے بھی معمار ہیں ! خدا ہم کو اس فرض شناسی کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تعلیمی اداروں کے منتظمین اور اربابِ حل و عقد کو بھی اس طرف مائل کرے کہ وہ سچّی خدمت کرنے والے معلّمین کے لئے کامیابی کے بیش از بیش مواقع اور اسباب فراہم کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیں ۔

تصاویر پر تعلیمی نظر

عبدالقدیر بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

انسانی فطرت ہر رنگ میں جمالیات کی مشتاق نظر آتی ہے حسن خواہ کسی لباس میں جلوہ گر ہو ایک جاذبیت کا حامل ہے۔ نقاش ازل نے اپنے رنگین قلم سے دنیا کو تصویر خانہ بنا کر ہر نقش کو ایک خاص رنگ عطا کیا ہے اسی لئے انسان تلون پسند ہے اور ایوان کے تحیّر میں انبساط و نشاط پاتا ہے۔ بچہ آغوشِ مادر ہی میں تصویر کو بہ نظر استعجاب دیکھتا ہے۔ اور مرغوب رکھتا ہے۔ اُس کی طرف بازو پھیلا کر لپکتا ہے اور بغور دیکھتا ہے۔ غرضیکہ اس کی جاذبیت سے متاثر ہوتا ہے۔ جُوں جُوں بڑھتا ہے تصاویر اور الوان کی دید کا شوق تیزی سے ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ طفولیت میں بچوں پر رنگوں کا اجتماع کس قدر کیف آور ہوتا ہے۔ اکثر بچے گہرے شوخ رنگ کی تصویریں دیکھ کر کھوئے جاتے ہیں۔ کیونکہ بچے کی فطری شوخی اور متلوّن مزاجی تصویروں کو ہمرنگ پاتی ہے نیز یہ کہ تصویر عالمِ خیال میں اشیائے محسوس کا عکس ہوتا ہے۔ اور بچے کو جو شغف عالمِ خیال سے ہوتا ہے وہ غیر محدود ہوتا ہے۔ اس کی پرواز اکثر خواب کی طرح عجیب و غریب ہوتی ہے۔ جو معانی و مفہوم کی قیود سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اُسے معقولیت سے تلازم نہیں ہوتا۔ تصویروں میں بھی وہ یہی کیفیت دیکھتا اور پاتا ہے۔ معقول سے معقول تصویر

جب اس کے سامنے آتی ہے تو تخیل کی تحریک سے وہ بجو دہو کر تصویر کے اجزائے مختلفہ کو دلچسپ طریق سے باہم آمیختہ کرتا ہے اور ایک دل پسند کہانی مرتب کرنے کی سعی کرتا ہے۔ کہانیوں کو بچّے اسی لئے مرغوب رکھتے ہیں کہ اُن میں ایک رنگین پس منظر ہوتا ہے۔ اُن کا مفہوم بچّے کے دماغ میں ایک تصویر پیدا کرتا ہے۔ جس میں بچّہ پھر اپنے آپ طرح طرح کے رنگ بھرتا رہتا ہے۔

ہمارے لئے تصویر کا مرغوب ہونا ایک اور قدرتی وجہ سے بھی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دماغی ساخت کیمرہ سے مشابہ ہے۔ روح دماغ کیمرے کی فلم سے کہیں زیادہ ذکی داقع ہوئی ہے۔ اس کے پردے پر مختلف اشکال اور مختلف رنگ فوری اثر رکھتے ہیں۔ آنکھیں کیمرے کے لینز کی طرح حسّاس ہوتی ہیں اور خارجی اشیاء کے انعکاس کا باعث ہوتی ہے۔ جو لوح دماغ پر جا کر ثبت ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح تصاویر کا ایک بسیط اور متنوع مرقع یا البم تیار ہوتا رہتا ہے۔ دماغ کیمرے سے اِس لحاظ سے بالخصوص برتری اور فوقیت رکھتا ہے کہ تصاویر مرتب شدہ باہم مخلوط اور مربوط ہو کر اور تصاویر بھی تیار کرتی رہتی ہیں۔ جو مشاہدہ کی واقعیت سے بعید ہوتی ہیں۔ مگر بعض اوقات کسی مخفی واقعیت کو آشکار کر دیتی ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں نئی دریافت یا ایجاد کی بنیاد بن جاتی ہیں۔ ہم اس بنا پر بلا شبہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ خارجی تصاویر بھی بچّوں پر ایسے اثرات پیدا کر سکتی ہیں اور کرتی رہتی ہیں۔ مگر قوائے عملیہ عدم پختگی کے باعث نئی ترتیب یافتہ تصاویر کو ٹھوس اور عملی شکل میں ظاہر کرنے سے قاصر رہتے ہیں لیکن قوائے عمل کے قوی ہونے پر یہی دریافت اور ایجاد کے لئے محرک ہو سکتی ہیں اس تدریجی نشو و نما کے ساتھ ساتھ تصاویر مرتب شدہ صاف واضح اور مکمل بھی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور قوائے عمل کو نئے اظہار کے لئے آمادہ اور بے قرار کرتی رہتی ہیں۔

تصویروں کی چمک دمک اور اُن کے رنگ جاذب نگاہ ہونے کے باعث مکمل توجہ کے متقاضی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو اسباق تصاویر اور رنگین نقشوں کی امداد سے پڑھائے

تے ہیں توجہ جذب کر لیتے ہیں۔ اور اُن کے اثرات اور نقوش گہرے اور پائدار ہوتے ہیں۔
نکہ انعکاس صاف اور واضح ہوتا ہے۔ دیگر ممالک میں اسی بنا پر بچّوں کو مصوّری او ر
مو یر کشی کی رغبت شروع سے دلائی جاتی ہے۔ اِس میں کھیل کا عنصر موجود ہے جو بچّے کی
رت ہے۔ دراصل کھیل میں انبساط کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اور جس مشغلہ کو کھیل سے
ثلت ہوگی وہی بچّوں کو زیادہ محو کر سکتا ہے۔ تصاویر دیکھنے سے شگفتگی اور خوشی حاصل ہوتی
ہے۔ اِس لئے اِس کے نتائج بھی نہایت مؤثر ہوتے ہیں۔ بچّوں کو اگر تصاویر جمع کرنے کے لئے
وڑی سی ترغیب دی جائے تو ہر ایک بخوشی ایک ایک البم تیار کر سکتا ہے۔ یہ مرقعے انہیں
یادی سے جمع کرنے دئے جائیں تو انواع و اقسام کی بہت سی تصویریں جمع ہو سکتی ہیں۔
ر یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ہر سبق محض تصاویر کی امداد سے بخوبی ذہن نشین
یایا جا سکتا ہے۔ یہاں ممکن ہے کہ یہ خیال پیدا ہو کہ بچّے اِتنے خرچ کے کیوں متحمل کئے جائیں
یہ اندیشہ کچھ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ تصاویر خریدنے کے بغیر بھی گذارہ ہو سکتا ہے۔ عام
ڈی اخبارات۔ رسائل۔ پُرانی اور دریدہ کتابوں سے بے شمار تصویریں کاٹ لی جا سکتی ہیں
ڑے کے تھانوں۔ تجارتی اشتہاروں اور سرکاری اور غیر سرکاری نشر و اشاعت کی دستاویزوں
سے بھی کافی تصویریں حاصل ہو سکتی ہیں۔ بلکہ یہ بھی بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ہر مضمون
ی جزئیات تک کے علیحدہ علیحدہ البم تیار کئے جا سکتے ہیں۔ اور استاد کی قوت بیان کا کام
ہت ہی مختصر اور محدود ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جہاں اُستاد کو لفظی تخیل سے راہنمائی کرنا ہے۔
ہاں تصاویر اپنا کام نہایت مؤثر انداز میں خود بخود کرتی چلی جاتی ہیں۔ قوت باصرہ کا دائرۂ
حساس قوت سامعہ کی نسبت نہ صرف زیادہ وسیع ہے۔ بلکہ زیادہ قابل اعتماد بھی ہے۔ یہی
جہ ہے صوت خواہ کیسی ہی دل پسند کیوں نہ ہو ہلکا سا اور کئی دفعہ مبہم سا تصوّر چھوڑتی ہے۔
جو دیرپا بھی اُسی درجہ کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ قوت سامعہ محض ایک لَے یا زیر و بم
کے تحفظ پر قادر ہے۔ مگر قوت باصرہ چیز کی ہیئت۔ قد و قامت۔ رنگ وغیرہ سب پر حاوی

ہوتی ہیں۔ ویسے بھی وہ اشیاء تعداد میں بہت زیادہ ہیں جن کا احساس بصارت کا محتاج ہے
مثلاً اگرچہ خوشبو دیکھی نہیں جا سکتی بلکہ اس کا احساس محض قوت شامہ کی وساطت سے ہے۔
مگر خوشبو کی حامل اشیاء ضرور دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہی حال اشیائے ذائقہ اور لامسہ اور
سامعہ کا بھی ہے۔ آنکھ پھول کو۔ پھل کو۔ آلاتِ سرود اور اشیائے محسوس سب کو دیکھ سکتی
ہے۔ مگر ناک صرف پھل اور پھول کی خوشبو کو۔ کان محض صوتِ برآمدہ کو اور لمس صرف درجہ
حرارت یا درجہ شدت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس آنکھ ان تمام اشیاء کو دیکھ سکتی
ہے۔ اسی لئے تعلیم و معارف کا زیادہ تر انحصار اسی کی تربیت پر ہے اور اس کی تربیت کا
مختلف تصاویر کے مشاہدہ سے وابستہ ہونا محتاجِ بیان نہیں۔

ایک ہی تصویر یا مختلف تصویروں کے مختلف حصے قطع کر کے بچوں کو ترتیب
کے لئے دینا بھی ایک محبوب و مفید مشغلہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً اونٹ کا سر۔ گردن ٹانگیں
اور گھوڑے کے یہی اعضا قطع کر کے اُن کے سامنے رکھ کر انہیں پھر مناسب شکل میں
لانے کا عمل استدلال اور فیصلہ کی تربیت کا موجب ہو سکتا ہے۔ مگر زیادہ فائدہ اس شکل
میں ہے۔ کہ تصویریں گتے وغیرہ کی بنی ہوئی ہوں۔ تصویروں کو سامنے رکھ کر انشاء پردازی
کرنا یا کہانی مرتب کرنا سہولت سے سکھایا جا سکتا ہے۔ یہاں سے بچوں کے مشاہدہ کی قدرت
کا اندازہ بھی بخوبی ہو سکتا ہے۔ ایک ہی تصویر کے کون کون سے پہلو کس بچے کی آنکھ سے
پوشیدہ رہے یا کون کون سی جزئیات ناقابل فہم رہی ہیں۔ ایسی صورت میں امتحان کے
بعد اُستاد کی راہنمائی نہایت سود مند ہوگی۔

یہاں یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ جہاں اصلی اور حقیقی اشیاء موجود ہوں وہاں
تصویروں سے کیوں کام لیا جائے۔ بظاہر تو یہ درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھئے۔
تو معلوم ہوگا کہ تصویر میں اشیاء کی نسبت زیادہ کشش ہوتی ہے۔ ہم ہر روز سرسبز میلان
دیکھتے ہیں۔ ہر روز صبح و شام شفق کا نظارہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ خزاں رسیدہ درخت

رو برو ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان کی صحیح تصویریں ان کے مقابلہ میں کس قدر مرغوب اور دلفریب ہوتی ہیں۔ ہم اکثر اصل نظارہ سے اتنے محظوظ نہیں ہوتے جتنے اس کی نقل سے۔ اس کی وجہ شاید ہمجنس کی صنعت تامہ کے ساتھ نقل کرنے کی خوبی کی داد دینا ہے۔ کیونکہ تخلیق اول تو اس سے منسوب ہوتی ہے۔ جس کا صنّاع اعظم ہونا مسلّم ہے۔ مگر نقلی تخلیق جو کامیابی کے ساتھ ہو وہ انسانی کمال کا مظہر ہوتی ہے۔ اس صورت میں جنسی ہمدردی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

تصویروں کے استعمال میں ضروری احتیاط یہ ہے کہ تصویریں معقول اور مناسب سائز پر ہوں۔ بہت صاف عکس لئے گئے ہوں۔ رنگین ہوں۔ اور چمکدار ہوں۔ چھوٹی اور معمولی کاغذ پر تصویریں صاف نہیں ہوسکتی ہیں۔ ان سے پُورا پُورا فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا اس ترقی کے زمانہ میں بہترین تجویز تو یہ ہے کہ ہر مدرسہ میں بڑی تصویریں مہیا کرکے اُن کی سلائیڈز بنوائی جائیں اور سینما کی صورت میں بچّوں کو دکھائی جائیں۔ اس صورت میں ان کے استعجاب کو مکمل طور پر کام میں لایا جاسکتا ہے۔ حیرت اور اعجوبہ پسندی حصول علم کے لئے زبردست تحریک پیدا کرتی ہیں۔ متحرک اور بولتی ہوئی تصویریں اور بھی سودمند ہوں گی۔

کھیل کے ذریعے تعلیم

عبدالغنی ہمایوں

قدرت نے کھیل کو انسان کی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ نہ صرف انسان بلکہ اُونچے درجے کے حیوانات بھی اس سے مستثنٰے نہیں ہیں۔ آپ نے پالتو جانوروں کے بچّوں کو کلیلیں کرتے دیکھا ہوگا۔ بلّی اور کُتّے کے بچے کھیلیں کرتے دیکھے ہوں گے۔ نہ صرف بچّے بلکہ بڑی عمر کے جانور بھی کھیلوں میں مشغول دیکھے جاتے ہیں۔ کُتّوں کو باہم دگر مصنوعی لڑائی کرتے دیکھنا روزمرّہ زندگی کا ایک عام مشاہدہ ہے۔ مولشیوں کو شام کے وقت واپس گھروں کو آتے ہوئے بلامقصد ادھر اُدھر طرارے بھرتے اکثر دیکھا گیا ہے۔ انسان کے بچّے کو دیکھئے۔ پیدائش کے فوراً بعد جس طبعی چیز کا اظہار وہ کرتا ہے۔ وہ رزق کی تلاش اور کھیل کا مشغلہ ہے۔ پنگوڑے میں لیٹا ہر وقت ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتا رہتا ہے۔ اور عجیب عجیب قسم کی آوازیں نکالتا رہتا ہے جب ذرا بڑا ہوتا ہے اور ارد گرد کی چیزوں کو محسوس کرنا شروع کرتا ہے۔ تو جو چیز بھی اس کے ہاتھ میں آجائے اسی کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس سے ذرا آگے بڑھ کر جب جسم کا توازن قائم کرنا سیکھتا ہے۔ تو آپ ہر وقت اُس کو دوڑنے بھاگنے میں مشغول دیکھیں گے۔

انسان کے کھیل جسمانی قویٰ کی حرکت تک ہی محدود نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے کھیلوں میں دماغی قویٰ کا بھی حصّہ ہوتا ہے۔ اور کھیل اس کے جسمانی و دماغی نشوونما کا قدرتی ذریعہ ہیں۔ کھیل صرف بچوں تک ہی محدود نہیں بلکہ ہر عمر کا آدمی کھیل میں دلچسپی رکھتا ہے۔

علما نے کھیل کے مقصد کے متعلق مختلف نظریات قائم کئے ہیں۔ بعض کے نزدیک کھیل کا مقصد فالتو توانائی کا اخراج ہے۔ بچہ خوراک کھاتا ہے۔ اور اس کا جسم جلد ہی جلدی نشوونما پا رہا ہوتا ہے۔ اس کے جسمانی و دماغی قویٰ میں توانائی جلد جلد بڑھتی ہے۔ لیکن چونکہ ابھی وہ دنیاوی مشاغل میں حصّہ نہیں لے رہا ہوتا اس لئے وہ اس فالتو توانائی کو کھیل کے ذریعے خرچ کرتا ہے۔ بعض کے نزدیک کھیل کے ذریعے بچّہ اپنے آپ کو ان مشاغل کے لئے تیار کرتا ہے۔ جس میں اسے آئندہ زندگی میں حصّہ لینا ہے۔ مثلاً بلّی کے بچّے کے آگے گیند پھینک دیں۔ تو وہ اس پر لپکتا ہے۔ اس کو دلوچ لیتا ہے۔ ہوا میں اُچھالتا ہے۔ پھر لپکتا ہے۔ گویا اس طرح سے وہ چوہوں کا شکار کرنے کی تربیت حاصل کر رہا ہے۔ انسان کا بچّہ باپ کی چھڑی کو گھوڑا تصوّر کر کے اس پر سوار ہو جاتا ہے۔ دو چار لڑکے مِل کر ریل گاڑی بنا لیتے ہیں۔ اور اس کو چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ بچّے مصنوعی کھیت بنا کر ان میں اُنگلی سے ہل چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے اپنے کھیتوں کو پانی دیتے ہیں۔ ان میں فصل بوتے ہیں۔ اور اس طرح کھیل ہی کھیل میں اپنے آپ کو آئندہ زندگی کے مشاغل میں حصّہ لینے کے لئے تیار کرتے ہیں۔ لڑکیاں گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ ان کا بیاہ رچاتی ہیں۔ مٹّی کی روٹیاں پکاتی ہیں۔ اور اس قسم کے تمام کام کرتی ہیں۔ جن سے آئندہ زندگی میں انہیں واسطہ پڑتا ہے۔ یہ کھیل ان کے ذہنی و جسمانی قویٰ کی ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ کسی حیوان کے لئے عملی زندگی میں جس قدر زیادہ ذمہ داریاں اور مشکل مسائل ہیں اسی نسبت سے اس کا بچپن کا زمانہ لمبا ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی میں چونکہ باقی سب حیوانات سے زیادہ پیچیدہ مشاغل سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس کا بچپن کا زمانہ بھی سب سے

لمبا ہوتا ہے۔ بعض علما کا خیال ہے کہ کھیل میں بچہ ارتقا کی ان تمام منازل کو طے کرتا ہے۔ جن میں سے اس کے آبا و اجداد گذرے ہیں۔ اس میں ارتقا کی دماغی اور جسمانی دونوں صورتیں شامل ہیں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ۹ ماہ کے عرصہ کے اندر اندر بچہ جسمانی نشو و نما کے ارتقا کی ان تمام منازل کو طے کرتا ہے۔ جن میں سے گذر کر اس کے آبا و اجداد کو گذرنا پڑا۔ اس کے بعد وہ کھیل کے ذریعے سے ان منازل کو طے کرتا ہے جن میں سے گذر کر اس کے آبا و اجداد تہذیب و تمدن کی موجودہ شکل تک پہنچے۔ ایک اور نظریہ اس سلسلہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ کہ کھیل کے ذریعے سے ہم ان جذبات کا اظہار کرتے ہیں جن کو ہم کسی اور ذریعے سے بروئے کار نہیں لا سکے۔ ایک بچہ سوتیلی ماں کے ناروا سلوک اور شفقتِ مادری کے فقدان کی وجہ سے فرض کر لیتا ہے کہ اس کو ایک اچھی سی ماں مل گئی ہے۔ اور تصوّر میں ہی طرح طرح کی تصویریں بنا کر اپنے جذبات کا اظہار کر لیتا ہے۔ یا ایک غریب آدمی تصوّر میں ہی دولت مند بن جاتا ہے۔ اور کوئی نہ کوئی ایسا ما فوق الادراک ذریعہ فرض کر لیتا ہے۔ جس سے اس کو بے انتہا دولت مل گئی ہے۔ اور اس طرح سے اپنے تصوّر میں ہی خود کو ایک امیر آدمی تصوّر کر لیتا ہے۔ اور امارت کے تعیش سے لطف اندوز ہو لیتا ہے۔ یا ہم سینما میں کوئی المیہ نظارا دیکھ کر رو پڑتے ہیں۔ اور اس طرح سے اپنے کسی ایسے غم کو دُور کر لیتے ہیں۔ جس کا اظہار ہم کسی اور طریقہ سے نہیں کر سکتے۔

بہر حال کھیل ایک فطری امر ہے۔ اور ہماری زندگی کا جزوِ لاینفک کھیل ہر بچے کا پیدائشی حق ہے۔ اور اس حق سے محروم کرنے کے نتائج اچھے نہیں ہوتے۔ نہ صرف یہ کہ اس حق کے چھن جانے سے بچوں کی صحیح نشو و نما نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ان میں قبیح عادات پیدا ہو جاتی ہیں۔ کھیل سے بچے کو فطری رغبت ہوتی ہے۔ اور یہ اس کا ایک طبعی میلان ہے۔ بچہ کھیلنا کسی سے نہیں سیکھتا۔ قدرت خود بخود اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ جب اسے دوسروں کا ادراک نہیں ہوتا۔ تو اپنے ہاتھ پاؤں کو جس طرح چاہتا ہے۔ حرکت دیتا ہے۔ جب وہ اس

دوسرے آگے نکل جاتا ہے۔ تو دوسروں کے ساتھ مل کر کھیلتا ہے۔ ان کھیلوں کے لئے وہ کوئی قانون وضع کر لیتا ہے اور ان قوانین کے دائرہ کے اندر کھیلتا ہے۔ ان کھیلوں کا براہِ راست مقصد فطری میلان کی تسکین کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن بالواسطہ یہ اس کی نشو و نما میں بھی ممد و معاون ثابت ہو رہے ہوتے ہیں۔ اور اس کے صحیح کردار کے آئینہ دار بھی ہوتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کرنا سیکھتا ہے۔ قانون کا احترام اور نظم و ضبط سیکھتا ہے۔ مقابلہ کی روح اس میں پرورش پاتی ہے۔ اور اسی طرح مختلف ذہنی، جسمانی اور اخلاقی صلاحیتیں اس کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ان چیزوں کا اسے شعور نہیں ہوتا۔ کیونکہ کسی عمل میں جب کوئی خاص مقصد مدِ نظر ہو۔ تو وہ کھیل نہیں رہتا۔ دوسرے کھیل وہ کسی پابندی کے ماتحت نہیں کھیلتا۔ کھیل تب ہی کھیل کہلا سکتا ہے۔ جب بچّہ اپنی مرضی سے اس میں حصّہ لے۔ اس کو کوئی کھیلنے کے لئے مجبور نہ کرے۔ جب تک اس کا جی چاہے کھیلتا رہے۔ اور جب اس کی قدرتی خواہش کی تسکین ہو جائے چھوڑ دے۔ کھیل میں اس کے مدِ نظر کوئی مادی فائدہ نہیں ہوتا۔

کھیل اور کام میں مابہ الامتیاز کرنے کے لئے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کھیل وہ ہے جس میں مندرجہ بالا اوصاف پائے جائیں۔ یعنی وہ کام جو کسی مجبوری کے ماتحت نہ کیا جائے۔ جو کسی خاص مقصد کے حصول کی خاطر نہ ہو اور جس میں کام کرنے والے کے لئے دلچسپی کا سامان ہو کھیل ہے۔ اور جو کسی مجبوری کی وجہ سے کیا جائے۔ جس کو کسی خاص مقصد کے پیشِ نظر کیا جائے۔ اور جس میں ہمیں دلچسپی نہ ہو۔ کام ہے۔ مثلاً اگر ہم بچوں کو ہاکی کھیلنے پر مجبور کریں۔ در آں حالیکہ وہ ہاکی کھیلنا نہ چاہتے ہوں۔ تو یہ ان کے لئے کھیل نہیں ہوگا۔ اسی طرح کوئی کام بھی جو مندرجہ بالا شرائط کے ماتحت کیا جاوے۔ کھیل بن جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے۔ کہ جب بچوں کو ہاکی کھیلنے پر مجبور کیا جاوے تو وہ اس سے اس طرح متمتع نہیں ہوتے۔ جیسا انہیں کسی کھیل سے ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کھیل نہیں رہے۔

یہ ایسا ہی ہے۔ جیساکہ ہم کسی آدمی کو اس وقت کسی چیز کے کھانے پر مجبور کریں۔ جب کہ وہ اسے کھانا نہ چاہتا ہو۔ اس وجہ سے کہ اس کے پیٹ میں گنجائش نہیں ہے یا اس وجہ سے کہ اس کو اس چیز کے ساتھ رغبت نہیں۔ اگر وہ مجبوراً وہ چیز کھالے تو ہم یہی کہیں گے کہ اس نے وہ چیز اسی طرح کھائی جس طرح مجبوری کے ماتحت ایک لڑکا ہاکی کھیلا۔ البتہ دونو نے اس فعل میں لطف نہیں اُٹھایا۔ کیونکہ یہ فعل صحیح موقع پر نہیں کیئے گئے۔

میرے نزدیک کھیلنے کی قدرتی خواہش کی تسکین کی خاطر ذہنی یا جسمانی قویٰ کی ورزش کا نام کھیل ہے۔ اور روزمرّہ زندگی کی ضروریات کی خاطر جد و جہد کرنے کا نام کام ہے۔ کھیل اگر مجبوری کے ماتحت کھیلا جاوے۔ تو وہ کھیل ہی ہے۔ لیکن وہ ایسا ہی ہے جیسے سیر ہوئے ہوئے آدمی کو مزید کھانے پر مجبور کیا جاوے۔ اس لئے اگر وہ نفع کی بجائے نقصان کا باعث ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ حکم کے ماتحت کھیلنے والے لڑکے کھیل نہیں رہے۔ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کھیل رہے ہیں۔ نہ ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک بچّہ جو اس مقصد سے چھلانگیں لگا رہا ہے۔ کہ ٹورنامنٹ میں کوئی ممتاز درجہ حاصل کر سکے۔ وہ کھیل نہیں رہا۔ کہا جا سکتا ہے۔ کہ چونکہ اس کے سامنے ٹورنامنٹ میں اوّل آنے کا مقصد ہے۔ اس لئے وہ یہ کام کھیلنے کے قدرتی جذبہ کی تسکین کی خاطر نہیں کر رہا۔ نیز وہ اس وقت بھی چھلانگیں لگاتا جائے گا۔ جب کہ وہ تھک گیا ہے۔ اور اس کے اس جذبہ کی تسکین ہو چکی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اوّل تو جس چیز میں وہ دوسروں سے ممتاز ہونا چاہتا ہے۔ وہ کھیل ہے۔ اور کھیل سمجھ کر ہی وہ اسے کر رہا ہے۔ اس لئے وہ اپنے قدرتی جذبے کو تسکین دے رہا ہے۔ ثانیاً ٹورنامنٹ نے اس کی کھیلنے کی خواہش کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ وہ تکان کو محسوس نہیں کرتا۔ جب تکان اس کی اس بڑھی ہوئی رغبت سے بڑھ جائے گی۔ تو وہ خود بخود کھیل بند کر دے گا۔ یہ بات ایک اور مثال سے واضح ہو جاتی ہے۔ ایک بچّہ سارا دن پڑھتا رہا ہے۔ اور سخت دماغی تکان محسوس کر رہا ہے۔ شام کو اگر اسے شطرنج یا تاش

کھیلنے کے لئے کہا جائے۔ تو وہ اس پر فوراً آمادہ ہو جاتا ہے لیکن پڑھنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ یہ اس لئے کہ تاش یا شطرنج ایک کھیل ہے۔ اور اس سے اسے دلچسپی ہے۔ اس لئے اس دلچسپی کی وجہ سے وہ تھکے ہوئے دماغ کے باوجود اس میں مشغول ہو جاتا ہے۔ گویا ہم کھیل کو کھیل ہی کہیں گے۔ البتہ وہ مفید تب ہی ہو سکتا ہے۔ جب موزوں وقت اور مناسب طریقہ پہ کھیلا جاوے۔ اسی طرح ہم کسی کام کو کھیل نہیں کہہ سکتے۔ خواہ اس میں دلچسپی بھی ہو۔ اس کے کرنے پر ہم مجبور بھی نہ کئے جائیں۔ اور کوئی خاص مقصد بھی مدِ نظر نہ ہو۔ مثلاً ایک آدمی ناول پڑھنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس لئے جب بھی وہ چاہے ناول پڑھنا شروع کر دے۔ اور کوئی خاص مقصد مثلاً امتحان میں پاس ہونا وغیرہ بھی اس کے مدِ نظر نہ ہو۔ تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کھیل رہا ہے۔

سکول میں بچے کی تعلیم کا منتہائے مقصود اس کی ذہنی جسمانی اور اخلاقی تربیت ہے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر ہم مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ہم مختلف راستوں سے ایک معین مقام پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ مقصد ہمارا بچے کو ایک خاص معیار تک لے جانا ہوتا ہے۔ طریقہ چاہے کوئی اختیار کیا جائے۔ ڈاکٹر جب مریض کو کونین پلاتا ہے۔ تو اس کا مقصد دفع مرض ہوتا ہے۔ لیکن کونین کی کڑواہٹ کی وجہ سے مریض اس کو پینے پر رضامند نہیں ہوتا۔ اور اگر جی کڑا کر کے پی بھی جاوے۔ تو بسا اوقات قے کر دیتا ہے۔ لیکن اگر کونین کی گولی پہ شکر چڑھا کر دے دی جائے تو سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی بچ رہتی ہے۔ کام کرنے میں بھی بچے کے ہاتھ پاؤں کی ورزش ہوتی ہے۔ اور کھیل میں بھی۔ لیکن کام کرنے سے وہ گھبراتا ہے اور کھیل میں وہ ایک فرحت محسوس کرتا ہے۔ حالانکہ وہ پسینہ سے شرابور ہوتا ہے۔ اور جب دوڑ دوڑ کر اس کا سانس پھولا ہوا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ چوٹ بھی آ جائے تو پرواہ نہیں کرتا۔ سردی میں آپ بچے کو کہیں کہ بازار سے ذرا دودھ لا دو۔ تو جانے سے گریز کرے گا۔ لیکن اگر اسے معلوم ہو کہ بچے باہر کھیل رہے ہیں۔ تو وہ لحاف کو اٹھا کر پھینک دے گا۔ اور باہر دوڑ

جائے گا۔ فعل دونو صورتوں میں ایک ہے۔ لیکن نوعیت مختلف ہے۔ بات کو بچّے کو پڑھنے کے لئے کہیں۔ کتاب آنکھوں کے سامنے رکھتے ہی نینداس پر غلبہ کرنا شروع کر دے گی۔ لیکن اگر وہ کسی کھیل میں مشغول ہے۔ تو نیند پاس نہیں پھٹکے گی۔ اس لئے کہ کھیل سے اسے رغبت ہے۔ اس میں اسے دلچسپی ہے۔ وہ دلچسپی سردی کی تکلیف اور نیند کے خمار پہ غالب آجاتی ہے۔ بچّے کو ایک نظم یاد کرنے کے لئے کہیں۔ یہ اس کے لئے ایک مصیبت ہوگی۔ لیکن اگر وہ کسی ڈرامہ میں حصّہ لے رہا ہے۔ تو جو پارٹ بھی اسے ادا کرنے کے لئے دیا جاوے اس کو فوراً یاد کرلے گا۔ کیوں ؟ دونو صورتوں میں اسے عبارت کے ایک حصّے کو یاد کرنا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ایک چیز تو وہ آسانی سے کرلیتا ہے۔ لیکن دوسری صورت میں نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اسی کام کو کھیل کی شکل دے دی۔ اب وہ کھیل میں حصّہ لے رہا ہے۔ کھیل میں اسے قدرتی طور پر دلچسپی ہے۔ کھیل بھی بچّے کی تربیت کا ایک ذریعہ ہے۔ اور بہترین ذریعہ۔
بچّے کے مختلف قویٰ کی تربیت کے لئے ہم مختلف طریقے استعمال کرسکتے ہیں۔ لیکن وہی طریقہ زیادہ مفید رہے گا۔ جس سے بچّے کو فطری رغبت ہے۔ بچّے کی تربیت کے لئے ہم نے ایک نصاب مقرر کر رکھا ہے۔ ہم چاہتے ہیں۔ کہ بچّہ حساب کے یہ یہ سوال حل کرے۔ یہ یہ قاعدے سیکھے۔ زبان میں اس معیار تک ترقی کرے۔ تاریخ و جغرافیہ اور سائنس وغیرہ میں فلاں فلاں چیز اس کو بتائی جاوے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اس طریقہ سے ہم اس کی مکمل تربیت کرنا چاہتے ہیں لیکن سوال تو یہ ہے۔ کہ ان تمام چیزوں کو اس کے سامنے کس طرح پیش کیا جاوے۔ اس طرح کہ وہ ان سے بدک جاوے۔ یا اس طرح کہ ان میں اس کے لئے دلچسپی پیدا ہو۔ وہ سکول میں اسی طرح آوے جس طرح کھیل کے میدان میں جاتا ہے۔ یا وہ سکول کو ہوّا سمجھے اور سکول کے نام سے کوسوں دُور بھاگے۔ یقیناً نصاب کو دلچسپ پیرائے میں پیش کرنا زیادہ مفید مطلب ہے۔ پرندوں کو پکڑنے کے لئے شکاری کو دام ہمرنگِ زمین بچھانا پڑتا ہے۔ ہم بھی اگر اسباق پر کھیل کا رنگ چڑھادیں۔ تو بچّے سکول سے مانوس ہوجائینگے

اور شوق سے تعلیم حاصل کریں گے۔ بچّوں کو اس طرح پڑھایا نہ جاوے کہ وہ سمجھیں کہ ہم کھیل رہے ہیں۔ بلکہ ان کو کھلایا اس طرح جاوے کہ جو کچھ ہم پڑھانا چاہتے ہیں وہ پڑھ جاویں۔ بچّہ جب سکول میں آوے۔ تو ہم اس کو ایسی کھیلیں کھلائیں۔ جو اس کی روزمرّہ کھیلوں سے مشابہت رکھتی ہوں۔ اور اس کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں۔ اس کے لئے مغربی مفکرین نے بہت کوشش کی ہے۔ اور ایسے طریقے رائج کئے ہیں۔ جن میں بچّہ کھیل ہی کھیل میں وہ سب کچھ سیکھ جاتا ہے۔ جو ہم اسے سکھانا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بچّوں کا کام سکول میں صرف کھیلنا ہی کھیلنا ہے۔ یا صرف کھیل ہی کھیل میں ہم ان کو مجوزہ معیار تک پہنچا سکتے ہیں اور ان میں پوری اہلیت پیدا کر سکتے ہیں۔ جس کا پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ کھیل کے ذریعے سے تعلیم دینے کا مقصد تعلیم کو دلچسپ بنانا ہے۔ اور اس کو ہماری تعلیمی جدوجہد کا ممد و معاون بنانا مقصود ہے۔ انہیں دنیا میں ہمیشہ کھیلنا ہی نہیں۔ کام بھی کرنا ہے۔ اس لئے سکول میں وہ کام بھی کریں۔ اور کھیلیں بھی۔ کام کا بہت سا حصّہ ہم کھیلوں میں کرا سکتے ہیں۔ اس طرح سے وہی کام دلچسپ بن جائے گا۔ اور بچّے دلچسپی سے اس میں حصّہ لیں گے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ معلّم خود دلچسپی لے۔ اور کھیلوں کو بچّوں میں اس طریقہ سے رائج کرے کہ وہ ان تعلیمی کھیلوں میں اسی دلجمعی کے ساتھ حصّہ لیں جیسا کہ وہ عام طور پر کھیلوں میں حصّہ لیتے ہیں۔ اگر بچّے سکول سے باہر جا کر بھی ہماری تعلیمی کھیلوں میں حصّہ لیں۔ تو ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کھیلیں واقعی ان کے لئے دلچسپی کا باعث ہوئی ہیں۔ ورنہ وہ ایک مجبوری کے ماتحت اس کھیل میں حصّہ لے رہے ہیں۔ اور ہم ایسے آدمی کو خوراک کھلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو اس کے لئے تیار نہیں۔

معلّم کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ ان کھیلوں کو جمع کرتا رہے۔ جو اس جگہ کے بچّے اکثر کھیلتے ہیں۔ پھر وہ غور کرے کہ وہ کس طرح سے انہیں کھیلوں کو تعلیمی کام میں استعمال کر سکتا ہے۔ ان کھیلوں سے بچّے پہلے ہی مانوس ہیں۔ انہی کو ایک نئی شکل میں پیش

کیا جائے گا۔ تو یہ ان کے لئے مزید دلچسپی کا باعث ہوگا۔ اور یہ بدلی ہوئی شکل سکول کے احاطہ تک ہی محدود نہیں رہے گی۔ بلکہ بچّے اپنے گھروں میں بھی وہی کھیل کھیلیں گے اس طرح سے مدرس کے کام میں بہت سہولت پیدا ہو جائے گی۔ اور وہ اپنے مقصد کو زیادہ آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ یہ میدان وسیع ہے۔ اور معلّم اپنی خدا داد استعداد کو بروئے کار لاتے ہوئے بچّوں کے روزمرّہ کے کھیلوں کو تعلیمی رنگ دے کر تعلیم کو دلچسپ بنا سکتا ہے۔

تعلیم کے مقاصد

محمد بشیر

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے ہمارا معاشرہ کچھ ایسے راستوں پر چلتا رہا۔ جو اسے حقیقت سے کہیں دُور لے گیا۔ وہ تمام مسائل جن کا زندگی سے گہرا تعلق تھا۔ اس طریق سے حل کئے جاتے رہے کہ حقیقت سے پردہ نہ اُٹھنے پائے۔

مروّجہ تعلیم کے سطحی اور ناقص ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ مگر یہ کارواں اِس طرح آگے بڑھتا رہا۔ کہ کسی کو اس کے روکنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ جو راہ اس نے اختیار کی۔ وہ اصل منزلِ مقصود سے دُور اور تاریکی کے عمیق گڑھے کی طرف لے جاتی رہی۔ اس نظامِ تعلیم سے جو لوگ زیادہ متاثر ہوتے رہے۔ وہ حقیقت کو بھُول گئے: اور یہ نہ سمجھے کہ خلط ملط سے ہماری سوسائٹی کی بنیادیں مضبوط نہیں۔ بلکہ کھوکھلی ہوتی جارہی ہیں۔ اور یہ بھی نہ سمجھے کہ تعلیم کا مقصد آخر نمائش یا بناوٹ کا فروغ نہیں۔ اس قسم کی تعلیم سے ہماری آئندہ نسلیں گھاٹے میں رہیں گی۔ غیر اقوام نے نمائش کی خواہش بناوٹ کے نئے نئے ڈھنگ ہمارے دماغوں میں کچھ اس طرح بھر دئے۔ کہ ہم حقیقی ذہنی ترقی کو بھُول گئے۔ اور ہم میں کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کی صلاحیت مردہ ہوگئی۔ اور انہی حالات کو دیکھ کر علامہ اقبالؒ نے فرمایا ؎

شکائت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

اب جبکہ پاکستان بن چکا ہے۔ اور مسلمان قوم غیر اقوام کے دبدبہ سے آزاد ہو چکی ہے اگر اب بھی نظامِ تعلیم اسی ڈگر پر چلتا رہا۔ تو یہ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ تمام قوم اور پاکستان کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اس نظام کی تبدیلی کے لئے کوئی ایسی جامع اور ٹھوس سکیم جو اس کی بنیادوں کو نئے سرے سے قائم کرے۔ اور سابق طریقِ تعلیم سے جو زہر ہمارے دل و دماغ میں پیدا ہو چکا ہے۔ اس کے لئے تریاق کا کام دے ہمارے سامنے ضرور ہونی چاہیئے۔ تاکہ ہماری آئندہ نسلیں ہمیں بُرا بھلا نہ کہیں۔ بلکہ ان کے مزاج میں سنجیدگی نظر میں وسعت اور ذہن میں روشنی پیدا ہو۔

آج تک تعلیم کا مقصد صرف یہ لیا جاتا رہا ہے کہ بچے پڑھنا لکھنا سیکھ جائیں سکول اور استاد کا کام صرف یہ ہے۔ کہ وہ بچوں کو پڑھنے لکھنے اور ابتدائی حساب کے مسائل حل کرنے کے قابل بنا دیں۔ مگر میرے خیال میں موجودہ ضروریات اور حالات کے ماتحت یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ اگر مدارس کا کام صرف بچوں میں پڑھنے لکھنے کی قابلیت ہی پیدا کرنا ہے۔ تو اس کا مقصد یہ ہوگا۔ کہ ہمارے بچوں کا صرف ایک حصّہ ہی نشو و نما پا رہا ہے اور باقی تمام حصّوں کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ اسکول ایک ایسی بھٹی ہے جس میں بچوں کو کندن بنایا جاتا ہے۔ بچے کندن اس وقت بنیں گے۔ جب ان کا ہر پہلو نشو و نما پائے گا۔ اور وہ اس زندگی کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ جو انہیں اس دنیا میں گذارنی ہے اور وہ اس کے لئے تب ہی تیار ہوں گے۔ جب انہیں عمر کے لحاظ سے زندگی بسر کرنے کا موقعہ ملے یعنی مقاصد کے لحاظ سے ان کی زندگی پرمعنی اور مشاغل کے اعتبار سے مصروفیت بھری ہو۔ یا ہم اس طرح سے بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ ایک دس سال کی عمر کا بچہ ایسی زندگی گذارے جو ایک دس سال کے بچے کے لئے موزوں ہو۔ اور وہ اپنی زندگی

س وقت ہی موزوں بنا سکتا ہے۔ جب وہ اپنے کسب کیئے ہوئے علم کو استعمال کرنے کی
ہلیت رکھتا ہو۔ اور یہ اہلیت اس وقت ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ جب اُس کی شخصیت کا ہر حصہ
مساوی طور پر ترقی کرے۔ اور شخصیت کا تعلق جسم، دماغ اور رُوح سے ہے۔ ہماری
موجودہ ضروریات ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہیں۔ کہ بچّوں کی تعلیم صحیح طریق سے کی جائے۔
بچّوں کے جسم مضبوط ہوں۔ ان میں چستی پیدا کی جائے۔ جسم اور دماغ کا رشتہ
عمدہ بنایا جائے۔ یہ رشتہ اس وقت ہی عمدہ ہو سکتا ہے۔ جب ورزش اور خوراک کا
خاص خیال رکھا جائے۔

تعلیم کا یہ مقصد ہے کہ بچّے خود سوچنا سیکھیں۔ اور ان میں خود کام کرنے کی عادتیں
پیدا ہو جائیں۔ وہ اچھی اچھی باتوں میں دلچسپی لیں۔ اچھی کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا
ہو۔ وہ اپنے ملک (پاکستان) کی تاریخ۔ اس کی نامور ہستیوں اور ان کے کارناموں میں
دلچسپی لیں۔ زبانِ اردو میں مہارت حاصل کریں۔ تاکہ خیالات کا اظہار صفائی کے ساتھ
کر سکیں۔ نیز بچّوں میں صحیح قوتِ مشاہدہ پیدا ہو۔ کیونکہ یہی علم حاصل کرنے کی بنیاد ہے۔
اور زندگی میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ تمام چیزیں اس وقت ہی پیدا ہو سکتی
ہیں۔ جب معلّمین بچّوں پر خاص توجہ دیں۔ اور تعمیری کام کے ایسے موقعے پیدا کریں کہ بچّے
مصروف رہ سکیں۔ اور فرصت کے وقت کو بھی بطریقِ احسن گذار سکیں۔

روح کا زیادہ تر تعلق چال چلن سے ہے۔ اور مقصد یہ ہے کہ بچّے اپنی خداداد
طاقتوں کو اچھے کاموں میں استعمال کریں۔ اور اپنی ذات اور خواہشات پر قابو پا سکیں
اور نیک کام اس لئے نہ کریں کہ انہیں استاد کا ڈر ہے یا استاد کا حکم ہے۔ بلکہ وہ خود
اس بات کو محسوس کریں۔ کہ یہ ان کا فرض ہے۔

نیز تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے۔ کہ بچّے علم کے مطابق عمل کرنا بھی سیکھیں۔ یعنی اگر
انہیں اخلاقی یا مذہبی تعلیم دی جائے۔ تو جہاں تک بن پڑے ان پر عمل کریں۔ ان تمام

باتوں کا دارو مدار اُستاد کی سیرت۔ چال چلن اور نیک نمونوں پر ہے۔ اگر استاد میں یہ اوصاف ہوں گے۔ تو بچوں میں بھی پیدا ہوں گے۔ ورنہ ناممکن۔

تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے۔ کہ بچے اپنے والدین اور اساتذہ کرام کی عزت کرنا سیکھیں۔ ان میں چھوٹوں سے پیار اور بڑوں کی عزت کرنے کی عادت ہو۔

موجودہ ضروریات کے مطابق تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے۔ کہ بچوں میں امداد باہمی کی ذہنیت پیدا ہو۔ اور ان کو تعاون کا سبق حاصل ہو۔ تاکہ جب وہ اسکول سے فارغ التحصیل ہوکر جائیں تو ان میں یہ عادت پیدا ہو جائے۔ کہ وہ دوسروں کی مدد کیلئے ہمیشہ تیار رہیں۔ وہ دوسرے کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھیں۔ اور دوسرے کی آہ و پکار ان کے کانوں سے ہوا کی طرح نہ گذر جائے۔ وہ ہر مشکل کے سامنے ایک چٹان کی طرح ڈٹ جائیں۔

ان کے علاوہ تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے۔ کہ بچوں میں دلیری۔ صاف دلی۔ سچائی۔ استقلال۔ کفائت شعاری۔ دوسروں کی عزت کرنا۔ محنت کرنا اور اپنے آپ پر ضبط رکھنے کا اعلیٰ نصب العین پیش نظر ہو۔ وہ اپنے انسانی فرائض سے آشنا ہوں۔ اور ہر چیز کی حقیقت پہچان سکیں۔ جہالت اور گمراہی کی تاریکیاں ان پر اثر انداز نہ ہوں۔ ان کی بصیرت کی آنکھیں روشن ہوں۔ نیکی اور بدی۔ حق اور باطل کو اصلی صورت میں دیکھ سکیں۔ علم ان کی عقل کے لئے صیقل کا کام دے۔ ان کے اطوار شائستہ اور اخلاق پسندیدہ بن جائیں۔ ان کے دل و دماغ کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جائیں۔ اور وہ ایک اچھے شہری کی زندگی بسر کر سکیں۔

تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے۔ کہ مدارس میں وہ حالات پیدا کئے جائیں۔ جن سے قوم اصلاح کی طرف قدم اٹھائے۔ اور ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ جس کا معاشرے پر گہرا اثر ہو۔ قوم جمہوریت اور آمریت کے فرق کو اچھی طرح سمجھ سکے۔ قوم اپنے ذہنوں اور

دماغوں سے کام لے کر خود فیصلہ کر سکے۔ اور آمریت کی مطلق العنان حکومت کے اشارہ پر
ناچ کر تباہ نہ ہو۔

اب جبکہ پاکستان بن چکا ہے۔ تو طالب علموں میں وہ قوت اور جذبہ پیدا کرنا چاہیئے
کہ وہ اپنے ملک اور قوم کی خاطر اپنے علم کے پروں سے آسمان پر اُڑ سکیں۔ سمندروں کی عمیق
گہرائیوں میں غوطہ زن ہو سکیں۔ پہاڑوں کے سینوں کو چیر پھاڑ کر مختلف قسم کی معدنیات
نکال لائیں۔ اور صنعت وحرفت کا وہ بازار گرم کریں کہ پاکستان اقتصادی حالت میں بے نیاز
ہو جائے۔ اور اسے کسی غیر ملک کا محتاج نہ ہونا پڑے۔

موجودہ حالات کے ماتحت مدارس میں سائنس اور ریاضی کی تعلیم کو خاص اہمیت
دی جائے۔ کیونکہ ملکی ترقی کا دارومدار ان دو چیزوں پر زیادہ ہے۔ مدارس میں طلبہ کے لئے
ریسرچ ورک (تحقیقی کام) کا خاص انتظام ہونا چاہیئے۔ اور روز بروز اس کو اتنا دلچسپ
بنانے کی کوشش کی جائے۔ کہ طلبہ کا رجحان خود بخود اس کام کی طرف ہو۔ جب طلبہ اہمیں
دلچسپی لینے لگ جائیں گے۔ پاکستان کی بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

موجودہ حالات کے ماتحت تعلیم کا اہم مقصد یہ بھی ہے کہ طلبہ اور قوم کو تعصب
سے پاک رکھا جائے۔ پارٹی بازی سے گریز کیا جائے۔ اور سب اسلام کے ایک جھنڈے
کے نیچے جمع ہو کر اسلام کی حفاظت کریں۔ اور ان میں یہ احساسِ ذمہ واری ہو۔ کہ ہمیں
اُس اسلام کی حفاظت کرنا ہے۔ جس کی خاطر حضرت بلالؓ نے گرم ریت پر گرم سلاخوں کی
مار کی تکلیف کو برداشت کیا۔ ہمیں اسلام کے اس پودے کی حفاظت کرنا ہے۔ جس پودے
کو امام حسین علیہ السلام نے میدانِ کربلا میں اپنے خون سے سینچا۔ ہمیں اس اسلام کی
حفاظت کرنا ہے۔ جس کے لئے پیغمبرؐ خدا نے اذیتیں سہیں۔

پاکستان میں تعلیم نسواں کو خاص اہمیت دی جائے۔ کیونکہ انسانی زندگی کی
بہتری اور کامیابی میں عورت کا اہم حصہ ہے۔ قدرت نے اس جنس میں وہ تمام خوبیاں

اور اوصاف مہیا کر دئے ہیں۔ جن کی مدد کے بغیر انسان کے لئے زندگی کو خوشگوار اور کامیاب بنانا مشکل ہے۔ اگر ان تمام اوصاف اور خوبیوں کو جلا دی جائے۔ اور ان کی ترقی کے لئے صحیح راستوں پر کام کرنے کی کوشش کی جائے۔ تو یقیناً اس سے خوشگوار نتائج ثابت ہوں گے۔ بچہ دن کا زیادہ حصہ اپنی ماں کے پاس رہتا ہے۔ وہ جو اثر اپنی ماں سے قبول کرتا ہے۔ وہ باپ سے نہیں کرتا۔ ابتدائی زندگی کی نشو و نما اگر صحیح طور پر کی جائے اور ان تمام باتوں کا خیال رکھا جائے جو ذہن کی صحیح ابتدائی ترقی کے لئے ضروری ہیں تو انسانی زندگی سطحی اور کھوکھلی ہونے کی بجائے حقیقت کے زیادہ قریب ہوگی۔ اور یہ اس وقت ہی ہوگی جب عورتیں صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ ہوں گی۔

مندرجہ بالا باتیں جو میں عرض کر چکا ہوں۔ اسی وقت ہو سکتی ہیں۔ جب کارپردازانِ محکمہ تعلیم اپنے فرضِ منصبی کو پہچانیں۔ اور ان میں احساسِ ذمہ داری کا جذبہ پیدا ہو۔ حکومتِ پاکستان اس وقت تک کبھی بھی کامیاب اور مضبوط نہ ہوگی۔ جب تک اس اہم کام کی طرف خاص توجہ نہ کی جائے۔ کیونکہ ملکی ترقی کا دارو مدار ہمیشہ تعلیم پہ ہُوا کرتا ہے۔ اور پاکستان ایک ایسا خطہ ہے۔ جس میں صرف ۸ فی صدی لوگ تعلیم یافتہ پائے جاتے ہیں۔ تعلیم کا چرچا اتنا ہونا چاہیئے۔ کہ کوئی آدمی بھی ناخواندہ نہ رہے۔ تعلیم کو پاکستان میں لازمی قرار دینا چاہیئے۔ اور تعلیم بالغان کی طرف خاص دھیان دینا چاہیئے اس سکیم کو دوبارہ بطریقِ احسن اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ چلانا چاہیئے۔ تاکہ ملک کا ہر فرد تعلیم یافتہ نظر آئے۔

قوّتِ ارادی

غلام مصطفیٰ

ماہرینِ علم النفس کے نزدیک قوتِ ارادی۔ عادات اور کیریکٹر ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ یا یوں کہئے کہ قوس و قزح کے لطیف اور گہرے رنگوں کی طرح کچھ اس طرح آپس میں ملے جلے ہیں کہ ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ حد مقرر کرنا بہت مشکل امر ہے۔ مندرجہ بالا نظریئے کو عام فہم پیرایۂ میں پیش کرنے کے لئے اس مضمون پر ذرا تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے قوتِ ارادی کو لیتے ہیں جس کے متعلق ماہرین نے کئی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہم انہیں ذیل میں مختصراً پیش کرتے ہیں۔

(۱) کسی شخص کو ایک ایسے تمسک پر دستخط کرنا ہیں جن کا اس کی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس معاملہ میں جہاں تک محض دستخط کر دینے کا تعلق ہے۔ دستخط کنندہ کا اپنے گذشتہ تجربہ کی بناء پر فقط قلم کو جنبش دینا ہی کافی ہے۔ لیکن معاملہ یہاں تک ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ اپنے قلم کو جنبش دینے سے پہلے اُسے ایک نہایت زبردست ذہنی کشاکش کے مراحل طے کرنا ہیں۔ اس کش مکش میں ایک ہی خواہش کی جھلک نظر آتی ہے

اور آخری نتیجہ پر پہنچنے کے لئے اُسے کئی ایک خواہشوں کے ساتھ دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جو طاقت کہ اسی آخری خواہش کی تکمیل میں کامیاب ہوتی ہے۔ اِسی کا نام ماہرین کے نزدیک قوتِ ارادی ہے۔

(۲) ایک اور مثال لیجے۔ جس میں خواہش کی تخصیص کردی گئی ہے۔ مثلاً ایک لڑکے کے پاس ایک پیسہ ہے۔ جس سے وہ لٹو اور پتنگ دونوں چیزیں ایک ساتھ خریدنا چاہتا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کی قیمت ایک پیسہ ہے۔ لہذا وہ مجبور ہوجاتا ہے۔ کہ ان میں سے کسی ایک چیز کو منتخب کرلے۔ اِسی کش مکش کے دوران میں کبھی اُس کی طبیعت کا رُجحان لٹو کی طرف ہوتا ہے اور کبھی پتنگ کی طرف۔ حتےٰ کہ مؤخرالذکر چیز کو خرید کر اس کی ہوائی پرواز سے لطف اندوز ہونے کا خیال اس پر اس درجہ حاوی ہوجاتا ہے۔ کہ وہ لٹو خریدنے کا سوال ترک کردیتا ہے۔ اِس قطعی فیصلہ کی مختلف منازل طے کرانے والی چیز کا نام ماہرین کے نزدیک قوتِ ارادی ہے۔

(۳) ایک شخص کو شراب نوشی کی لت ہے۔ وہ دُختِ رز کا زر خرید غلام ہے۔ لیکن ایک موقعہ پر منشیات کو ترک کردینے کی خواہش اِس طرح اس پر مسلط ہوجاتی ہے کہ وہ اس کے استعمال سے محترز رہنے کا تہیّہ کرلیتا ہے۔ ایک زبردست جذبہ پر اِس کمزور جذبہ کی عظیم الشان اخلاقی فتح کا نام حقیقی فتح ہے۔ جس کی محرک قوتِ ارادی ہے۔ اصطلاحِ نفسیات میں اِسی اخلاقی فتح کی محرک و ممد جذبہ کا نام جذبۂ ادراک النفس ہے۔ کسی شخص کی قوتِ ارادی اِسی جذبہ کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ جس کی کئی صورتیں ہیں۔

(الف) ایک لڑکا جسے اس سے پیشتر اسکول دیر میں پہنچنے کی پاداش میں سزا مل چکی ہے۔ اسکول آتے وقت راستہ میں کچھ مزدوروں کو کام کرتے دیکھنے لگ جاتا ہے کہ اچانک اسکول کی گھنٹی کی آواز اس کے کانوں میں پڑتی ہے۔ مزدوروں کو کام کرتے دیکھنے میں خواہ اس کی توجہ کسی قدر ہی منہمک کیوں نہ ہو۔ اِس کے دِل میں معاً یہ خیال

پیدا ہوجاتا ہے۔ کہ اگر وہ فوراً نہ چل دے۔ تو اُسے دیر ہوجائے گی۔ عین اسی وقت
بقہ سزایابی کا خیال اُسے بے چین کردیتا ہے۔ لیکن اِس کے باوجود وہ کسی قدر تامل سے
لیتا ہے۔ حتیٰ کہ آخرکار وہ قطعی طور پر فیصلہ کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے "میں پیٹا جانا پسند نہیں کرتا
لئے بہتر ہے کہ ابھی چل دوں"۔ اس موقعہ پر جذبۂ ادراک النفس کو سابقہ سزایابی کے
تھ خاص تعلق ہے۔ اور گھنٹی کی انتہائی ٹن ٹن اور سزایابی کا خوف لڑکے کو آخری
ملہ کرنے پر مجبور کردیتے ہیں۔

(ب) ایک اور لڑکا ہے جو کبھی سکول دیر سے نہیں گیا۔ اور اس لئے اسے سزا بھی
یں ملی۔ لیکن عین اس وقت جب کہ وہ ان مزدوروں کو کام کرتے دیکھنے میں مشغول تھا
ٹی کی انتہائی ٹن ٹن اس کے کانوں میں آتی ہے۔ لڑکا جو پابندئ اوقاتِ مدرسہ کے
سلہ میں انعامی کارڈ حاصل کرنے کا متمنی ہے گھنٹی کی آواز سُن کر فوراً اسکول چل دیتا
۔ اِس مثال میں انعامی کارڈ حاصل کرنے کے خیال کو ذاتی ستائش اور تعریف کے
تھ گہری مناسبت ہے۔ جو آخری فیصلہ کا محرک بن جاتا ہے۔

(ج) جُوں جُوں بچّے کو ستائش اور سرزنش کا احساس زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کا
ۂ ادراک النفس بھی ترقی پکڑتا جاتا ہے۔ وہ گھنٹی کی آواز سُن کر کہتا ہے "ابّا جب سُنیں گے
یں اسکول دیر میں پہنچا تھا۔ تو ناراض ہوں گے"۔ اور اگر وہ اپنے والد کی سرزنش سے خائف
اس کی ستائش کا متمنی ہے۔ تو فوراً اسی مقام سے اسکول کی جانب چل دے گا۔

(د) ایک چوتھا لڑکا اور ہے۔ جو ایک ایسی جماعت کا رُکن ہے۔ جس کے افراد کے
ل میں مجلسی ستائش کا جذبہ موجزن ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ اسکول کی تمام جماعتوں
سے ان کی جماعت اوقاتِ مدرسہ کی پابندی میں سب سے اوّل نمبر پر رہے۔ اس
نہ پر اقتدار کے کھوئے جانے کا خیال اور تمام جماعت کی شہرت کے عدم استقلال پر
ں کے ہم جماعتوں کی ناراضی کا خوف تمام دوسری ترغیبات پر غالب آجاتا ہے۔ اور

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک طالبِ علم کے لئے ایک اعلےٰ درجے کی قوتِ ارادی کی مثال ہے۔

(س) لیکن جذبۂ ادراک النفس کی اس سے بہتر مثال اس لڑکے کی ہو سکتی ہے۔ جس کی اخلاقی فتح سرزنش کے خوف اور ستائیش کے خوش کن جذبہ سے بالکل آزاد اور بے نیاز ہے۔ اور جو "مجھے شرم آنی چاہیئے کہ میں اسکول وقت پر پہنچنے کے فرض کو پسِ پُشت ڈال کر بے فائدہ وقت ضائع کر رہا ہوں" کا خیال پیدا ہونے کے ساتھ اسکول کی طرف چل دیتا ہے۔

اِس موقعہ پر یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ اس قسم کی اخلاقی زندگی مذکورہ بالا کشاکشوں کے ایک لامتناہی سلسلہ کے بغیر میسّر نہیں آسکتی۔ عادات اِس جذبہ کو نہ صرف تقویت ہی دیتی بلکہ ہر موقعہ اور ہر امر میں عام طور پر ایک خاص راہِ عمل مقرر کر دیتی ہیں۔ اور انسان عادتاً اِس راہ پر کاربند ہو کر کشاکشوں کی بندھنوں سے بالکل آزاد اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اِس کی قوتِ ارادی ایک مکمل صورت میں ایک اٹل پہاڑ کی طرح سامنے آکر اُسے بے راہ روی سے روک دیتی ہے۔ حتیٰ کہ بار بار کے تجربے سے عادتاً اِنسان کی فطرت میں داخل ہو کر اس کے کیریکٹر میں کچھ اِس طرح گھُل مِل جاتی ہے۔ گویا اس کا ایک جُزو لاینفک ہے۔ اور پھر اس میں بھی کلام نہیں کہ کیریکٹر قوتِ ارادی اور عادات کی اس پُرسکون۔ غیر محسوس اور غیر مرئی مواصلت اور جذبۂ ادراک النفس کے اِس درجہ ترقی پا جانے میں مذہبی عقائد کو بھی خاص طور پر دخل حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ماہرینِ نفسیات اخلاقی تعلیم کو مذہبی تعلیم سے علیحدہ کرنا نہیں چاہتے۔ اس موقعہ پر یہ بھی ضروری ہے کہ کیریکٹر کے صحیح معنی ذہن نشین کر لئے جائیں۔ کیریکٹر ان تمام رجحانات کا مجموعہ ہے جو کسی فرد میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا اِس کا ماخذ انسان کے وہ فطری اور طبعی رجحانات ہیں جو پیدا ہوتے وقت وہ اپنے ہمراہ لاتا ہے۔ لیکن یہ میلان و رجحانات اِنسان کے تمدنی

اور طبعی ماحول کی وجہ سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ بدلتے رہتے ہیں۔ جیسے کہ انسان کو خاص خاص مواقع اور حالات کے ماتحت ایک خاص طریقۂ کار اور راہِ عمل پر کاربند رہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات کیریکٹر کو عادات کا مجموعہ کہا جاتا ہے۔ مگر یہ حقیقت میں اس سے کچھ زیادہ ہے۔ عادات نام ہیں ہمارے ان افعال و اعمال کا جو خاص خاص مواقع اور خاص خاص حالات کے ماتحت ہماری ذات سے سرزد ہوتے ہیں۔ لیکن ہماری زندگی میں ہمیشہ ایک ہی قسم کے واقعات رونما نہیں ہُوا کرتے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ عادات کے پس منظر میں ایک اور طاقت بھی موجود ہے۔ جو ہر موقعہ اور ہر حالت کے حسب ضرورت ہمارے اعمال و افعال میں مناسب تبدیلی کرتی رہتی ہے۔ ایک نوجوان جو اپنے گھر کی چاردیواری اور کالج میں جماعت کے کمرہ کے اندر رہ کر ایک خاص قسم کی عادات کا عادی ہو چکا ہو۔ جب کالج سے تحصیل علم کے بعد عملی زندگی کے میدان میں قدم رکھتا ہے۔ تو زندگی کے کاروبار کے لئے اپنے مالِ تجارت کو بالکل ناکافی پاتا ہے۔ اور ہم کہتے ہیں۔ کہ وہ عملی زندگی میں ناکام رہا ہے۔ زندگی کوئی بے حس مشین تو ہے نہیں۔ کہ محض ایک ہتھی کے گھماتے رہنے سے خود بخود کامیابی کے ساتھ چلتی رہا کرے!

پس ظاہر ہے کہ کیریکٹر کا انحصار ہے پیدائشی رجحانات اور اجتماعی اور طبعی ماحول پر۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ یہ فطرت اور تربیت کا باہمی معاملہ ہے بعض بچوں کے رجحانات پیدائشی طور پر اس قدر خود غرضانہ اور کمزور ہوتے ہیں کہ وہ اعلےٰ سے اعلےٰ تربیت کے باوجود اعلےٰ درجے کے کیریکٹر کو نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن اس کے برعکس بعض بچے پیدائش ہی سے ایسا ذوقِ سلیم لے کر آتے ہیں۔ کہ ناخوشگوار سے ناخوشگوار ماحول بھی ان پر اثرانداز نہیں ہو سکتا۔ پیدائشی رجحانات اور ماحول کے علاوہ بعض اوقات بچے کی فطری افتادِ مزاج بھی اس کے کیریکٹر پر بہت کچھ اثر ڈالتی ہے۔ ایک خوش باش بچہ پسندیدہ اثرات سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اس کے محاسن کے پہلو کو لے کر اس پر بحث

کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس ایک سست طبیعت بچّہ کے لئے ترغیب و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور وہ بعض اوقات مدرس کے لئے مایوسی کی زندہ تصویر بن جاتا ہے۔

مندرجہ بالا حقائق کو مدّنظر رکھتے ہوئے مدرس کو چاہیئے کہ غایت درجہ حزم و احتیاط سے کام لے۔ ایسا نہ ہو کہ حصولِ ناممکنات کی کوشش میں راستہ سے بھٹک جائے۔ یونانی حکیم ارسطو کے زریں الفاظ ہر وقت اس کے پیشِ نظر رہنے چاہئیں (انسان ایک سیاسی و اجتماعی حیوان ہے) کیا معنی کہ انسان کے تمام افعال کو اس کی اجتماعی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ ایک شخص کے افعال اس وقت تک پسندیدہ نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ پہلے اسے دوسروں کے ساتھ اپنے تعلقات کا صحیح صحیح علم و احساس نہ ہو جائے اور وہ ان سے تاثر پذیر نہ ہونے لگے۔ اس لئے ضروری ہؤا کہ چھوٹے بچّوں کی ذات سے اعلےٰ درجے کے اخلاقی افعال کا سرزد ہونا ایک امرِ محال ہے۔ اور نہ مدرس کو اس کی توقع ہی رکھنا چاہیئے۔ جس کی وجہ یہ ہے۔ کہ بچّہ اپنی اجتماعی زندگی سے بالکل بے بہرہ ہے اور اس لئے اس سے متاثر ہونا اس کے بس کی بات نہیں۔ ایک سہ سالہ بچّے میں سچ بولنے کی عادت پیدا کرنے کی کوشش کرنا ایک تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ اس میں وہ صلاحیت ہی موجود نہیں۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ اس کے ایک دوسرے شخص کے ساتھ تعلقات کی کیا نوعیت ہے۔ ہمیں فرانسیسی فلاسفر کے الفاظ یاد رکھنا چاہئیں "بچّہ کو خودکشی کے نتائج بد سے آگاہ کرنے کی بجائے بہتر ہے۔ کہ اُسے خودکشی کے معانی ہی نہ بتائے جائیں"۔ اسی طرح ایک اعلیٰ بدنی صحت رکھنے والے بچّہ کو جس کی طبیعت کا رجحان بدنی حرکات کی طرف ہے۔ کتابوں کا کیڑا بننے پر مجبور کرنا اس کی فطرت پر ظلم کرنے کے مرادف ہے۔ ہاں صرف اس قدر ضرور ہو سکتا ہے کہ بچّہ کے فطری میلان۔ بدنی صحت۔ افتادِ مزاج اور ماحول کو مدّنظر رکھتے ہوئے اعلیٰ ترین عادات کی بنیاد رکھی جائے۔ جس پر آئندہ اس کے کیریکٹر کی عظیم الشان عمارت بنانا مقصود ہے ۔

ہمارا رسمُ الخط

پی۔ ایل سنگھا

زبان اگر روح ہے تو رسم الخط کو اس کے جسم سے مثال دی جاتی ہے جس طرح رُوح اور جسم کا تعلق عمیق ہے۔ اسی طرح کسی زبان اور رسم الخط کا مکمل اور مناسب اجتماع اور اُس کا امتزاج خصوصی زبان کو زندہ اور بارآور بنانے میں ازبس اہم ہے۔ جُوں ہی زبان کا ذکر آتا ہے۔ ہر شخص کا ذہن ان حروف۔ اشکال اور خطوط کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جو اس زبان کے لئے رائج ہیں۔ انہیں حروف۔ اشکال اور خطوط کے مجموعے کو اس زبان کا خط کہا جاتا ہے۔

ہماری قومی زبان کے لئے کئی رسم الخط تجویز کئے جاتے ہیں۔ ازاں جملہ رومن۔ نستعلیق اور خطِ نسخ کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ رومن کو اس لئے کہ اُس کا سیکھنا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ فوج میں اس کو ایک گونا مقبولیت حاصل ہے۔ پاکستان کے محکمۂ ڈاک اور تار نے بھی اجازت دی ہے کہ پاکستان کے بیرونجات ممالک خصوصاً ہندوستان کو بھیجی جانے والی تاریں رومن رسم الخط میں قبول کی جا سکتی ہیں۔ نسخ کو اس لئے کہ اُس کا ٹائپ

موجود ہے۔ اور نستعلیق کو اس لئے کہ وہ خوش سواد ہے۔ ہر جگہ اس کے خوش نویس دستیاب ہو سکتے ہیں۔ مدّت سے ہمارا یہی دستورالعمل ہے۔ سب سے پہلے جس رسم الخط سے ہماری زبان آشنا ہوئی۔ وہ یہی خط ہے۔ ہماری زبان کی قدیم سے قدیم کتاب اسی رسم الخط میں چھاپی گئی۔ نامہ و پیام کا شروع ہی سے یہی ایک واحد ذریعہ رہا ہے۔ فارسی رسم الخط پر بہت اعتراض کئے جاتے ہیں۔ یہ نامکمل اور ادھورا ہے۔ مبہم اور دشوار ہے مخروطی حروف اور کثرتِ زوایا اس کو اور مشکل بنا دیتے ہیں۔ اُردو میں ایک لفظ کئی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ فارسی خط میں حرکات کا وجود ناپید ہے۔ فارسی خط میں حرکات موجود ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا استعمال ٹھوس وجوہات کے تحت نہیں کیا جاتا۔ فارسی میں حرکات جو دراصل عربی سے لی گئی ہیں نہایت مختصر۔ جامع اور ضروری ہیں۔ یہ تین ہیں۔ زبر۔ زیر۔ پیش۔ جملہ زبان دانوں سے یہ بات مخفی نہیں۔ کہ قدیم آریائی زبانوں میں بھی یہی تین ہی حرکات تھیں۔

اصُولِ صوتیات[1] (Phonology) کے مطابق آوازیں دو طرح کی ہیں۔

(۱) وہ آوازیں جو آلاتِ صوت زبان۔ ہونٹ اور تالو کی مدد سے پیدا کی جاتی ہیں۔

(۲) وہ آوازیں جو زبان اور تالو کی درمیانی خلا میں محض ہوا کی سرسراہٹ سے پیدا ہوتی ہیں۔

پہلی قسم کی آوازوں کو صحیح کہتے ہیں۔ مثلاً جَ۔ دَ۔ مَ وغیرہ۔ دوسری قسم کی بسیط آوازیں حرکات یا اعراب کہلاتی ہیں۔ دوسری قسم کی آوازیں کمزور ہونے کی وجہ سے از خود کوئی مکمل آواز پیدا نہیں کر سکتیں۔ جب تک پہلی قسم کی آوازوں کا سہارا نہ ملے

---

[1] نگار کا ایک پُرانا پرچہ +

گویا ضعیف اور بیمار (علیل) آوازیں ہیں - زبان عربی میں یہ آوازیں مرکب بھی ہو جاتی ہیں - اور اس طرح ترکیب پاکر توانا اور مستقل حروف بن جاتی ہیں - مثلاً زبر یہ اسی قسم کی دوسری آواز سے ترکیب پاکر کھنچ جاتی ہے - اس کھنچی ہوئی اور مرکب آواز کو الف کہتے ہیں - اسی طرح زیر اور پیش جب ایسا کھنچاؤ حاصل کرتے ہیں - تو ان سے ی اور و حروف وجود میں آتے ہیں - انہیں بسیط آوازوں ـَ ـِ ـُ کی ترکیب یافتہ صورت آ - ی - و کو حروف علت کہتے ہیں -

ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے کہ یہ تینوں بسیط حرکات نہیں بلکہ مستقل حروف ہی سمجھے جاتے ہیں - جو دوسرے حروفِ صحیحیہ کی طرح تلفظ میں حرکات کے محتاج ہیں - جَ ایک حرفِ صحیح ہے - جس کا تنہا تلفظ ادا نہیں کیا جاسکتا - جب تک جملہ حرکات میں سے کوئی اس پر نہ ہو - اَ - اِ - اُ بھی دراصل جَ - جِ - جُ کی طرح حروفِ صحیح ہیں - جن کو حرکات سے خوش کیف بنا دیا گیا ہے - کہ تلفظ میں آسانی ہو - ماحصل اس کا یہ ہے کہ اگر یہ حرکات استعمال کی جائیں - تو تمام اعتراض دُور ہو سکتے ہیں - جو فارسی رسم الخط پر کئے جاتے ہیں - لیکن غور کرنا چاہئیے کہ ان حرکات کے استعمال نہ کرنے میں بڑے فائدے ہیں - انہیں فوائد کے پیشِ نظر ان حرکات کو ہمارے رسم الخط میں ترک کر دیا گیا ہے - اب ہم رومن - نسخ اور نستعلیق رسم الخط کا جائزہ لیں گے - اور دیکھیں گے - کہ کون سے رسم الخط کے اختیار کرنے میں ہمارے لئے زیادہ آسانیاں ہیں -

اگر ہم نظرِ غائر سے دیکھیں تو رومن کا پُرانا رسم الخط موجودہ رسم الخط سے زیادہ جامع اور مکمل تھا - پہلے ع - ش - خ - غ - ڈ - ٹ اور پھ کے لئے Ḍ—Ģ—Ḳ—Ṣ—Ạ
P—Ṭ کے نیچے ایک نقطہ (.) لگایا جاتا تھا - حالانکہ اب اس کے بالکل برعکس ہے - منجملہ اور خوبیوں کے اگر اس قسم کی اصلاح رومن رسم الخط میں کی جائے تو ہمارے لئے ضرور کچھ نہ کچھ آسانیاں پیدا ہو جائیں گی - لیکن یہ آسانیاں دشواریوں کے مقابلہ میں اتنی آسان نہ ہونگی -

ن پر ہم کاربند ہوسکیں۔

مندرجہ الفاظ کو اعراب کا قائم مقام بنایا جاتا ہے:۔

زبر - زیر - پیش - آ - اے - ای - اَے - او - اُو

oo o ae ee ai aa u i a

پُرانے رسم الخط میں ان کو زیادہ آسان بنایا گیا تھا۔ آ - ای - اُو کے لئے ۔اَ - اِ - اُ کے اُوپر ایک آڑی لکیر (ـ) لگائی جاتی تھی۔ اے، اور اَے کے لئے اور ai مستعمل تھے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ صورت سے پہلی زیادہ سلجھی اور منجھی ئی تھی۔

رومن رسم الخط میں یہ ضرور آسانی ہے کہ ہاتھ بلا روک ٹوک ایک ہی جست میں ۔ایک لفظ کو لکھ سکتا ہے۔ لیکن وقت اور کاغذ ہمیشہ اس پر زیادہ خرچ ہوتا ہے مثلاً نا ظ (مولوی) Maulavi اور (مشقّت) Mashaqqat فارسی رسم الخط میں لکھے ائیں۔ تو زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے۔ فارسی رسم الخط کے لکھنے والا جلدی لکھے گا اور غذ بھی کم خرچ ہوگا۔ اور رومن لکھنے والا کاغذ بھی زیادہ خرچے گا۔ اور قلم بھی دیر ہی میں ٹھائے گا۔

اگر رومن میں آڑی لکیریں (ـ) یا نقطے (.) لگائے جائیں تو ہماری مشکلات ں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ ہر لفظ لکھنے کے بعد دوبارہ سوچنا پڑے گا۔ کہ ان یروں اور نقطوں کی کہاں کہاں ضرورت ہے۔ اور اگر لکھتے وقت بار بار ہاتھ ٹھا کر یہ لکیریں اور نقطے لگائے جائیں۔ تو لکھنے میں جو روانی ہے وہ عنقا ہوجائیگی لون کے علاوہ الفاظ میں شکست واقع ہوجائے گی۔ جو تحریر کو بھی بھدّا کردے گی ر ذہنی ارتسام پر بھی ایک ذہول واقع ہونے کا احتمال ہے۔

فارسی رسم الخط کے خلاف رومن میں ہر اسم معرفہ کا پہلا حرف انگریزی کی تقلید

میں بڑا تحریر کرنا پڑتا ہے۔ جو لکھنے کی روانی میں بار بار سدِّ سکندری معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر رومن رسم الخط میں بھی قطعاً یکسانیت نہیں۔ لفظ سپاہی Sepay Sipaahee اور Sipáhi تین طرح لکھا جاتا ہے۔ اسی قسم کے اور سینکڑوں الفاظ میں تفاوت نظر آئے گا۔

نستعلیق میں ہم عموماً اعراب استعمال نہیں کرتے۔ اس لئے اس خط کو مشکل بتایا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ صحت تلفظ کا کوئی معیار مقرر نہیں۔ جس سے ہم اس مشکل کو حل کر سکیں جو ہمارے موجودہ رسم الخط میں آپڑی ہے۔ زبان اور خط کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک زباندان ہی دراصل رسم الخط کا استعمال کرتا ہے۔ اور پڑھنے والا بھی زبان دان ہی ہوتا ہے۔ پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جو ایک زبان دان بولتا ہے اس کو دوسرا زبان دان پڑھنے میں غلطی کرے۔ فارسی کا مشہور مقولہ ہے۔ عاقلاں پیرو لفظ نہ شوند۔ کیا یہ سمجھنا چاہیئے کہ پڑھنے والے سرے ہی سے احمق ہیں۔ کہ جب تک حروف پر حرکات نہ ہوں وہ پڑھ ہی نہیں سکتے۔ اگر اُردو میں کوئی اصول صحتِ تلفّظ کا مقرر نہیں تو عربی میں جو اصول مقرر کئے گئے ہیں۔ وہ مبتدی کے لئے کیا کچھ کم دِقّت طلب ہیں۔ زبان عربی کے لئے تو وہ اصول رہیں گے ہی۔ لیکن اُردو پر ان اصولوں کا لاگو کرنا مبتدی کے لئے ہرگز کم وزن نہیں ہے۔ مانا کہ اُردو پڑھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یہ اس کے رسم الخط کے ترک کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں۔ کیا عربی اور سنسکرت کی سی پُرانی زبانوں کی مشکلات اس سے کہیں زیادہ نہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کو ترک کیا جائے ہرگز نہیں جس طرز میں زود نویسی نہیں وہ موجودہ کاروباری ہنگامہ آرائیوں کی ہمرکاب نہیں ہو سکتی اس لحاظ سے بھی ہمارا موجودہ رسم الخط ضرور موزوں ہے۔ کیا بار بار اعراب کی نشیب و فراز زود نویسی میں حائل نہیں ہوا کرتی۔

کائنات کا مطالعہ کیجے۔ ہر چیز ترکیب پاکر اپنی اصلی شکل بدلنے پر مجبور ہے۔ کائنات

کی جملہ رنگینیاں اور رعنائیاں اسی ترکیب کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔ وصل وفصل کی اس معجزانہ ترکیب سے الفاظ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ انہیں علامات کی ملاوٹ سے عبارت ترکیب پاتی ہے۔ یقیناً وہی طرزِ تحریر سائینٹیفک ہو سکتا ہے جس میں وصل وفصل کے قاعدے قانونِ قدرت کے عین مطابق ہوں۔ ظاہر ہے۔ اُردو رسم الخط میں حروف کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے جس سے حروف کی پوری شکل قائم نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو پڑھنا دشوار ہے۔

ایک اور عجیب اعتراض فارسی حروف پر کیا جاتا ہے۔ کہ ترکیب کی حالت میں جو آواز حروف کی ہوتی ہے۔ مفرد حالت میں وہ آواز نہیں ہوتی۔ مثلاً بَ کو بے اور جَ کو جیم کہتے ہیں۔ جب یہ دونوں حروف دوسرے حروف سے ترکیب پاتے ہیں۔ تو اس وقت ان کی پوری آواز ادا نہیں ہوتی۔ بادام اور حجم میں یہ دونوں حروف ہیں۔ لیکن ان کو بے ادام یا جیمجیم کوئی نہیں پڑھتا۔ یہ اعتراض دو وجہ سے بے معنی ہے۔ اوّل یہ حروف تہجی سے متعلق نہیں۔ بلکہ ان کے ناموں سے متعلق ہے۔ دوسرا یہ کہ ان ناموں کا پہلا حرف وہی ہے۔ جن کا وہ نام ہے۔ اور انہیں حروف سے ان کی آواز نکلتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کے نام کیوں رکھے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تنہا حرف کا تلفظ نہیں ہو سکتا جب تک اس کو متحرک نہ کیا جائے اور چند اور حروف کو ملا کر اس کو کوئی نام نہ دیا جائے اُردو میں کچھ حروف متحرک کر کے پڑھے جاتے ہیں۔ جیسے تَ۔ جَ وغیرہ ان کو ملفوظی کہتے ہیں۔ اور کچھ اَور نام رکھ دئے گئے ہیں۔ ان کو مکتوبی کہتے ہیں۔ یہ محض گرائمر کی موشگافیاں ہیں۔ ورنہ بچوں کو اَ۔ بَ۔ تَ۔ صَ پڑھانے اور تلفظ کرانے میں بہت آسانیاں ہیں۔

اب رہا ٹائپ کا مسئلہ۔ جس بھی کسی رسم الخط میں ٹائپ کا رواج ہے اس میں بھی ٹائپ اور ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط اور مراسلات میں بعد المشرقین ہے۔ سو اگر

ہمارا ٹائپ (خواہ کسی طرز کا ہو) اس نستعلیق سے بھی نہیں۔ جو عام کاروبار میں مستعمل ہے اور نہ ہی اس سے ہم کو چنداں مغائرت ہوگی۔ کیونکہ ہم پہلے بھی ٹائپ پڑھتے ہیں۔ البتہ موجودہ ٹائپ اصلاح طلب ضرور ہے۔ بعد اصلاح کے اس میں ہمارے لئے بہت آسانیاں پیدا ہونے کے امکانات ہیں۔ بشرطیکہ ارباب حل وعقد اس کے لئے ایک ٹھوس لائحہ عمل مرتب کریں ؂

نوٹ ۔ مدیر کا مضمون نگار کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ رسم الخط کے متعلق آموزش میں مضامین کا ایک دلچسپ مذاکرہ کی خاطر شائع کئے جا رہے ہیں تاکہ مخالف و موافق دلائل سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہو ؂ (مدیر)

دیمک (سوی) کی روک تھام

دیمک (سوی) عموماً پودوں اور درختوں۔ مکانات یا لکڑی وغیرہ کے سٹور کو نقصان پہنچاتی ہے۔ اس کی روک تھام کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کرنی لازمی ہیں۔ کیونکہ نقصان شروع ہو جانے کے بعد روک تھام میں مقابلتاً زیادہ محنت اور روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

پودوں اور درختوں کے لئے بیج وغیرہ لگانے سے پہلے زمین کو ہر قسم کے ملبہ سے صاف کر دینا چاہیئے۔ پنیری کی زمین کے اردگرد ایک گہری نالی کھودنے سے دیمک کا اندیشہ بہت کم ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ پنیری کا رقبہ کم ہو۔ اور نالی آسانی سے کھودی جا سکے۔ قلموں کو دیمک عام طور پر اُسی حالت میں لگتی ہے۔ جب کہ ان پر کوئی زخم وغیرہ آجائے۔ یا وہ لگانے سے پہلے خشک ہو جائیں۔ اگر قلمیں لگانے سے ایک دن پہلے ۵ فی صدی لیڈ آرسینیٹ (Lead arsenate) پانی میں حل کر کے یا ۲ فی صدی پیرس گرین (Paris Green) اور ۴ فی صدی چونا پانی میں ملاکر

اس میں ڈبولیا جاوے۔ تو قلم کے پھوٹنے تک نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔ چونکہ دونو دوائیاں زہریلی ہیں۔ اس لئے بوقت استعمال احتیاط نہایت ضروری ہے۔ بجائی والے پٹوں پر بیج بونے سے پہلے راکھ ڈال دینے سے بھی نقصان کم ہوجاتا ہے۔

اگر نیری یا قلموں کو دیمک لگنی شروع ہوجائے۔ تو پانی دینے سے نقصان بہت کم ہوجاتا ہے۔ چلتی کھال میں کروڈ آئل املشن (Crude oil emulsion) پانچ سیر فی ایکڑ کے حساب سے کپڑے یا بوری میں باندھ کر لٹکائے رکھنے سے نقصان رُک جاتا ہے۔ اسی طرح آک کا گٹھا باندھ کر پانی کی چلتی کھال میں رکھنا بڑا مفید ہے۔ حسب ضرورت گوڈی سے بھی کافی فائدہ ہوتا ہے۔ حُقّے کا پانی پودوں کو ڈالنے سے دیمک بالکل دُور ہوجاتی ہے۔ تمباکو کا پانی بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ آدھ سیر کے قریب تمباکو ایک بڑے برتن میں رات بھر بھگو رکھنے سے جو پانی نکلے بیس پودوں کے لئے کافی ہے۔ حُقّے یا تمباکو کا پانی یوکلپٹس وغیرہ کے پودوں کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ قیمتی یا علیٰحدہ علیٰحدہ پودوں کے لئے ایک حصّہ لیڈ آرسینیٹ پوڈر اور ایک سو پچاس سے دو صد حصّہ پانی ملا کر آبپاشی کے لئے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ نیز کول تار اور استعمال شدہ کروڈ آئل ویسٹ (Crude oil waste) پودوں کے تنوں کے گرد زمین سے دو اِنچ اُوپر تک لگا دینے سے دیمک نہیں لگتی۔ اِن سے بھی سستی دوائیاں ذیل میں دی ہوئی ہیں۔ جن کا استعمال بھی کول تار کی طرح ہوگا:-

۱- Sluage from oil tanks. سلج فرام آئل ٹینک۔

۲- Railway furnace oil. ریلوے فرنیس آئل۔

۳- Jaimir No. 2 جیمر نمبر ۲۔

یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ طاقتور پودوں کو دیمک نقصان نہیں پہنچاتی۔ اس لئے پودوں کی بروقت کاشت، آبپاشی، کھاد و گوڈی وغیرہ سے دیمک کا نقصان

بہت کم رہتا ہے۔

مکانات کو دیمک سے بچانے کے لئے لکڑی اور زمین کے درمیان حسبِ ضرورت دو انچ موٹی سیمنٹ کنکریٹ کی تہ دینی چاہیئے۔ یہ تہ دیواروں اور فرش سب میں لگاتار ایک ہی ہونی چاہیئے۔ اس سے زمین سے سِیل بھی مکان میں نہیں آئے گی۔ باہر کی طرف اگر جستی چادر کی ایک خاص طرز کی بنی ہوئی پٹی استعمال کی جائے تو دیمک کا زمین سے فرش کے اُوپر پہنچنے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ کیونکہ پٹی کے باہر کا دو انچ چوڑا حصّہ نیچے کو مُڑا ہوتا ہے۔ اور دیمک اس کے اُوپر نہیں گھوم سکتی۔ دیکھئے نمونہ اشکال نمبر ۱، ۲۔

شکل نمبر (۱) دیوار اور فرش کے درمیان جوڑ
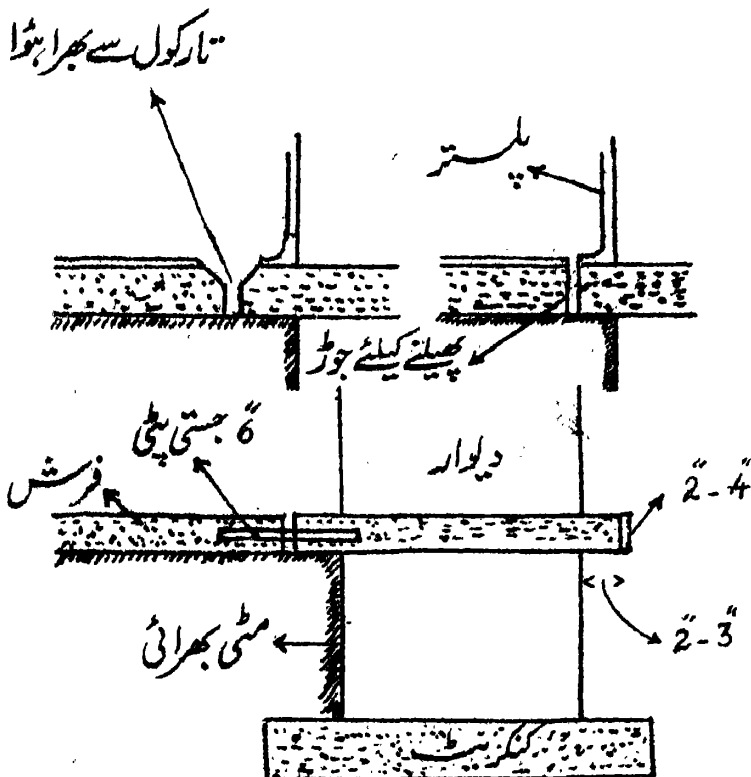
شکل نمبر (۲) جستی پٹی کا استعمال
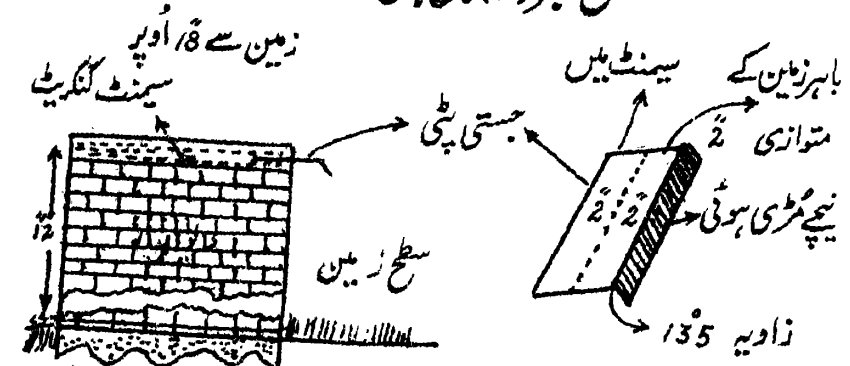
اسی طرح لکڑی کا تھم کھڑا کرنے کے لئے اور پل وغیرہ پر لکڑی کے شہتیر
ڈالنے کا طریقہ شکل نمبر ۳ میں دیکھئے۔

شکل نمبر ۳
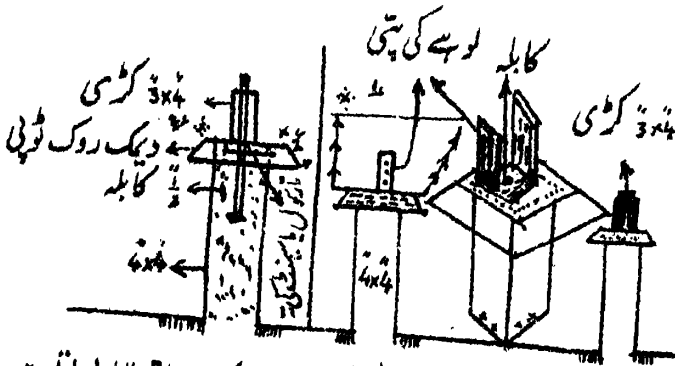
(نوٹ) *. استعمال سے پہلے پتی و ٹوپی کو اچھی طرح ایک ساتھ ملا لیا جاتا ہے۔
اگر ہو سکے تو ایسی لکڑی استعمال کرنی چاہیئے جس کو دیمک کم نقصان دیتی ہے مثلاً دیار۔
کالی شیشم۔ کیکر۔ ڈیک۔ جل (وَن) وغیرہ۔ اِسکے علاوہ لکڑی کو تین دفعہ تارکول کر نیسے بھی دیمک نہیں لگتی۔
عمارتی لکڑی کا سٹور خاص طور پر صاف ہونا چاہیئے شہتیروں کے درمیان ہوا گزرنے
کے لئے جگہ ہونی چاہیئے۔ ان کے نیچے زمین پر ٹیک دینے کے لئے پکے سیمنٹ کے تھڑے
ہونے چاہئیں۔ یا کچے تھڑے اچھی طرح کر و ڈ آئل وغیرہ سے گیلے کرکے سُوکھا لئے جائیں۔
مزید تفصیلات دفتر ڈویژنل آفیسر محکمہ جنگلات میانوالی ڈویژن سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔
(محکمہ جنگلات مغربی پنجاب)

درخت لگاؤ

درختوں کی اہمیت عمارتی لکڑی وایندھن کی نایابی سے بخوبی ظاہر ہے۔ شیشم (ٹاہلی) کیکر۔ سرس (شریینہ) ڈریک۔ ولائتی کیکر۔ بیری۔ فراش (کھگل) و دیسی جنڈ ہمارے ملک کے سب سے عام اور مفید درخت ہیں۔ میانوالی۔ مظفرگڑھ و خوشاب تھل کے علاقے کے لئے یہ درخت بڑے موزوں ہیں۔ خصوصاً فراش۔ بیری اور شریینہ میانوالی تھل میں اور کیکر و شریینہ خوشاب تھل میں نہایت آسانی سے اُگائے جاسکتے ہیں۔ ریتیلے علاقہ میں فراش (کھگل) کیکر۔ شریینہ۔ شیشم۔ بیری اور ڈریک کے درخت اُگانے چاہئیں۔ ان کے ساتھ اگر سرکانہ پھلاہی۔ ولائتی کیکر۔ بیری باڑ کی شکل میں لگائے جائیں۔ تو ایسی باڑیں آندھی کی رفتار کم کرتی ہیں۔ اور ریت کو اُڑنے سے روکتی ہے۔ سڑکوں اور نہروں کے دونو طرف۔ کنوؤں۔ گاؤں اور ڈھوک کے ساتھ شریینہ و شیشم سائے کے لئے خاص طور پر مفید ہیں۔ دیسی کیکر کی لکڑی آلاتِ کشاورزی کے لئے نہایت کارآمد ہے۔ لہٰذا ہر کسان کی زمین میں کیکر کے بھی کافی درخت ہونے چاہئیں۔ کیکر ڈھوک کے نزدیک ایک کیارہ میں لگانا چاہیئے۔ تاکہ فصل کو زیادہ نقصان نہ دے سکے۔

درخت بیج یا پنیری سے بنائی ہوئی قلموں سے لگائے جاتے ہیں۔ بیج فراہمی کا موسم اور موزوں طریقہ کاشت وغیرہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

قسم درخت	موسم بیج فراہمی	مقدار بیج فی ایکڑ برائے پنیری	موزوں طریقہ کاشت بیج سے یا قلموں سے	موسم کاشت		
				بیج بونا برائے پنیری	بیج بونا برائے درخت	قلموں کا لگانا
شیشم	دسمبر تا جنوری	۲ من	قلموں سے	فروری تا اپریل	—	جولائی تا اگست
دیسی کیکر	مئی تا جون	—	بیج سے	—	فروری تا اگست	—
شرینہ	دسمبر تا فروری	۱ من	دونوں سے	فروری تا اپریل	ایضاً	فروری تا اگست
ڈریک	ایضاً	۴ من	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
ولائتی کیکر	مئی و جون	۱ من	ایضاً	۱۵ جولائی تا اگست	۱۵ جولائی تا اگست	فروری تا اگست
بیری	مارچ و اپریل	—	بیج سے	—	فروری تا اگست	—
فراش	—	—	ٹہنیوں کی قلموں سے	—	—	فروری تا اگست
دیسی جنڈ	جون تا اگست	۱ من	بیج سے	—	مارچ تا اگست	—
پھلاہی	نومبر تا جنوری	۱ من	بیج سے	—	فروری تا جولائی	—

نوٹ:۔ بجائی یا قلموں کی کاشت جتنی بھی موسم کے شروع میں ہو سکے۔ بہتر ہے خصوصاً تھل کے علاقہ میں درخت لگانے کا پروگرام مارچ کے آخیر تک مکمل ہو جانا چاہیئے۔

شیشم یا شرینہ وغیرہ کی پنیری لگانے کے لئے پانچ فٹ کے فاصلے پر کڈال جتنی چوڑی (۱۲) اور (۹) گہری نالیاں زرخیز ہموار زمین کے ٹکڑہ میں بنانی چاہئیں۔ جہاں کہ آبپاشی کا پانی آسانی سے مہیا ہو سکے۔ نالیوں کے دونوں طرف زمین کو نرم کر کے ایک انچ گہری لکیر سی بنا کر اس میں بیج ڈال دینا چاہیئے۔ اس کے اوپر باریک مٹی کی ½ انچ موٹی تہ ڈال دینی چاہیئے۔ بجائی کے بعد فوراً پانی دے دیا جاتا ہے۔ پانی دیتے وقت یہ خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ کہ پانی نالیوں میں ہی رہے۔ اور بیج کے اوپر نہ چڑھے۔ بلکہ بیج کو نمی ریزش سے پہنچے ۔

اگر پانی بیج پر چڑھ جائے۔ تو بجائی دوبارہ کرنی پڑے گی۔ پودے دو تین انچ بڑے ہونے تک پانی ہر وقت نالیوں میں کھڑا رہنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہفتہ میں دو دفعہ پانی دینا کافی ہے پودوں کو حسب ضرورت گوڈی دینی ضروری ہے +

نوٹ :۔ پھُلاہی کو اُگانے کا طریقہ بھی یہی ہے +

شیشم۔ شرینہ و ولائیتی کیکر وغیرہ کی قلمیں چھوٹے پودوں سے بنائی جاتی ہیں قلمیں بنانے کا طریقہ ذیل میں دیکھئے۔

نوٹ :۔ اشکال صفحہ ۵۸ پر دیکھیں +

(ا) ریتلی زمین کے لئے (۲۴ انچ لمبی قلم)

(ب) پکی زمین کے لئے مثلاً خوشاب کے نزدیک کا علاقہ (۱۲۔ انچ لمبی قلم)

ہدایات

(۱) صاف کٹ۔ لکڑی اور چھلکا پھٹے نہیں۔

(۲) شاخیں بغیر زخم کے صاف کر دینی چاہئیں۔

(۳) چھوٹی جڑیں صفائی سے کاٹ دینی چاہئیں۔

(۴) صاف کٹ چھلکے کو نقصان نہ پہنچے۔

(۵) موٹائی ہاتھ کی چھوٹی اُنگلی سے انگوٹھے کی موٹائی تک نہایت موزوں ہے۔ قلم لگانے کے لئے اس کی لمبائی کے مطابق گڑھا کھود کر اس میں قلم نصب کر کے خلا کو مٹی سے بھر کر خوب دبا دینا چاہیئے۔ تاکہ قلم کے اردگرد خلا بالکل نہ رہے۔ پہلے چند روز قلموں کو روزانہ پانی دینا ہو جب قلمیں پھوٹ پڑیں۔ تو ایک یا دو دن کے وقفہ کے بعد پانی دیا جاوے۔ اور آہستہ آہستہ پانی دینے کا وقفہ بڑھا دیا جائے۔ اگر قلمیں پانی کے کھال پر لگائی جائیں۔ تو پھوٹنے کے بعد پانی دینے کی ضرورت نہ ہو گی۔

شرینہ۔ ڈریک۔ ولائیتی و دیسی کیکر۔ دیسی جنڈ و بیری وغیرہ کا بیج لگانے کیلئے

۱×۱ فٹ کا پٹہ (کیاری) تیار کر کے ہر ایک میں تین چار بیج لگا دینے چاہئیں۔ بیج کو بونے سے پہلے ۴۸ گھنٹہ پانی میں بھگونا چاہیئے۔ تاکہ بیج اچھا پھوٹے۔ بیج پھوٹنے تک بجائی کردہ پٹوں کو روزانہ پانی دینا ہوگا۔ اس کے بعد ہفتہ میں دو دفعہ۔ حتیٰ کہ پودے کافی بڑے ہو جائیں۔ جب کہ انہیں پانی دینے کی ضرورت بہت کم ہو گی۔ بیج یا قلم اگر رقبے کی ڈھلان کی طرف ایک نالی کے ساتھ لگائے جائیں تو پانی دینے میں کافی کفایت ہو سکتی ہے۔ فراش (کھگل) ٹہنیوں کی ۱۶ اِنچ لمبی قلمیں بنا کر ان سے آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایسی قلم کو لگاتے وقت دو تہائی زمین میں گاڑ دینا چاہیئے۔

سرکانہ لگانے کے لئے پُرانے جھاڑ کو قریباً ۹ انچ لمبی جڑوں سمیت اکھاڑ کر چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم کر لینا چاہیئے۔ ہر ایک حصّے کو علیحدہ علیحدہ لگانے سے نیا جھاڑ بن جائے گا۔ (بڑے بڑے جھاڑ کو اُوپر سے ۹ انچ اُونچائی پر پہلے کاٹ لینا چاہیئے۔ دیکھئے نمونہ شکل (د)۔ اگر بارش والے دن سرکانہ لگا دیا جائے۔ تو بہت اچھا ہے۔ ورنہ تھوڑے عرصہ کے لئے پانی دینا ضروری ہے۔ تاکہ جڑیں لگ جائیں۔

زمینداروں کو ہر مستطیل کے شمالی و مشرقی حد کے ساتھ ۱۵ سے ۲۰ فٹ کے فاصلے پر درخت لگانے چاہئیں۔ اور ان کے درمیان سرکانہ وغیرہ کے جھاڑ لگانے چاہئیں۔ تاکہ آندھی اور ریت کے خلاف دیوار کا کام دے دیں۔

دیمک کی روک تھام کے لئے سب سے بہتر علاج مناسب اوقات پر آبپاشی ہے۔ نیز اگر ہو سکے تو تھتے کے پانی کے استعمال سے اور آک کے پودے یا کرڈ آئیل Crude oil. (پوری میں باندھ کر) کو آبپاشی کرتے وقت چلتی کھال میں رکھنے سے نقصان بہت حد تک کم ہو جاتا ہے۔ قلمیں و بیج وغیرہ معمولی قیمت پر محکمہ جنگلات سے مل سکتی ہیں۔

مزید حالات دفتر ڈویژنل آفیسر محکمہ جنگلات میانوالی ڈویژن سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

(محکمہ جنگلات مغربی پنجاب)
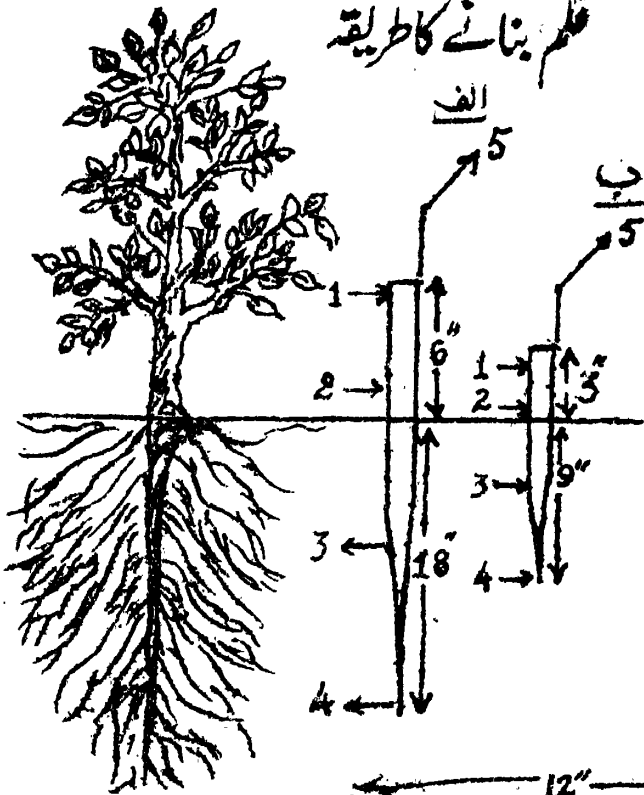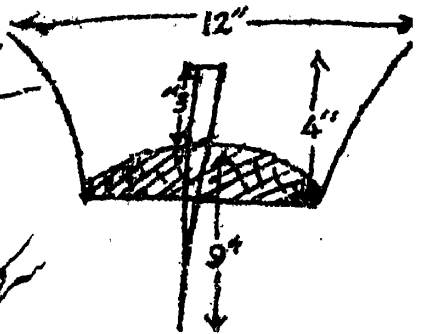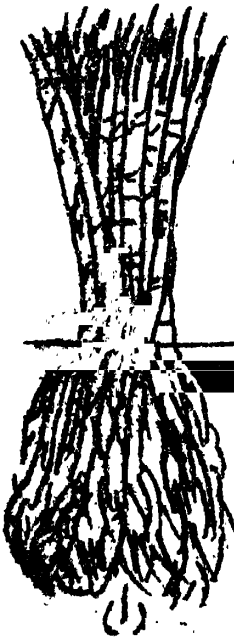
قلم بنانے کا طریقہ
الف
5
1
2
6"
3
18"
4
ب
5
1
2
3"
3
9"
4
12"
قلم لگانے کا طریقہ
3"
4"
9"
سرکانہ لگانے کا طریقہ
سطح زمین
(۱)
(۲)
(۳)

اصطلاحی غور و فکر

(۱)

اصطلاحات

121. Convocation.

اجتماع، طلبی برائے اسناد، جلسۂ اسناد، جلسۂ جامعہ، جامعی اجلاس، اجتماع جامع، بلاوا، مجلسِ اسناد، جلسہ دستاربندی، جلسہ تقسیم سندات، اجتماع عام ہے۔ اور اس سے Convocation میں جو تقسیم اسناد کی غرض ہے۔ وہ ظاہر نہیں۔ "طلبی برائے اسناد" میں اجلاس کی صورت واضح نہیں۔ "جامعی اجلاس" اور "اجتماع جامع" میں بھی "تقسیم اسناد" کا مفہوم نہیں پایا جاتا۔ "بلاوا" بھونڈا اور یہاں بے معنی ہے۔ "مجلسِ اسناد" میں "مجلس" کے لفظ سے اجلاس کی سی اہمیت قائم نہیں ہوتی۔ "جلسہ دستاربندی" اُن مدارس اور جامعوں کے اجلاس تقسیم اسناد کے لئے موزوں ہے۔ جہاں فضیلت کی سند دینے کے ساتھ سر پر علامتِ فضیلت کے طور پر دستارِ فضیلت بھی باندھی جاتی ہے۔ اسلامی مدارس میں یہ چیز اکثر رائج ہے۔ اور وہاں کے جلسۂ تقسیم اسناد کے لئے "جلسۂ دستاربندی" کی اصطلاح موزوں ہے۔ اور ہماری عام یونیورسٹیوں کے "Convocation" کے لئے جہاں دستار کی جگہ گاؤن (جُبّہ یا چُغہ)

پہنا جاتا ہے۔ "جلسۂ تقسیم اسناد" ہی زیادہ موزوں ہے +

122. Substitute

بدل، قائم مقام، مبادل، نائب،

بدل، قائم مقام اور مبادل تو Substitute کا مفہوم کسی حد تک ادا کرتے ہیں۔ لیکن "نائب" تو یہاں بہت غیر موزوں ہے۔ مبادل بھی Alternative کے لئے موزوں ہے۔ Substitute کے لئے "قائم مقام" یا "بدل" بہتر ہے لیکن اس کے مقابلے میں ایک لفظ "عُقبہ" ہے۔ جو "Substitute" کے لئے بہت موزوں ہے۔ یہ اگر رائج ہو سکے۔ تو بہتر ہوگا۔ ورنہ "بدل" ہی اختیار کیا جائے۔ "عُقبہ" پر عربیت کا اعتراض عائد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ "بدل" بھی تو آخر عربی ہے۔ ہاں البتہ رائج نہ ہونے کے باعث "عُقبہ" کا لفظ نا آشنا کانوں پر گراں ہوگا +

123. Initiative.

آغاز۔ ابتدا۔ ابتدائی، پیش قدمی، اختراع، تمہیدی، شہریوں کا حق قانون سازی۔

Initiative بے شک شہریوں کا حقِ قانون سازی کے معنوں میں آتا ہے۔ لیکن عام طور پر جو Initiative سے مفہوم لیا جاتا ہے۔ وہ اس حقِ قانون سازی سے بعید ہے۔ اور اس سے مقصود کوئی جدّت پیدا کرنے یا کسی نئی چیز کے ابتدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ اس کے لئے آغاز، ابتدا، ابتدائی اور تمہیدی بھی غیر موزوں ہیں۔ البتہ "پیش قدمی" اس مفہوم کے قریب ہے۔ لیکن ہر "پیش قدمی" Initiative نہیں کہلا سکتی۔ بعض پیش قدمیاں جدّت و اختراع کی آئینہ دار نہیں ہوتیں۔ Initiative کے لئے ہمارے نزدیک "اختراعی صلاحیت" زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے+

124. Mass-Drill.

عام ریاضت، عوامی ریاضت، اجتماعی ریاضت، اجتماعی ورزش، اجتماعی قواعد۔

عام اور عوامی کے الفاظ غیر موزوں ہیں۔ ان میں سے "اجتماعی قواعد" یا "اجتماعی ورزش" ہمیں زیادہ موزوں نظر آتے ہیں۔ ورزش میں چونکہ تمام قسم کی ورزشیں شامل ہوتی ہیں۔ جو ڈرل کے مفہوم سے بعید ہیں۔ اس لئے اگر Drill کے لئے "قواعد" کا لفظ مقرر کر لیا جائے۔ تو پھر "اجتماعی قواعد" Mass - Drill کے لئے ہر طرح جچتا ہوا نظر آئے گا۔

125. Stamped.

ٹکٹ شدہ، مہر شدہ، ٹکٹ لگایا ہوا ہے، ٹکٹ چسپاں ہے۔

مُہر اور ٹکٹ میں فرق ہے۔ اور جو Stamped کا مفہوم ہے۔ اس میں ٹکٹ ہی مدِ نظر ہے۔ اس لئے مُہر موزوں نہیں۔ اس کے لئے "ٹکٹ چسپاں ہے" موزوں معلوم ہو رہا ہے۔

126. Mandate.

حکم، حکم عدالت، اختیار حکومت، اختیار، حق وکالت، فرمان، فتویٰ، حکم نامہ۔

Mandate دراصل ایسا معاہدہ یا اختیار ہے۔ جس سے کوئی شخص بلا معاوضہ کسی خدمت کے سرانجام دینے کا اقرار کرتا ہے۔ Mandate سیاسی امور کے متعلق ان ہدایات کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ جو انتخاب کرنے والے پارلیمان کے رکن کو دی جاتی ہیں۔ لیکن یہ اکثر پہلے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے فقط حکم کا لفظ موزوں نہیں۔ حکم عدالت، اختیار حکومت، فرمان، فتویٰ سب

غیر موزوں ہیں۔ حکم نامہ بھی فرمان و فتویٰ کی طرح ہے۔ البتہ اختیار اور حق وکالت مفہوم کے قریب ہیں۔ لیکن ان دونوں سے ہمیں " اختیار وکالت " بہتر اور زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے ؛

127. Substantive.

اثباتی، مستقل بالذات، مستقل، باضابطہ، باقاعدہ۔

ان تمام میں سے " مستقل " ہی زیادہ موزوں ہے۔ اور یہ رائج بھی ہے۔

128. Conference.

کانفرنس، اجلاس، جلسہ، اجتماع،

ان تمام الفاظ کے مقابلے میں ہمیں " مؤتمر " زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن اس پر عربیت کی دشوار پسندی کے اعتراض سے بچنے کی خاطر " اجلاس " کو ترجیح دی جائے گی۔ بعض کانفرنس کے لفظ کو رائج رکھنے پر آمادہ ہوں گے۔ اس میں بھی کوئی ہرج نہیں ؛

129. Balance-Sheet.

چٹھا، واصل باقی، روشن باقی۔

ان تمام میں سے " واصل باقی " زیادہ اچھا ہے۔ اور رائج بھی ہے ؛

130. D. O.

اس کے لئے موزوں ترجمہ " نیم سرکاری " ہے۔ نیم سرکاری خط کی جگہ " نیم سرکاری " ہی استعمال کیا جائے ؛

(ب)

اصطلاحات زیر غور

131. Precedence.
132. Prictity.
133. Subvention.
134. Forwarding letter.
135. Communique.
136. Accountant
137 Stenographer.
138. Undersigned.
139 Interview
140. Demonstrator.
141. Athletics.
142. Tournament.
143. Sports.
144. Games.
145. Surplus.
146. Duplicate.
147. Head Clerk.
148. Enquiries.
149. Passport.
150. Ticket.
151. Record.
152. Dealing Clerk.
153. Typist.
154. Accountant.
155. Pending cases.
156. Gown.
157. Initials.
158. Up-to-date
159. Notice—Board.
160. Credit.

سرکاری جریدہ کے اعلانات

صیغہ رجال ـــــ شعبہ کالج

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	درجہ مشاہرہ	کب سے مستقل
۶ مئی ۱۹۴۷ء E-۲-۹۹	م۔ عاشق محمد کھیتی ایم۔ اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج منٹگمری	۳۵۰-۱۰-۱۵۰	۲۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء
۱۴ مئی ۱۹۴۹ء E-۱۲۶۵۹۰	مس۔ م۔ انور ایم۔ اے	لیکچرار گورنمنٹ کالج راولپنڈی	۳۵۰-۱۰-۱۵۰	//
//	رفیق احمد ایم اے	//	//	۸ مارچ ۱۹۴۹ء

صیغہ رجال ـــــ شعبہ سکول

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	کس درجہ سے ترقی ہوئی	کس درجہ پر تعین ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۳ مئی ۱۹۴۹ء E-۱۳۲۴۷	حافظ احمد شفیع ایم اے بی ٹی (۹۰-۱۵۰)	معلم انگریزی گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب	درجہ سوم (۹۰-۱۵۰)	درجہ دوم (۱۵۰-۱۰-۲۲۰) مستقل	۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے	ایک خالی اسامی کی
//	چودھری سلطان احمد ایم اے بی ٹی (۹۰-۱۵۰)	نائب ناظر مدارس ضلع میانوالی	//	درجہ دوم (۱۵۰-۲۲۰) عارضی	۱۳ نومبر ۱۹۴۸ء سے	//

تاریخ و شمارہ احکام	نام	منصب	تبادلہ یا تقرر کہاں ہوا	کس تاریخ سے	کیفیت
۲۳ مئی ۱۹۴۹ء E-۱۳۲۴۹	م۔ مستفیض اللہ ایم اے بی ٹی نمبر ۱۸: ۲۳۰-۳۰۰	ہیڈماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازیخان جن کے منٹگمری کی طرف تبادلے کے احکام جاری ہو چکے ہیں	ہیڈماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول ملتان۔ بمشاہرہ سابقہ	۵ مئی ۱۹۴۹ء سے	میاں سول بخش بی اے بی ٹی ایس کی جگہ بمقام ملتان ڈویژن کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر
//	چودھری حاکم علی بی اے بی ٹی نمبر ۲: ۲۳۰-۳۰۰	ہیڈماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول کمالیہ۔	ہیڈماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول منٹگمری بمشاہرہ سابقہ	۱۰ مئی ۱۹۴۹ء سے	مفتی عبدالحمید بی اے [illegible] ایس کی جگہ جو ملتان کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر
۲۵ مئی ۱۹۴۹ء E-۱۳۳۹۴	م۔ نذیر احمد قریشی بی اے بی ٹی نمبر ۵: ۲۳۰-۳۰۰	ہیڈماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول سانگلہ	ہیڈماسٹر جدید گورنمنٹ نارمل اسکول لائلپور بمشاہرہ سابقہ	تاریخ حاضری سے	گورنمنٹ نارمل اسکول لائل پور کی نئی منظور [illegible] اسامی کی جگہ۔
//	مس۔ انور علی بی اے بی ٹی نمبر ۳۲: ۱۵۰-۲۲۰	نائب ناظر مدارس ضلع گوجرانوالہ	ہیڈماسٹر جدید گورنمنٹ نارمل سکول قصور بمشاہرہ سابقہ	//	گورنمنٹ نارمل اسکول [illegible] نئی منظور شدہ اسامی
//	م۔ عبدالخالق بی اے بی ٹی نمبر ۳۴: (۱۵۰-۲۲۰)	نائب ناظر مدارس ضلع ملتان	ہیڈماسٹر جدید گورنمنٹ نارمل اسکول مظفرگڑھ	//	گورنمنٹ نارمل اسکول [illegible] کی نئی منظور شدہ اسامی

کتابیں اور رسالے

تبصرہ

ایجوکیشن آف پاکستان کراچی۔ ایک ماہانہ تعلیمی مجلہ ہے۔ جو اپریل ۱۹۴۹ء سے انگریزی زبان میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس کا مقام اشاعت کراچی ہے اور اس کے چیف ایڈیٹر (مدیر اعلےٰ) پروفیسر بی۔ جے۔ وسوانی ایم اے ہیں اس رسالے کا مقصد یہ ہے۔ کہ اسلامی اصولوں پر مبنی فلسفۂ تعلیم کی اشاعت کی جائے! ور پاکستانی جوانوں کو ذہنی' اخلاقی اور روحانی کاملیت پیدا کرنے کی طرف راہنمائی کی جائے تعلیمی دنیا میں اس رسالے کا اجرا مفید ثابت ہوگا! ہم بخوشی اس رسالے کا استقبال کرتے ہیں۔ اور امید رکھتے ہیں۔ کہ وقت کی تعلیمی ضرورتوں کے پورا کرنے میں یہ رسالہ بھی اپنے فرائض صحیح طور پر سرانجام دیتا رہے گا۔ شیوع زیرِ تبصرہ (اپریل ۱۹۴۹ء) میں مضامین کا معیار اچھا خاصا بلند نظر آتا ہے۔ مضامین بعنوان "نظام مدارس کے جدید طریقے" اور "اقبال اور تعلیم" خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہیں اس رسالے کا کاغذ نہایت عمدہ' طباعت دیدہ زیب اور صورت جاذبِ نظر ہے۔

سدا بہار لاہور کا سالنامہ۔ "سدا بہار" رسالہ بچوں کے لئے مخصوص ہے۔ لاہور سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں بچوں کے لئے دلچسپ اور عمدہ مضامین ہوتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت خاص طور پر اس رسالے کے مدِنظر ہے۔ اس کے سالنامے میں یہ امر قابلِ ستائش ہے۔ کہ بعض مضامین کا پس منظر اسلام اور اسلامی تاریخ ہے۔ امید ہے کہ اس کے اکثر و بیشتر مضامین میں یہ چیز سرایت کرے گی۔ وقت کا اہم تقاضا ہے۔ کہ بچوں میں اسلامی ذوق پیدا کیا جائے۔ اور انہیں اپنی ثقافت سے آگاہ کیا جائے۔ بچوں کی دلچسپی کے لئے تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ اور آخر میں دلچسپ معلومات بھی ہیں۔

- "آموزش" ہر ماہ شائع ہوتا ہے، سالانہ چندہ چھ روپیہ ہے زرِ چندہ مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور کے نام روانہ کریں۔
- مضامین ایڈیٹر "آموزش" سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کو ارسال کئے جائیں۔ اشاعت کے لئے منظور شدہ مضامین کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔
- "آموزش" تمام تعلیمی حلقوں میں مقبول اور جملہ تعلیمی اداروں میں رائج ہے۔
- "آموزش" میں اشتہار دیکر آپ تعلیم یافتہ جماعت میں مشہور و مقبول ہو سکتے ہیں۔
- اشتہارات اور دوسرے کاروباری معاملات کے لئے مینجر "آموزش" کشمیری بازار لاہور سے مراسلت کریں۔